احوالِ غالب

مختار الدین احمد

انجمن ترقی اردو (ہند)
علی گڈھ

۱۹۵۳

احوالِ غالب

ڈاکٹر مختار الدّین احمد
ایم اے، پی ایچ ڈی، (علیگ)

پبلشرز:-
انجمن ترقّی اردو (ہند) علی گڈھ

قیمت نوروپے

طباعت زیر اہتمام
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

تعداد طبع ۱۰۰۰
(دہلی پرنٹنگ ورکس، دہلی)

جون ۱۹۵۳ء

انتساب

ذاکر صاحب!

'احوالِ غالب' میری پہلی کتاب ہے۔ کتنی تمناؤں اور ارمانوں کے بعد اب یہ طباعت کی آخری منزلوں سے گزر رہی ہے۔ سوچتا ہوں کہ اس کا انتساب کس کے نام کروں۔

والدین کے نام۔ کہ جن کے سایۂ عاطفت میں زندگی کے کڑے کوس بھی ہنستے کھیلتے گزر گئے۔

لیکن نہیں ابھی اور کئی چہرے سامنے آتے ہیں۔ ....

ایک شفیق اُستاد کے نام جس نے میرے ناتراشیدہ ذہن کو جِلا دی اور میرے ہاتھ میں قلم دے کر الفاظ وحروف کے پردے پر اپنے علم وتجربات کا سارا سرمایہ منتقل کرنا سکھایا۔

ایک محسن کے نام۔ جس کا ہاتھ اگر میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو سارے سہارے بے معنی تھے، اور میں اس جگہ نہ ہوتا جہاں آج ہوں۔

ایک عزیز دوست کے نام جس کی شخصیت سے متاثر ہو کر مجھ میں زندہ رہنے کا حوصلہ اور دُنیا میں کچھ کر گزرنے کا شوق پیدا ہوا۔

مادرِ درس گاہ کے نام۔ جس کے بغیر میں اپنے آپ کو پہچان نہیں سکتا تھا۔

محبوب کے نام جس نے مصائب ومشکلات پر قابو پانا سکھایا اور زندگی میں اُمنگ اور حوصلہ پیدا کیا۔ اور جس نے مجھے مسرّت وشادمانی کی لازوال دولت سے مالا مال کر دیا۔

کئی دن تک ان پرچھائیوں نے پریشان کیا، عجب کش مکش تھی، کس کو اپناؤں اور کس کو چھوڑوں۔

لیکن نہ جانے دل میں کس نے چُپکے سے یہ بات ڈال دی کہ کیوں نہ ایک ایسا چہرہ تلاش کیا جائے جہاں سارے جلوے سمٹ کر آ جائیں اور دل ہی نے یہ بھی بتایا کہ وہ تنہا شخصیت صرف آپ ہی کی ہے۔

اجازت دیجئے کہ اس کتاب کو آپ ہی کے نام سے معنون کر دوں۔

نیازمند

مختار الدّین احمد

ترتیب

مرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی

۱۲۱۲ھ ـــــ ۱۲۸۵ھ

آزاد کتاب گھر دہلی کے شکریہ کے ساتھ

غالب ہماری زبان کے خوش نصیب شاعروں میں ہیں، اُن کی تصانیفِ نثر ان کی زندگی ہی میں متعدد بار شائع ہوئیں، فارسی اور اردو دواوین کے بھی ان کے سامنے کئی اڈیشن نکلے۔ اس کے بعد آج تک معلوم نہیں کتنے بار ان کی کتابیں چھپیں۔ تصانیف کی اشاعت سے قطع نظر اُن پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئیں کسی اور اردو زبان کے مصنّف یا شاعر پر نہیں لکھی گئیں۔ غالب پر سب سے پہلے ایک مستقل کتاب حالی نے لکھی جو اس منزل کے رہ نوردوں کیلئے نشانِ راہ کا درجہ رکھتی ہے۔ زمانۂ حال میں ان کی زندگی پر سب سے مفصل کتاب غلام رسول مہرؔ صاحب کی ہے، شیخ محمد اکرام کی کتاب غالب نامہ جو اب دو حصّوں میں تقسیم ہو کر "آثارِ غالب" اور "ارمغانِ غالب" کے نام سے شائع ہوئی ہے، بڑی جامع کتاب ہے جس میں تذکرہ بھی ہے اور تبصرہ بھی۔ مالک رام صاحب کی "ذکرِ غالب" جس کا اب نیا ایڈیشن نکل آیا ہے اور جس میں انھوں نے کافی اضافے کئے ہیں اس میں بعض معلومات نئی ملتی ہیں۔ ڈاکٹر عبد اللطیف اور بجنوری مرحوم کی کتابیں بھی قابلِ مطالعہ ہیں لیکن توازن کی کمی دونوں میں نظر آتی ہے، نئی کتابوں میں شوکت سبزواری کی "فلسفۂ کلام غالب"، جعفر علی خاں آثرؔ کی "مطالعۂ غالب" قابلِ ذکر ہے۔

غالب کے سلسلے میں بہت کچھ کام ہوا ہے لیکن ابھی بہت کچھ کام باقی ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی ہی ابھی مکمل طور پر نہیں لکھے گئے، ان کے خاندانی معاملات محتاجِ تحقیق ہیں، وہ اپنا سلسلہ ترسم خاں وغیرہ سے ملاتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ کس حد تک صحیح ہے، انکے عہدِ طفلی اور عنفوانِ شباب کے حالات بہت کم ملتے ہیں، اس زمانہ کے حالات جو کچھ تذکروں میں اور ان کے خطوط میں مل جاتے ہیں وہ بہت تشنہ ہیں، اکبرآباد کے دوران قیام کے حالات کے علاوہ مرزا کی زندگی کے اور بہت سے گوشے ابھی تاریکی میں ہیں، ان پر روشنی ڈالنے کی

ضرورت ہے۔ ان کے حالات لکھنے کے لیے کچھ نئے مواد کی موجودگی ضروری ہے جب تک ان پر دست رس نہ ہو صحیح حالات سے واقفیت مشکل ہے۔

ان کی ساری تصانیف کے تنقیدی ایڈیشن شائع کرنے ہیں، تصانیف کی اوّلین اشاعتوں کا پتہ چلانا ہے، قاطع برہان، درفش کاویانی، ابرگہربار، (طبع اوّل)، سوالات عبدالکریم، تیغ تیز، نکات غالب، لطائف غیبی، کے مطبوعہ نسخے بہت کم یاب ہیں، ان ساری کتابوں کے مطبوعہ ایڈیشن اور ان کے قلمی نسخے تلاش کرنے ہیں اور انھیں صحیح متن، تفصیلی مقدمے اور کارآمد حواشی کے ساتھ شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

غالب کے نئے خطوط تلاش کرنے کا کام بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے خطوط کی تعداد کا اندازہ آسان نہیں، تقریباً پینتالیس سال کی عمر تک جتنے خطوط انھوں نے اردو یا فارسی میں لکھے ان کا بیشتر حصہ یا تو ضائع ہو گیا ہے یا ہمارے سامنے اب تک آ نہیں سکا ہے۔ پنج آہنگ، میں جو خطوط موجود ہیں ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ متفرقاتِ غالب، کی اشاعت سے اس عہد کے کچھ نئے خطوط ہمارے سامنے آئے ہیں، کچھ اسی عہد کے کچھ اس سے پہلے کے خطوط جو آج تک کہیں شائع نہیں ہوئے تھے ہم نے 'مآثر غالب' کے نام سے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں شائع کیے ہیں۔ مرزا غالب کی ادبی زندگی کی ابتدا (تقریباً ۱۸۱۳ء) سے ان کے سفر کلکتہ ۱۸۲۹ء تک یعنی سولہ سال کے عرصے میں مرزا نے جو خطوط لکھے ہیں مفقود ہیں۔ یہ مدت سولہ سال سے بھی زیادہ کی ہو سکتی ہے۔ مرزا نے لکھا ہے کہ ان کے ابتدائی سولہ سال لہو ولعب میں گزرے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں مرزا خطوط تو لکھتے ہی ہوں گے، ادبی نہ سہی کاروباری یا نجی قسم کے سہی، ہمارے لئے تو انکے ایسے خطوط ان کے ادبی خطوط سے اہمیت میں کسی طرح کم نہیں۔ اس پورے عہد ۱۸۲۹ء سے پہلے یعنی ۳۲ سال کی عمر تک کا صرف ایک خط مل سکا ہے جس کا عکس پہلی بار غالب نمبر میں شائع ہوا ہے[۵]۔ اردوئے معلّیٰ اور عود ہندی یہ دونوں مجموعے تو ان کے زمانے میں شائع ہو چکے

---

[۵] اس خط پر راقم کا تفصیلی مضمون ملاحظہ فرمایا جائے "غالب کا قدیم ترین مکتوب" مطبوعہ سالنامہ ہمایوں ۱۹۶۳ء

تھے (عودِ ہندی وفات سے تقریباً چار ماہ پہلے، اور اردوئے معلیٰ وفات کے ۱۹ دن بعد شائع ہوئی) مرزا کے خطوط کے نئے مجموعے خطوطِ غالب اور مکاتیبِ غالب کی اشاعت سے غالبیات میں مفید اضافے ہوئے ہیں، متفرقاتِ غالب، نادراتِ غالب اور مآثرِ غالب بھی اسی فہرست میں داخل ہیں۔

"نوادرِ غالب" کے نام سے ایک ایسا ہی مجموعہ راقم الحروف کے زیرِ ترتیب ہے جس میں مرزا کے وہ سارے رقعات و مکاتیب مفید حواشی کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں جو اب تک ان کے کسی مجموعہ میں شریکِ اشاعت نہیں ہیں لیکن پرانے اخباروں، بیاضوں یا قدیم مجموعوں میں موجود ہیں، اس مجموعے میں خطوط کے علاوہ دوسرے نثری نمونے اور منظومات بھی ہیں۔ منشی حبیب اللہ خاں ذکا کے نام بھی خطوط کا ایک غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، کچھ خطوط پٹودی میں بھی بتائے جاتے ہیں، "ہندوستان" میں تلاش کیا جائے تو ابھی بہت سے خطوط کے برآمد ہونے کی اُمید ہے، یہ سارے خطوط صحیح متن اور مفید حواشی کے ساتھ جلد شائع کر دینے چاہئیں، ساتھ ہی ساتھ نئے خطوط کی تلاش جاری رکھنی چاہیے، قدیم کتابوں، تذکروں، اخباروں، رسالوں اور گلدستوں سے غالب اور ان کے اعزہ و تلامذہ و احباب کے متعلق جو بھی معلومات بہم پہنچ سکیں انھیں جمع کرنا ضروری ہے، جب تک کچھ اور نیا مواد جمع نہیں ہوتا غالب کی شخصیت کے متعلق کوئی ایسی صحیح تصویر جس میں ان کے اصلی خدّوخال نظر آئیں پیش کرنا ممکن نہیں۔

غالب کی تصویروں کے جمع کرنے کا کام بھی اہمیت رکھتا ہے، اس کتاب میں ایک تفصیلی مضمون اس موضوع پر آپ ملاحظہ فرمائیں گے، مضمون نگار نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ ان کی تصویروں کے متعلق کوئی اطلاع بھی لکھنے سے رہ نہ جائے۔ ساتھ ہی سعی بلیغ کے بعد ان کی ساری ممکن الحصول تصویریں جمع کی گئی ہیں اور ان کے عکس شائع کئے جا رہے ہیں۔ غالب کی اور تصویروں کی تلاش جاری رکھنی چاہیے، انکی تصویروں کے ساتھ ساتھ ان کے اعزہ و تلامذہ اور خاص تعلق رکھنے والے اصحاب کی تصویروں کا بھی کھوج لگانا چاہیے، رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۱ء میں خواجہ امان خواجہ قمر الدین راقم کی تصویریں

کے علاوہ ان کے دوسرے اعزّہ کا ایک گروپ فوٹو شائع ہوا تھا، خاندانِ لوہارو کے کچھ افراد کا بھی ایک مرقع عرصہ ہوا نظر سے گزرا تھا، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلے کے دوسرے اصحاب خواجہ حاجی، نصر اللہ بیگ، نواب احمد بخش خاں، الٰہی بخش معروف، نواب شمس الدین احمد خاں، مرزا افضل بیگ وغیرہم کی تصویریں بھی تلاش کر کے محفوظ کر لی جائیں، جناب مالک رام صاحب کی اطلاع کے مطابق نواب احمد بخش خاں اور ان کے چھوٹے بیٹے نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّرِ درخشاں کی تصویریں وکٹوریہ میموریل ہال (کلکتہ) میں موجود ہیں۔ خود ان کے پاس غالب کے بعض اعزّہ کی تصویریں محفوظ ہیں۔

ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب پر ابھی کام کی ابتدا ہوئی ہے اور بہت کچھ کام کرنا باقی ہے۔ اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھنے کے ساتھ ساتھ غالب کی حیات اور ان کی ادبی و علمی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مختلف مضامین کی سخت ضرورت ہے، متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں لیکن اس موضوع پر مختلف مضامین کا مجموعہ پہلی مرتبہ علیگڑھ میگزین کے غالب نمبر میں پیش کیا گیا جس میں اس بات کا التزام کیا گیا تھا کہ ان تمام حضرات سے مضامین لکھوائے جائیں جو اس موضوع پر کام کر چکے ہیں یا دلچسپی رکھتے ہیں، مقامِ مسرت ہے کہ یہ مجموعہ ملک میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھا گیا اور بیحد پسند کیا گیا، ہندوستان کے محققین اور بلند پایہ نقادوں نے بڑے ہمت افزا تبصرے لکھے اور اس موضوع کے ماہرین نے اس مجموعہ کو گراں قدر مجموعہ اور قدرِ اوّل کی چیز کہا۔

اس مجموعہ کی اہمیت کے پیشِ نظر انجمن ترقی اردو ہند نے فیصلہ کیا کہ اسے دوبارہ کتابی شکل میں ترمیم و اضافہ کے بعد شائع کیا جائے چناں چہ انجمن کے فاضل سکریٹری جناب قاضی محمد عبدالغفار صاحب نے مجھے اس بات پر مامور کیا کہ غالب نمبر کے مضامین میں ترمیم و تنسیخ، ردّ و بدل اور اضافے کر دوں۔ میں اگر چاہتا تو بہ آسانی ایک دو ماہ میں یہ کام کر کے مسودہ انجمن کے حوالے کر دیتا، لیکن میں نے اسے ایک ایسا مجموعہ بنانا پسند کیا جو علمی دنیا کے لئے بہت مفید ہو اور جس کی یاد مدتوں باقی رہے۔ میں نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے

کہ یہ مجموعہ ہر لحاظ سے غالب اور انجمن دونوں کے شایانِ شان ہو۔

یہ مجموعہ تین جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ صفحات کی تعداد کا اندازہ ایک ہزار کے قریب ہے، پہلی جلد 'احوالِ غالب' میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ دوسری جلد 'افکارِ غالب' میں تنقیدی مضامین ہوں گے جن میں غالب کی شاعری، نثر نگاری اور اُن کے فن وغیرہ پر بحث ہوگی، آجکل اس کے آخری اجزا کے پروف دیکھے جا رہے ہیں اور امید ہے یہ کتاب دو ماہ میں شائع ہو جائے گی، تیسری جلد 'گنجینۂ غالب' زیرِ ترتیب ہے، اس میں غالب کے غیر مطبوعہ خطوط اور اشعار شائع ہوں گے، تصانیف کے قلمی مطبوعہ نسخوں پر مضامین ہوں گے اور یادگارِ غالب سے ذکرِ غالب تک اب تک جتنی کتابیں غالب پر لکھی گئی ہیں ان سبھوں پر تبصرے لکھے جائیں گے، اس کے علاوہ اس بات کے بھی انتظامات کیے جا رہے ہیں کہ غالب کے چند نایاب رسالے بھی ایڈیٹ کر کے شائع کیے جائیں۔ اس مجموعے میں ہمارے مشاہیر اہلِ قلم نے حصہ لیا ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجموعہ غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بڑا عجیب اور دلچسپ تحفہ ہوگا۔

پیشِ نظر جلد 'احوالِ غالب' میں ۱۴ مضامین شائع کیے جا رہے ہیں، یہ سب کی سب غالب کی زندگی سے متعلق ہیں۔ جناب مالک رام، جناب غلام رسول مہر، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود، پروفیسر حمید احمد خاں نے اپنے مضامین میں بڑے مفید اور جامع اضافے کیے ہیں اس طرح ضخامت کے ساتھ ساتھ افادیت بھی بڑھ گئی ہے۔ مالک رام صاحب کا مضمون ۱۶ صفحوں میں شائع ہوا تھا اب نظرِ ثانی و اضافہ کے بعد یہی مضمون ۳۷ صفحوں میں آیا ہے، اسی طرح ان پانچ مضامین کی مجموعی ضخامت ۶۶ صفحات تھی، اب نظرِ ثانی کے بعد یہ مضامین ۱۱۵ صفحات میں آئے ہیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس محنت اور توجہ سے مضامین پر نظرِ ثانی کی گئی ہے، قاضی عبدالودود صاحب نے تو عبدالصمد پر گویا نئے سرے سے دوسرا مضمون ہی لکھ ڈالا ہے۔ حمیدہ سلطان کا مضمون اور ناظمہ پروین کی تحریر غالب نمبر ہی سے لی گئی ہیں۔

پروفیسر حمید احمد خاں نے غالب کی خانگی زندگی اور خواجہ احمد فاروقی صاحب نے معرکۂ غالب و قتیل پر مضامین لکھے تھے، مرتب کے اصرار پر انھوں نے اپنے مضامین پر نظرِ ثانی اور اضافے بھی کر دیے ہیں۔

چار مضامین اس کتاب میں بالکل نئے ہیں اور خاص طور پر اسی کتاب کے لیے لکھے یا لکھوائے گئے ہیں۔ یہ علی الترتیب پروفیسر مسعود حسن رضوی اور اظہار الحق ملک کے مضامین غالب کے حالات میں پہلا مضمون، اور غالب کے خود نوشت حالات ہیں۔ اس کے علاوہ دو مضامین مرتب کے لکھے ہوئے ہیں، دستورِ غالب در حدیثِ دیگراں، اور غالب کی تصویریں۔

جہاں کچھ نئے مضامین اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں وہاں دو پرانے مفید مضمون بھی شریکِ اشاعت کر لیے گئے ہیں، روئداد مقدمۂ مرزا غالب مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی تمہید کے ساتھ شائع کی تھی۔ غالب کا نسب نامہ خواجہ قمرالدین راقم کا رقم کردہ ہے جو ان کے عزیز ہیں۔ اس مضمون کے آخر میں خواجہ قمرالدین کے خود نوشت حالات اور ان کی زندگی پر مرزا رفیق بیگ کا مضمون بھی تھا۔ مرتب نے اس مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کر کے علیحدہ علیحدہ شائع کر دیا ہے۔

اس مجموعے میں متعدد تصویریں بھی شائع کی جا رہی ہیں، ان میں سے بعض نادر ہیں اور بیشتر لوگوں کی نظر سے نہیں گزری ہوں گی، غالب کی تصویروں پر خاص طور پر توجہ کی گئی ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کی کوئی ممکن الحصول تصویر شائع کیے جانے سے رہ نہ جائے، اور غالباً یہ سعی نا مشکور نہیں رہی، آج تک کسی مشرقی شاعر یا ادیب کی تصاویر کو جمع کرنے اور ان پر مضمون لکھنے کا اس قدر اہتمام نہیں کیا گیا جس قدر اس مجموعہ میں کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے ۱۹۴۹ء میں، میں نے غالب نمبر میں ان کی تصویروں پر ایک نوٹ شائع کیا تھا اور ان کی دو قلمی تصویروں کے عکس پیش کیے تھے، بعد میں تحقیقات جاری رہی اور آجکل کے غالب نمبر ۵۲ء میں ایک مفصل مضمون میں نے لکھا، اب اس مجموعہ میں مکمل ترین اطلاع ان کی تصویروں کے متعلق ناظرین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے، تصویروں کے ساتھ ساتھ ان کے دو ۲ ذاتیوں کی تصویریں بھی شائع کی جا رہی ہیں جن سے ان کے

تعلقات رہے تھے، اس قید خانہ کی تصویر بھی شائع کی جارہی ہے جس میں وہ ۱۸۴۷ء میں تین مہینے قید رہے تھے، اس کے علاوہ غالب کی ایک تحریر جو انھوں نے اپنے قلم سے لکھ کر ایک تذکرہ نگار کو بھیجی تھی اور ایک لفافہ کا عکس جس پر پتہ غالب کے قلم کا لکھا ہوا غالبیات کے سلسلہ میں اضافہ ہیں یہاں ان دونوں کے عکس شائع کئے جارہے ہیں۔

احوالِ غالب کے سلسلے میں مرتب کے کچھ اور منصوبے بھی ہیں اور ان کی تیاریاں بھی شروع ہو گئی ہیں لیکن یہ مواد اب اس کتاب کی اشاعت دوم ہی میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ مجموعہ آپ کے سامنے ہے اسے مفید بنانے میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں، نہ اُن پریشانیوں اور دقتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے جو اس سلسلہ میں پیش آئیں۔ یہ مجموعہ اگر کامیاب ہے تو اس کی کامیابی کا سہرا اُن مضمون نگاروں کے سر ہے جنھوں نے مرتب کی استدعا پر مضامین لکھے۔

مضمون نگاروں کے علاوہ شکریہ کے مستحق جناب قاضی عبدالغفار صاحب معتمد انجمن ترقی اردو (ہند) ہیں، انھوں نے سامانِ طباعت کی اس گرانی اور کمیابی کے زمانہ میں صرف اس مجموعے کے مرتب اور شائع ہونے پر اصرار کیا بلکہ ہمیشہ اپنا قیمتی وقت اور مفید مشورہ دیتے رہے اور ہر مشکل موقع پر مدد کے لئے آمادہ رہے۔ مرتب ان کی عنایتوں کا ممنون ہے۔

۵، حالی روڈ، مسلم یونی ورسٹی
یوم وفات سرسید ۱۹۵۲ء

مختارالدین احمد

غالبؔ اور علی گڑھ

[مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ (نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ ۱۷۹۷ــ۱۸۶۹) ہمارے ملک کے عظیم شاعروں میں ہیں۔ اُن کا کلام اور اُن کی تصانیف نثر ہمارا بہت بڑا ورثہ ہیں۔ ہمارے ادب میں غالبؔ کا شمار اُن شخصیتوں میں ہے، جنھیں ہم ہر اعتبار سے مشترکہ تہذیب و ثقافت کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں۔ اُن کا مسلک رنگ و نسل، مذہب و ملت اور ذات پات کی قید سے علیحدہ اور بلند ہو کر ساری انسانیت کو ایک رشتۂ یگانگت میں لانا تھا۔

غالبؔ کے شاگردوں اور دوستوں کا حلقہ نہایت وسیع اور متنوع تھا۔ جس میں ہر طبقہ اور ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ ان کے دوستوں اور شاگردوں میں ایک طرف ہرگوپال تفتہؔ، بالمکند بے صبرؔ، شیو نارائن آرامؔ، منشی جواہر سنگھ جوہرؔ، لالہ چھجمل رائے، امید سنگھ اور منشی نول کشور تھے تو دوسری طرف ولیم فریزر، ریٹی گن، اسٹرلنگ، اور الکزنڈر ہیڈرے سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے۔

غالبؔ دہلی کے آخری عہد کی علمی فضیلتوں اور تہذیبی خوبیوں کا بڑا دلکش اور بے مثل نمونہ تھے ہندوستان کی رنگارنگ تہذیبی بساط پر جو دیرپا اور قابلِ احترام نقوش ابتدا سے لے کر مغلوں کے عہد تک مرتسم ہوتے رہے ان میں غالبؔ کی شاعری کی عظمت اور اُن کی شخصیت کی دل آویزی نے بہت بڑا اضافہ کیا ہے۔ ہم اُن کو ہندوستان کی قابلِ فخر یادگاروں میں سے ایک یادگار سمجھتے ہیں اور اُن کی یاد کو تازہ رکھنے اور تازہ کار بنانے کے لیے اُن تمام تحریکوں کا خیر مقدم کرتے ہیں جو اس مقصد کے لیے بروئے کار لائی جائیں]

ان الفاظ میں ایک اپیل ارباب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ابھی کچھ روز ہوئے شائع کی تھی۔

انجمن ترقی اردو کی طرف سے غالبؔ کی شاعری اور زندگی سے متعلق مستند اہلِ قلم کے مقالات تین جلدوں میں پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) احوالِ غالبؔ۔ جس میں غالبؔ کی زندگی کے بارے میں بہت سی نئی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ان کی مختلف تصاویر پر ایک فاضلانہ مضمون ہے نیز وہ تمام تصاویر شائع کی گئی ہیں جو اب تک دستیاب ہو سکی ہیں۔

(۲) افکارِ غالب۔ جس میں غالبؔ کے مستند نقادوں کے بلند پایہ مقالے ہیں۔

(۳) گنجینۂ غالب۔ جس میں بہت سے غیر مطبوعہ خطوط اور غیر مطبوعہ اشعار کے علاوہ غالبؔ کی بعض نادر تصانیف شائع ہوں گی۔ غالبؔ کی تصانیف اور اُن کی اوّلین اشاعتوں پر مضامین ہوں گے۔ اور غالب پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن پر تبصرے ہوں گے۔

اس سلسلے کا پہلا قدم ۱۹۴۹ء میں مسلم یونیورسٹی کے بعض طلبہ نے اُٹھایا اور علی گڈھ اردو میگزین کا 'غالب نمبر' شائع کیا[1]۔ یہ نمبر علمی اور ادبی حلقوں میں اس درجہ مقبول ہوا اور اس کی مانگ اتنی بڑھی کہ اُن مقالات کو دوسری بار شائع کرنے کی ضرورت سمجھی گئی۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو نے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی وصدر انجمن ترقی اردو کی اجازت و اعانت سے غالبؔ نمبر کو نئے سرے سے وسیع تر پیمانے پر مرتّب کرکے شائع کرنے کا اہتمام اپنے ذمّے لیا۔

انجمن نے یہ کام غالب نمبر کے مرتب ڈاکٹر مختار الدین آرزوؔ صاحب کے سپرد کیا جنھوں نے حسبِ معمول بڑی محنت و قابلیت سے غالب نمبر میں متعدد قابلِ قدر مقالوں کا اضافہ کیا۔ بعضوں پر مقالہ نگاروں سے نظر ثانی کرائی اور چند کو یکسر حذف کر دیا۔ اس طرح کام بڑھا اور اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔ امید کی جاتی ہے کہ غالبؔ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ مجلّدات مفید اور دلچسپ ثابت ہوں گی۔

ان دنوں دہلی سے غالب میموریل کی ایک تحریک بھی اٹھائی گئی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ غالبؔ کے شایانِ شان دہلی میں ایک غالبؔ ہال تعمیر کیا جائے۔ اس تحریک کے بانیوں

---

[1] یہ نمبر مختار الدین آرزوؔ صاحب کی ادارت میں نکلا جب وہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ عربی میں تحقیقاتِ علمیہ کے صلے میں یونیورسٹی نے حال ہی میں ان کو ڈاکٹریٹ تفویض کی ہے۔

میں ہر طبقہ، خیال و عقیدہ کے لوگ شامل ہیں اور بڑے خلوص اور سرگرمی کے ساتھ ایک لاکھ روپئے کی رقم جمع کرنے اور مجوزہ اسکیم کو بروئے کار لانے میں منہمک ہیں۔

اس زمانے میں اس تحریک کو جس خلوص سے اُٹھایا گیا ہے اور جس فراخ دلی سے دور و نزدیک اُس کا خیر مقدم کیا گیا ہے وہ غالبؔ کی شاعری اور شخصیت سے مُلک کی شیفتگی کا بیّن ثبوت ہے۔ غالبؔ کی تصویر سے مزیّن ڈاک خانہ کے ٹکٹ کا اجرا بھی ہندستان کے اکابر شعراء میں غالبؔ کا درجہ متعیّن کرتا ہے۔

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں اس گہری عقیدت کا بھی تذکرہ کر دیا جائے، جو غالبؔ کے زمانۂ حیات سے آج تک علی گڈھ کو غالبؔ اور اُن کے کلام سے رہی ہے۔ اس سے اُس ذہنی رابطہ کا راز بھی سمجھ میں آجائے گا جو علی گڈھ اور غالبؔ کے درمیان شروع سے چلا آرہا ہے۔ اربابِ علم و فن کو غالبؔ سے بہ حیثیت شاعر، بہ حیثیت شخص، بہ حیثیت علامت اور بہ حیثیت ادارہ متعارف کرنے کا مشکل و محترم کام سب سے پہلے علی گڑھ کے بانی سر سید احمد خاں[۵۱] مرحوم اور ان کے برگزیدہ رفیق کار اور اردو کے سب سے شریف اور دردمند شاعر و نقاد مولانا الطاف[۵۲] حسین حالیؔ نے انجام دیا۔ اُن کے بعد کالج کے دو نامور فرزندوں ڈاکٹر سید محمود[۵۳] (بہار) اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن[۵۴] بجنوری نے غالبؔ کی اہمیت و عظمت کو نقد و نظر کے جدید طریقوں سے اپنی تصانیف اور تحریروں میں جتایا۔ ان مقالہ نگاروں کے بعض نظریوں یا نتائج سے اختلاف کرنے کی گنجائش ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی ان مقالات کے قابلِ قدر ہونے میں کلام نہیں۔

غالبؔ کا اردو دیوان سب سے پہلے سر سید کے بھائی، سید محمد خاں بہادر مالک مطبع سید المطابع و سید الاخبار نے ۱۸۴۱ء میں اپنے مطبع سے شائع کیا۔ سر سید کی کتاب آثار الصنادید (۴۷-۱۸۴۶ء) سب سے پہلی کتاب ہے جس میں غالبؔ کے حالات و کلام

---

۵۱ آثار الصنادید ۵۲ یادگارِ غالبؔ

۵۳ مقدمہ دیوانِ غالب مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۵۴ محاسن کلامِ غالب

پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا باب چہارم جس میں دلی کے ناموَر مشائخ، علما، فقرا، اطبا، اور شعراء وغیرہ کا ذکر ہے، بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ تقریباً یہ سب لوگ ایسے ہیں جن سے سرسید متعارف تھے۔ ان میں مرزا غالب کا تذکرہ شعراء کے ضمن میں سب سے پہلے کیا گیا ہے۔ جو ۱۷ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

اسی آثار الصنادید پر غالب نے تقریظ لکھی اس کی اشاعت میں دلچسپی لی خطوط لکھ کر لوگوں کو اس کی طرف مائل کیا کچھ نسخے خرید کر دوستوں کو بھیجے اور کتاب کی بڑی تعریف کی۔ ملاحظہ ہو غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی خط بہ نام سید رجب علی صاحب ارسطو جاہ جس کا عکس غلام رسول مہر کی کتاب میں موجود ہے۔ لکھتے ہیں :۔

> "دریں زمانہ یکے از دوستاں کتابے مع نقشہ ہائے آثار عمارات دہلی کہنہ و نو نگاشتہ گوئی چمنے آراستہ ست و مع ہذا باب چہارم کہ ختم کتاب بر آن ست رقم ہائے اشعار سخن سنجاں ایں دیار ہم دارد۔ چوں بندہ را ایں نسخہ از روئے جامعیت پسند آمد یک نسخہ از مطبع خریدہ بہ ارمغاں می فرستم و چشم قبول ایں نذر محقر دارم"

انجمن ترقی اردو نے ۱۹۱۶ء میں دیوان غالب کا ایک نہایت صحیح اور خوبصورت اڈیشن نکالنے کا ارادہ کیا تو اس کام کے لئے ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب سکریٹری انجمن کی نظر انتخاب ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری پر پڑی۔ بجنوری مرحوم نے بڑی تن دہی و محنت سے غالب کے مختلف نسخے تلاش کئے، کچھ مطبوعہ اڈیشن سامنے رکھے، اغلاط کی تصیح کی، اور اپنا ایک نسخہ مرتب کیا اور وہ مقدمہ لکھا جو محاسن کلام غالب کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ مقدمہ متداول دیوان پر تھا لیکن ڈاکٹر بجنوری کی حیات ہی میں نسخہ حمیدیہ کا پتہ چل گیا تھا جس کی انھوں نے نقل تیار کرالی تھی اور اس پر باضابطہ کام کرنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ بعد میں نسخہ حمیدیہ مفتی انوار الحق صاحب نے شائع کیا جس کے ساتھ بجنوری مرحوم کا یہ مقدمہ شامل ہے۔

غالب کے مزار کو گمنامی اور شکست ریخت سے بچانے اور اسے غالب کے شایانِ شان

ایک یادگار کی شکل میں منتقل کرنے کی اپیل سب سے پہلے علی گڑھ کے نامور اولڈ بوائے، اور ہندوستان کے مسلمہ لیڈر مولانا محمد علی مرحوم بی۔ اے (آکسن) نے اپنے مشہور اخبارات ہمدرد اور کامریڈ میں بڑے شدّ و مد سے کی تھی۔

غالبؔ کے اردو کلام کا نہایت خوبصورت جیبی اڈیشن نکالنے کا سہرا علی گڑھ کے دوسرے اولڈ بوائے، اور موجودہ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے سر ہے۔ جب وہ ۱۹۲۵ء میں جرمنی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے یہ اڈیشن نہایت حسین جلد و جدول اور نفیس نسخ ٹائپ میں مطبع شرکت کاویانی برلن سے شائع ہو کر بے حد مقبول ہوا۔

جس طرح اردو کے محسن و مستند مصنف ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے (علیگ) سکریٹری انجمن ترقی اردو کی سعی و شوق سے انجمن کے دورِ اوّل میں شائقین اردو کو کلام غالبؔ سے جدید نقطۂ نظر اور اصولِ تنقید سے متعارف ہونے کا موقعہ ملا اور اسی طرح انجمن ترقی اردو کے دور ثانی میں مشہور صاحب طرز و صاحب قلم قاضی عبدالغفار صاحب (علیگ)، کی سعی و شوق سے شائقین اردو کو غالبؔ کی شاعری، شخصیت اور زندگی کے مختلف زاویوں سے روشناس ہونے کا سامان فراہم ہوا۔

شعبۂ اردو کے ایک رکن[۱] نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے غالبؔ پر ایک مقالہ پیش کیا ہے۔ اُمید ہے شائع ہونے پر ارباب علم و فن میں اس کی پذیرائی نہایت اُمید افزا ہوگی اور غالبؔ پر اب تک جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوگا۔

کسی شاعر پر کسی ایک مصنف کی مستقل تصنیف بجائے خود بڑی مفید چیز ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر متعدد اہلِ قلم ایک ہی شاعر کے بارے میں اپنی اپنی تحقیقات و تاثرات کا یکجا اظہار کریں جیسا کہ ان مجلّدات میں ہوا ہے تو اس شاعر کے سمجھنے اور اسکے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے۔

---

[۱] مسٹر خورشید الاسلام

ان مجلدات میں جو مضامین درج ہیں ان کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ غالبؔ سے متعلق جو باتیں جس طرح سے مان لی گئی تھیں ان میں سے اکثر صحیح نہ تھیں۔ یا ان کا مدار واقعیت پر اتنا نہ تھا جتنا عقیدت پر۔ کچھ ایسی باتیں بھی معلوم ہوں گی جن سے غالب کی شخصیت جہاں تہاں سے دھندلی یا داغدار نظر آئے گی۔ لیکن انکے باوجود غالبؔ غالب ہی رہتے ہیں یعنی عہد بھی اور عہد آفریں بھی۔ غالب کی تمام کمزوریاں صحیح مان لی جائیں تب بھی ان کی اہمیت و عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

گزشتہ پچیس تیس سال میں غالبؔ اور اقبالؔ پر جتنی قابلِ قدر تصانیف ہمارے سامنے آئیں اردو کے اور کسی مصنف یا شاعر کے حصے میں نہ آئیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اردو داں طبقہ کے ذہن و دماغ پر ان دونوں کی کیسی گرفت ہے شعر و ادب کے واسطہ سے غالبؔ اور اقبالؔ ہمارے ذہن و فکر کے نشانات منزل ہیں۔ نشانات منزل ہی نہیں بلکہ اس پیچ و خم، نشیب و فراز اور جنّت و جہنّم کی بھی نشان دہی کرتے ہیں جو اس سفر و رہگزر میں پیش آئے ہیں۔

کسی قوم اور ملک کی عظمت و اہمیت کا صحیح اندازہ لگانا مقصود ہو تو اُس قوم اور ملک کی شاعری اور شاعر کا مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہے۔ اس لئے کہ ہر قوم و ملک کی شاعری اور شاعر اس قوم و ملک کی تاریخ بھی ہوتا ہے اور تقدیر بھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح ان مجلدات میں غالبؔ کے بارے میں بہت کچھ بیان کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح اقبالؔ پر بھی مجلدات شائع کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ انجمن ترقی اردو کے کرنے کا کام ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کام کو اربابِ علم کے حلقے میں کافی سراہا جائے گا۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہماری جس ذہنی رجحان و رفعت کی نشان دہی غالبؔ کرتے ہیں اقبالؔ اسکی تعبیر و تکمیل عہد جدید کے مطالبات فن و فکر کی روشنی میں کرتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں جس سے ہمارا ماضی ہمارے حال و مستقبل کے ساتھ پرایا نہیں رہتا بلکہ پیوست ہو جاتا ہے اور پروان چڑھتا ہے۔ حیات قومی کے اس ربط و تسلسل کو قائم رکھنا جتنا مشکل کام ہے اتنا ہی محترم کارنامہ ہے۔ اس اعتبار سے اقبالؔ پر ہم جتنا جلد کام شروع کر دیں مناسب اور مبارک ہوگا۔

علی گڑھ
۱۴ مارچ ۵۳ء

رشید احمد صدیقی

استدراکات وتصحیحات

مرتب ممنون ہوگا اگر قارئین اس کتاب کے مطالعہ کے وقت ذیل کی سطریں پیشِ نظر رکھیں:

"سیرِ غالب در حدیثِ دیگراں" از مختارالدین احمد

ص ۳۷/ ۱۲ - غلام غوث بے خبر کی عبارت کے بعد اس تحریر کا اضافہ کیا جائے:
محمد نثار علی شہرت، غالب کی ایک ملاقات کا حال لکھتے ہیں۔
"ایک روز میں مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ کھانا نوش فرمارہے تھے۔ میں مؤدب ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا، آپ نے ایک رنگترہ میری طرف پھینکا کہ اس سے شغل کیجیے، چوں کہ رمضان کا مہینہ تھا اور مجھے روزہ تھا، میں نے اس رنگترہ کو ہاتھ نہیں لگایا، آپ تاڑ گئے اور فرماتے کیا ہیں:
"ہاں! آپ مولوی آگئے ہیں"
میں ہنسا تو آپ بھی مسکرانے لگے، جب آپ کھانا نوش فرما چکے تو جو قلمی رسالا آپ کے سامنے رکھا تھا، اس میں کچھ بنانے لگے، غالباً اصلاح دے رہے تھے۔ میں نے گذارش کی۔
"جناب کیا ارقام فرما رہے ہیں"؟ تو فرمانے لگے۔
"اس میں فارسی الفاظ بہت ٹھونس دیئے گئے ہیں اس لئے انھیں نکال رہا ہوں، اور شستہ الفاظ اس میں ڈال رہا ہوں"
میں نے ادب کے ساتھ گذارش کی:
"آپ کا دیوان بھی تو فارسی سے مالا مال ہے" فرمانے لگے:
"وہ جوانی کی نازک خیالیاں ہیں، شہرت بعض شعر تو ایسے ادق میرے قلم سے نکل گئے

ہیں کہ میں اب ان کے معنی خود نہیں بیان کر سکتا" پھر فرمانے لگے: "دہلی والوں کی جو اُردو ہے (جس کو مشک و عنبر کہنا چاہیے) اس کو ہی اشعار میں لکھنا چاہیے، آخر عمر میں ہماری تو یہی رائے قائم ہوئی ہے"

میں نے ادب کے ساتھ گذارش کی: "داغ کی اردو کیسی ہے"؟ فرمانے لگے:
"ایسی عمدہ ہے کہ کسی کی کیا ہوگی، ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا، داغ اس کو نہ فقط پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے"
(کچھ داغ کے متعلق از امتیاز علی عرشی صاحب رسالہ خاور مارچ ۵۳ء، بحوالہ آئینہ داغ ص ۲۴)

۱۸/۵۲ منوّر علی شاہ کے متعلق ان کے خاندان کے ایک فرد معظّم علی شاہ صاحب اُستاد شعبۂ اردو سینٹ جانس کالج آگرہ نے میری استدعا پر ایک تحریر لکھ کر بھیجی ہے اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"حضرت منوّر علی شاہ (سنہ ۱۱۹۰ھ - ۱۲۳۵ھ) آگرہ کے سر برآوردہ رئیس اور صوفی تھے اپنے والد مولوی سیّد امجد علی شاہ صاحب اصغر [گلشن بیخار ص ۲۲] کے سجادہ نشین اور صاحب سلسلہ و صاحب کرامات بزرگ تھے، آگرے کے تمام صوفی حضرات آپ کو اپنا پیشوا اور ہادی گردانتے تھے، طرز معاشرت رئیسانہ تھا، مہاراجا گوالیار آپ کا معتقد تھا اور چار گاؤں جاگیر میں نذر کیے تھے۔ جو ختم زمینداری ۱۹۵۳ء تک آپ کے قبضہ میں تھے، روزانہ شام کو آپ کے یہاں نشست میں شہر کے عمائد اور سر برآوردہ حضرات شریک ہوتے تھے۔ قیاس ہے کہ انھیں محفلوں میں غالب بھی اپنے کسی بزرگ کے ساتھ شریک ہوتے ہوں گے اس لئے کہ غالب عمر میں شاہ صاحب سے چھوٹے تھے اور اس لئے دوستانہ تعلقات مستبعد معلوم ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب علم ظاہر اور علم باطن دونوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ یہ خصوصیت اس خاندان میں اب تک چلی آرہی ہے۔ میکش صاحب اکبرآبادی آپ کے جانشین اور پوتے ہیں"

۶/۵۷ افسوس ہے کہ خواجہ عزیز نے یہ نہیں بتایا کہ خود میرزا نے انھیں کیا سُنایا۔

غذا: مرزا کی غذا کے متعلق ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۳ء ہی سے کم ہو چکی تھی، آگے چل کر تو گویا مفقود ہو گئی تھی، مرزا اکتوبر ۶۶ء میں لکھتے ہیں: "غذا یک قلم مفقود، آٹھ پہر میں ایک بار آبِ گوشت پی لیتا ہوں، نہ روٹی نہ بوٹی، نہ پلاؤ نہ خشکہ" ۴ر دسمبر ۶۶ء کو لکھتے ہیں: "غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا پانی، قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب"۔

خواجہ حالی نے بھی ان کی آخری عمر کی غذا کی جو تفصیل لکھی ہے وہ اسی کے قریب ہے، لکھتے ہیں: "صبح کو شیرۂ بادام، دن کو پاؤ سیر کا گوشت کا قورمہ، ایک پیالی میں پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا، کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی اور دو تین پیسہ بھر دہی"۔ اس کے برخلاف صفیر بلگرامی کا بیان یا تو بر بنائے مبالغہ ہے یا غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔

۳/۶۷ یہ فارسی قطعہ غالب کے ایک خط (عود ہندی: ۲۰۴) میں بھی موجود ہے، یہ قطعہ آذری (وفات ۸۶۶ھ) کا ہے جو ایران کے صوفی شعرا میں ہے، یہ ہندوستان بھی آیا تھا غالب کی تحریروں میں اس کا نام نہیں آیا، قطعہ آذری کی جواہر الاسرار (نسخہ کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور، ورق: ۲۱۴) کے علاوہ بعض تذکروں میں بھی ہے اور قرینہ ہے کہ غالب نے کسی تذکرے ہی میں دیکھا ہوگا۔ جواہر الاسرار اور تذکروں کی روایتوں اور غالب کی روایت میں اختلاف ہے۔ (دیکھیے 'جہانِ غالب' معاصر حصہ ۱)

مہر مرتّبہ عبد الصمد: از قاضی عبد الودود صاحب

۱۵/۲۳۵ 'یقین' کی جگہ 'تعیین' پڑھیے'

۷/۲۴۰ 'پوژ و پژد' کی جگہ 'پوزد و پزد' پڑھیے'۔

۱/۲۴۶ 'چاسہ و چگاسہ' کی جگہ 'چامہ و چگامہ'

۱۲/۲۴۹ 'شعور خوانده' کی جگہ 'شود خوانده و ناخوانده'

۱۰/۲۵۸ استدراک کی جگہ تصحیح و اضافہ پڑھیے'۔

۱۲/۲۵۸ 'نوائے ادب' (بابت جنوری) جنوری میں نہیں بلکہ اسکے کئی ماہ کے بعد شائع ہوا۔

۲۲/۲۶۱ اس فن کی جگہ 'مشاہیر کے حالاتِ زندگی پر'۔

۶/۲۶۴ "تصحیح و اضافہ" یہ الفاظ غیر ضروری ہیں۔

تذکرہ

سیّد مسعود حسن رضوی

غالب کے حالات میں پہلا مضمون؟

منشی بالگوبند ماتھر نے آگرہ سے ایک ماہوار رسالہ "ذخیرۂ بالگوبند" کے نام سے ۱۸۶۸ء کی ابتدا میں جاری کیا۔ منشی صاحب دہلی گزٹ پریس، آگرہ کے دفتر میں کلرک تھے۔ خود اُن کا بھی ایک مطبع تھا "آگرہ اردو اخبار پریس" اور اس کے مہتمم، پرنٹر اور پبلشر وہ خود ہی تھے۔ یہ مطبع آگرہ کے محلے پیپل منڈی میں واقع تھا۔ "ذخیرۂ بالگوبند" اسی مطبع میں بہت بڑی تقطیع کے ۴۰ صفحوں میں چھپتا تھا۔ اس کا چندہ سالانہ چھ روپے اور محصول ڈاک بارہ آنے تھا۔ اس رسالے کے تیئیس ۲۳ پرچے میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان میں سے پہلا پرچہ مارچ ۱۸۶۹ء کا اور آخری دسمبر ۱۸۷۰ء کا ہے۔ رسالے کے مضامین کی نوعیت کا اندازہ سرِورق کی حسب ذیل عبارت سے کیا جا سکتا ہے :۔

"ذخیرۂ بالگوبند مشتمل بر جمیع علوم و فنون و تحقیقات ہر قسم و رائے و تقاریر و معرفت الٰہی و عجائباتِ روزگار و حالاتِ دلچسپ و قصصِ رنگین و لطائف و ظرائف و مراسلات و غزلیات شعرائے حال مع نقشہ جات و تصاویر۔"

اس رسالے کے مارچ ۱۸۶۹ء کے پرچے میں مرزا غالب کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان ہے "مرزا اسد اللہ خاں متوفی المتخلص بہ غالب و نوشہ"۔ غالب کی وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو واقع ہوئی۔ اس سانحے کے صرف چند روز بعد یہ مضمون لکھا گیا اور غالباً مرزا غالب کے حالات میں یہ پہلا مضمون تھا جو کسی رسالے میں شائع ہوا۔ اس مضمون سے غالب کے متعلق ہماری معلومات میں کچھ اضافہ بھی ہوتا ہے۔ اس لئے اب کچھ اوپر بیاسی برس کے بعد یہ پھر شائع کیا جا رہا ہے۔

[۲۵ مئی ۱۹۵۱ء]

مِرزا اسد اللہ خاں متوفی المتخلّص بہ غالبؔ و نوشہ

یہ شخص شہر دہلی میں ایک بڑا نامی گرامی شاعر فارسی کا تھا۔ اگرچہ اشعار اردو بھی اُس کے بہت ہیں مگر زیادہ تر شہرت فارسی میں حاصل تھی۔ ممالک مغربی و شمالی ہند کے پڑھے لکھوں میں کم شخص ہوں گے جنھوں نے اس کے شعر اردو و فارسی پڑھے یا سُنے نہ ہوں گے۔ کلام میں تخلص اپنا اُس نے کہیں غالبؔ اور کہیں نوشہ لکھا ہے۔ اگرچہ نام اسد اللہ خاں تھا مگر دہلی اور دیگر اضلاع میں عموماً لوگ مرزا نوشہ کہا کرتے تھے۔

اُس کی تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ سلسلہ اُس کے خاندان کا افراسیاب بادشاہ ترکستان سے مسلسل تھا۔ ابتدا میں اس نے اور اس کے بزرگوں نے جو دولت، اہلکیت اور اختیارات پائے، بہ فن سپہ گری و جوہرِ شمشیر پائے، علم فارسی اُس نے باُمید روزگار تحصیل نہیں کیا تھا، اپنے دلی ذوق سے سیکھا تھا۔ موزونی طبع کے باعث طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ علاوہ ناظم ہونے کے ناثر بھی تھا۔ نثر میں سات کتابیں اُس کی تصنیف و تالیف کی ہوئیں زیادہ معروف ہیں اور بہت سی چھپ بھی گئی ہیں۔ نام اور مطالب اُن کے یہ ہیں یعنی۔

۱۔ **دیوان فارسی**۔ اس میں تخمیناً دس ہزار شعر ہیں۔

۲۔ **دیوان ریختہ**۔ یہ دیوان اردو نہایت مختصر ہے۔

۳۔ **مہر نیمروز**۔ یہ تاریخ خاندان تیموریہ کی نثر میں ابتدائے زمانہ ہمایوں شاہ سے تا بہ عہد بہادر شاہ خارج شدہ بادشاہ دہلی تخلص ظفرؔ ہے۔

۴۔ **دستنبو**۔ اس میں ایامِ غدر ۱۸۵۷ء کی تباہی اور بربادی اپنی کا حال نثر میں قلم بند کیا ہے اور عبارت میں کوئی لفظ عربی کا نہیں لایا ہے۔

۵۔ پنج آہنگ۔ اس کتاب میں اپنے خطوط، دیباچے، خاتمے کتب کے، اصطلاحی محاورے، قواعد فارسی، الفاظ اور مصادر درج کیے ہیں۔

۶۔ اردوئے معلّیٰ۔ اس صحیفے میں اکمل المطابع واقع دہلی کے مہتمم نے اردو زبان کے رقعات اُن کے جمع کر کے یہ نام رکھا ہے اور انھیں کے یہاں شاید چھپ بھی رہے ہیں۔

۷۔ قاطع برہان۔ یہ تبدیلِ نام درفشِ کاویانی۔ اِس میں برہان قاطع مشہور کتاب لغت کے مؤلف کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ لکھا ہے کہ سوائے ان کتابوں کے اور بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور رسالے اُس کے موجود ہیں مگر اس قدر مشہور نہیں ہیں اور نہ ہنوز معرض طبع میں آئے ہیں۔

ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر زیورِ اسلام اُتار کر حلیہ فریمیسن سے آراستہ ہوا تھا۔ ہر چند اُس کے احباب نے حال اِس مذہبِ نَو اختیار کا اور کیفیت فریمیسن ہوس کی دھوکا دے دے کر بھی دریافت کی پر اُس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔ یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پوچھو (یہ کرامت اور وصف اس مذہب کا خاص مشہور ہے) مے پرستی کا ایّامِ شباب سے تا بہ عالمِ پیری شوق تھا۔ جس وقت عالم سرد اور دن ابر کا ہوتا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہوتی، روشِ باغ میں سیر چمن و گلگشت گلشن کرتا ہوتا تھا، اُس وقت طبیعت در خنبائے دلکش و گلہائے رنگیں کو خیابانوں میں تراوت بخش دلہا دیکھکر لہرایا کرتی تھی۔ بعد وفات مرزا ذوقؔ، نامی گرامی شاعر اردو، ملک الشعرا خطاب، اُستاد بہادر شاہ کے یہی مورد عنایاتِ سلطانی رہا کرتا تھا اور غزل بھی اُس کی دیکھا کرتا تھا۔

اخیر میں اِن دنوں کہ زمانے میں طفیل سرکار دولتمدار انگلشیہ کے علم و ہنر کی ترقی اور رواج بہت ہے تو اکثروں نے واقف ہو کر اُن کے نظم و نثر کلاموں پر بہتیرے اعتراض کیے۔ اور وہ اخباروں میں شائع ہوئے تھے۔

جوابات بھی اُن کے اسد اللہ خاں کی طرف سے اکثر درج کیے' جاتے تھے۔ بہت سے قبل وقال ہوتے تھے۔ اُن میں بڑا عذر اس شخص کا یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ میں نہایت ضعیف ہو گیا ہوں، حواس باختہ اور خاطر پریشان رہتی ہے، بدن میں ضعفِ ضعیفی غالب ہے، سماعت سے عاری ہوں' ہاتھ پاؤں کام کم کرتے ہیں، آدمی کی صورت نہیں پہچانتا، آواز کم سُنائی' دیتی ہے' جو کوئی' بروقت ملاقات بات کیا چاہتا ہے لکھکر دیتا ہے اور اس کا جواب تحریری لیتا ہے، کاغذ قلم داوات چاقو قلم دان بستہ ہر وقت پیشِ نظر رہتے ہیں، خورد نوش کے ہضم کی قوت نہیں، زندگی کا لُطف نہ رہا، موت نزدیک معلوم ہوتی ہے، اگرچند روز مرمر کے جیے' تو کیا جیے''، اب قابلِ معافی ہیں۔ اور واقع میں یہ جواب اُس کا معقول تھا۔

کہتے ہیں کہ آدمی اچھا، خوش مزاج، یار باش، خوش وضع، خوش انداز، جلیل القدر، حسب ونسب میں اعلیٰ، ملکوں میں نام ور اور شاعر اور منشی قابل تعریف تھا۔ دم اُس کا بھی غنیمت تھا ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا اور ۱۲۸۵ھ میں ۷۳ برس کی عمر پاکر روضۂ رضواں میں جاگزیں ہوا۔ جس نے سُنا اس کے مرنے کا افسوس کیا۔ لیکن جب تک اُس کا کلام، جو اُس نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے، روئے زمین پر قائم رہے گا، وہ زندہ تصور کیا جائے' گا اور نام اُس کا یادگار رہے گا۔ اب ہماری بھی یہی دُعا ہے کہ غفور الرحیم اُس کی مغفرت کرے۔

شاعروں نے جو تاریخیں اُس کے وفات کی نکالی ہیں اُن میں سے ایک تاریخ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

قطعۂ تاریخ

طبعزاد مولوی محمد حسین صاحب آزاد شاگرد رشید محمد ابراہیم خاں ذوق دہلی

بلبلِ باغِ پہلوی و دری   اسد اللہ غالب و نوشہ

فکرتش جاں نواز و جانش پاک — نفسش روشن و دلش آگہ
سخنش کانِ گوہرِ افکار — نظم و نثرش تمام نقد سرہ
غالبؔ آن شیرِ بیشۂ معنی — صید مضموں شکار او چو برہ
بہ ظہورش خفا ظہوریؔ را — اسدیؔ در مقابلش روبہ
عنصریؔ پیش اوست بے جوہر — عسجدیؔ بردہ بر درش سجدہ
بعروسیٔ بکر ہائے سخن — فی المثل میرزا ہے نوشہ
رخت بربست چوں ز دارِ کہن — نظم مضموں شدست آوارہ
جگرِ بحر آب شد بہ غمش — دل تقطیع گشت صد پارہ
از پئے سال رحلتش آزاد — ہاتفِ غیب گفت و زد نعرہ
شدہ مغفور از خدائے غفور — کہ بود سالِ فوتِ او "غفرہ"

اظہار الحق ملک

غالب کے خود نوشت حالات

رینگین صاحب، جج عدالت خفیفہ دہلی، ایک باذوق انگریز تھے جنھیں فارسی ادبیات اور تاریخ سے دل چسپی تھی، قیام ہندستان کے زمانے میں انھیں فارسی شعرا کا ایک ضخیم تذکرہ مرتب کرنے کا شوق پیدا ہوا اور اس کے لئے انھوں نے بڑی سعی و کاوش کی، تذکرے کی ترتیب اور تاریخ و تذکرے کی کتابوں اور جدید شعرا کے تراجم حاصل کرنے میں اور لوگوں کے علاوہ انھیں اپنے منشی مولوی مظہر حق (خلف مظہر علی ظہور) سے بڑی مدد ملی تھی، رینگین، تذکرہ انگریزی زبان میں لکھ رہے تھے اور اس میں انتخاب اشعار متروک تھا انھوں نے کوئی چھ سو شاعروں کا ترجمہ لکھ ڈالا تھا لیکن تذکرہ ناتمام رہا مولوی مظہر حق نے اس میں اضافے کئے، یہ تذکرہ ۱۲۸۱ھ میں ترتیب پا چکا تھا اور لوگوں سے تقریظیں اور قطعات تاریخ بھی لکھوائے گئے تھے، لیکن بعد کو اس میں مزید اضافے ہوئے اور کوئی دو ہزار شعرا، کے حالات لکھے گئے اور نمونہ کلام بھی درج کیا گیا، مولوی انوار الحق میر منشی ایجنٹی مارواڑ کا بھی اس تذکرے کی ترتیب میں ہاتھ رہا ہے اور انھوں نے کوئی چار سو سے زائد شعرا کے ترجموں کا اضافہ کیا، اس پر بھی مرتبین مطمئن نہ ہوئے اور بمبئی، کلکتہ، ممالک وسط ہند کے شاعروں کے حالات اور نمونہ کلام کے لئے انھوں نے اخباروں میں اشتہار دیا۔ رینگین صاحب نے تذکرے کا نام کیا رکھا تھا اور وہ شائع ہوا یا نہیں اس کا پتہ نہیں چل سکا، بہ ظاہر وہ زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا، لیکن بعد میں اضافہ کے بعد اس کا نام بہ قیاس غالب مظہر العجائب رکھا گیا تھا، قیمت تین روپے ہونی قرار پائی تھی اور محلہ بہرام خاں، دہلی ملنے کا

دیتا ہے اور سات پارچے اور جیغہ سرپیچ مروارید کی مالا خلعت پاتا ہے ایک بار جو ۱۸۴۲ء میں لارڈ صاحب کا
دربار ہوا تو موافق سابق کے دربار و خلعت کی فہرست میں صاحب کمشنر بہادر [illegible]
قائم مقام صاحب کمشنر دہلی بھی ہیں مثل اور رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اسکو بھی خلعت دلایا
بیچارہ بسبب تہیدستی اور بعد مسافت کے سلامی کو نہ جا سکا مجھ سے کہتا تھا میں ستر برس کا آدمی
کانوں سے بہرا ہوں اور اکثر بیمار رہتا ہوں لیکن اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں ان عوارض کو
نہ مانتا اور جناب لارڈ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا خیر آخر عمر میں یہ ایک داغ حسرت ہے
حق بات کو نہ ظاہر کرنا خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے اس شخص نے ۱۸۵۵ء
کے آخر میں قصیدہ مدح ملکہ معظمہ ولایت کو بسبیل ڈاک [illegible] لارڈ [illegible] گورنر جنرل
کی معرفت بھیجا ہے اور اوائل ۱۸۵۶ء میں تین خط انگریزی بواسطہ انڈیا گورنمنٹ
ولایت سے اسکو ڈاک میں آئے ہیں اب ہم ان تینوں خطوں کے خلاصے لکھ کر اسکا
ذکر کر کے ختم کرتے ہیں

پتا تھا۔

اس تذکرے کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے کا اب تک پتا نہیں چلا ہے اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ تذکرہ کس قدر تحقیق اور دقت نظر کے ساتھ لکھا گیا تھا اور اس کی نوعیت کیا تھی اور کن کن شعرائے کے ترجمے اس میں درج تھے، لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ اس میں مرزا غالب کے بھی حالات درج کئے گئے تھے، اور سچ یہ ہے کہ اگر اُن کا ترجمہ درج نہ ہوتا تو یہ بات باعث حیرت ہوتی، غالب کے تعلقات، رٹیگن، مظہر حق، ان کے والد مظہر علی ظہور، ان کے بھائی انوارالحق میر منشی سب لوگوں سے تھے، ان کے خطوط میں اِن سب لوگوں کا ذکر ملتا ہے، یہی نہیں اس تذکرے کے لئے مواد اور شعرائے کے ترجموں کی فراہمی میں خود مرزا نے بھی مدد کی تھی اور اس کے لئے انھوں نے کوئی تقریظ یا قطعۂ تاریخ بھی لکھا تھا۔

غالب کے خطوط میں رٹیگن اور اس کے تذکرے کا کئی جگہ ذکر ہے اور تفتہ کے نام کے ایک خط میں تو اس تذکرے کے متعلق اچھی تفصیل ملتی ہے اور اس سلسلے کے مفید معلومات مل جاتے ہیں، مرزا رقم طراز ہیں:

"رٹیگن صاحب تذکرہ شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں، مجھ سے بھی اُنھوں نے مدد چاہی، میں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب سے مستعار لے کر ان کے پاس بھیج دیں، پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعراء کو تو اچھی طرح جانتا ہے اُن کا حال لکھ بھیج میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے بہ قید اس کے کہ اب زندہ موجود ہیں، اور اس کی صورت یہ ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو فارسی و اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں، اسداللہ خاں غالب کے شاگرد۔

نواب مصطفےٰ خاں بہادر علاقہ دار جہانگیر آباد، اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں، اردو میں مومن خان کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔

منشی ہرگوپال عرف قانون گو سکندرآباد کے، فارسی شعر کہتے ہیں تفتہ تخلص

کرتے ہیں، اسداللہ خاں غالب کے شاگرد۔

ظاہرا بعد اس فہرست کے بھیجنے کے اُنھوں نے کچھ اپنے منشی سے تم کو لکھوایا ہوگا، پھر کچھ آپ لکھا ہوگا... اب میں مولوی مظہر الحق ان کے منشی کو بلواؤں گا اور سب حال معلوم کروں گا، اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا، صرف شاعر کا نام اور اس کے اُستاد کا نام اور شاعر کے مسکن و وطن کا نام مع تخلص درج ہوگا......" [۱]

تفتہ ہی کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"یکشنبہ [۱۱، دسمبر ۱۸۶۴ء] کو مولوی مظہر الحق آئے تھے، ان سے سب حال معلوم ہوا، پہلا خط تم کو ان کے بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم رٹیگن صاحب کے لکھا تھا، پھر ایک خط صاحب نے آپ مسودہ کرکے اپنی طرف سے تم کو لکھا، دونوں دیوان تمھارے اور نشتر عشق اور ایک تذکرہ، اور یہ چار کتابیں تمھاری بھیجی ہوئی ان کو پہنچیں، صاحب تم سے بہت خوش اور تمھارے بہت معتقد ہیں... فائدہ اس التفات کا یہ کہ تمھارا ذکر بہت اچھی طرح سے لکھیں گے۔" [۲]

ان خطوں سے کئی باتوں کے علاوہ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ۶۸ شاعروں کا حال خود مرزا نے رٹیگن کو لکھ بھیجا تھا، یہ بات قطعاً قابلِ قبول نہیں کہ خود اپنا حال انھوں نے لکھ کر بھیجا نہ ہو، تذکرہ مظہر العجائب موجود نہ سہی لیکن اس میں مرزا کا ترجمہ جو درج کیا گیا تھا وہ اتفاق سے ہمارے سامنے موجود ہے، اور یقین ہے کہ یہ ترجمہ خود غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے، اس تحریر کی اہمیت یہ ہے کہ حالات خود مرزا کے لکھے ہوئے ہیں، دوسری بات یہ کہ یہ نقل نہیں بلکہ غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اصل تحریر ہے۔ تحریر کا انداز، شانِ خط سب وہی ہے جو مرزا غالب کا ہے، غالب 'لارڈ صاحب' ہمیشہ اس طرح لکھا کرتے ہیں 'لارڈ صاحب'، یہی بات یہاں بھی موجود ہے۔

---

[۱] اردوئے معلّٰی طبع لاہور ۱۹۳۰ء : ۷۳

[۲] اردوئے معلّٰی : ۹۶

اس تحریر میں تقریباً وہی باتیں ہیں جن کا ذکر اکثر و بیشتر ان کی تحریروں میں ملتا ہے، لیکن ان کے دادا کا نام 'قوقان بیگ' صرف یہیں ملتا ہے اب تک کسی ماخذ میں یہ نام نظر سے نہیں گزرا۔ افسوس ہے کہ اس تحریر میں اُن بین خطوں کے خلاصے درج نہیں جو مرزا کے نام انگلستان سے آئے تھے، اس تذکرے کا کسی کو علم ہو تو ان خطوط کا کچھ پتا چلے۔ اس تحریر پر کوئی تاریخ درج نہیں لیکن داخلی شہادت اس بات کی مؤید ہے کہ اس کا زمانہ، تحریر ۱۸۶۲ء کے لگ بھگ ہوگا، یہ تحریر آج سے کوئی پچیس سال پہلے رسالہ، اردو میں شائع ہوئی تھی مرزا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اصل تحریر انجمن ترقی اردو میں موجود ہے، غالب کے قدردانوں کی دل چسپی کے لئے اس کا عکس شائع کیا جاتا ہے۔

اب مرزا غالب کی خود نوشت سوانح حالات ملاحظہ ہوں۔

ترجمۂ مرزا غالب

اسد اللہ خاں، عرف مرزا نوشہ، غالب تخلص، قوم کا ترک سلجوقی سلطان برکیارق سلجوقی کے اولاد میں سے، اس کا دادا قوقان بیگ خاں، شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلّی میں آیا، پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا پہاسو کا پرگنہ جو اب سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا وہ اس کی جاداد میں مقرر تھا، باپ اسد اللہ خاں مذکور کا عبداللہ بیگ خاں دلّی کی ریاست چھوڑ کر اکبرآباد میں جا رہا، اسد اللہ خاں اکبرآباد میں پیدا ہوا۔ عبداللہ بیگ خاں الور میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا، جس حال میں کہ اسد اللہ خاں مذکور پانچ چھ برس کا تھا اس کا حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا، ۱۸۰۳ عیسوی میں جب جرنیل لیک صاحب اکبرآباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی، جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا بریگیڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو کی تنخواہ مقرر کی پھر جب اس نے اپنے زور بازو سے سونک سونسا دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہولکر کے سواروں سے چھین لیے۔

جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بہ طریق استمرار عطا فرمائے مگرخان موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد بہ مرگ ناگاہ ہاتھی پر سے گر کے مرگیا، جاگیر سرکار میں بازیافت ہوئی اور اس کے عوض نقدی مقرر ہوگئی اور شرکا کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپیہ سال اس شخص کی ذات کو اُسی زرِ معافی میں سے ملتے ہیں اس نے شاعری میں بڑا کمال پیدا کیا نہ فقط شعر بلکہ نثر میں بھی دست گاہ رکھتا تھا، نثر کی تین کتابیں ہیں پنج آہنگ، مہر نیم روز، دستنبو، فارسی نظم کا کلیات دس ہزار بیت کا بالفعل اودھ اخبار، لکھنؤ میں چھاپا ہوا ہے، گورمنٹ میں اس کی بڑی عزت ہے، اشرفیوں کے عوض قصیدہ مدح نظر دیتا ہے اور سات پارچے جیغہ سرپیچ موتیوں کی مالا خلعت پاتا ہے، اب کی بار جو لاہور میں لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق سابق کے درباریوں کی فہرست کے صاحب کمشنر بہادر حصار نے کہ دریں ولا قائم مقام صاحب کمشنر دہلی بھی ہیں مثل اور رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا، بے چارہ بہ سبب تہی دستی اور بے مقدوری کے لاہور نہ جا سکا، مجھ سے کہتا تھا کہ ستر برس کا آدمی، کانوں کا بہرا ہوں اور اکثر بیمار رہتا ہوں لیکن اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں ان عوارض کو نہ مانتا اور بے تنک لارڈ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا، خیر آخر عمر میں یہ ایک داغِ حسرت رہا، حق بات کو ظاہر نہ کرنا خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے، اس شخص نے ۱۸۵۵ء کے آخر میں قصیدہ مدح ملکہ معظمہ ولایت کو بہ سبیل ڈاک لارڈ ڈالہوزی گورنر سابق کی معرفت بھیجا ہے اور اوایل ۱۸۵۶ء میں تین خط انگریزی بے واسطہ انڈیا گورمنٹ ولایت سے اس کو ڈاک میں آئے ہیں اب ہم ان تینوں خطوں کے خلاصے لکھ کر اس کے ذکر کو ختم کرتے ہیں۔"

خواجہ قمرالدین راقم

مرزا غالب کا نسب نامہ

اس بندۂ خاکسار بے بضاعت خواجہ قمرالدین راقم نے جب شرح دیوانِ غالب ختم کرلی اور ہر شعر کے معنی بخوبی و خوش اسلوبی حل کرلیے، اس وقت خیال آیا کہ مرزا غالب کا اور اپنے بزرگوں کا نسب بھی خاندانی ظاہر کرنا ضرور ہے تاکہ خاص و عام پر روشن و مبرہن ہو کہ غالب کون تھے اور کیا تھے اور ان کے خاندانی بزرگ کس مرتبے کے تھے اور راقم سے غالب کا خاندانی سلسلہ کیا ہے؟ اس سبب سے اس فقیر بے مایہ نے بزرگوں کا حق خدمت اپنا فرض منصبی سمجھ کر ادا کیا کہ تا دورِ عالم ان کی یادگار میں قائم رہے۔ اگرچہ مولوی الطاف حسین حالی نے اپنی تصنیف یادگارِ غالب میں استاد کا نسب بہ اختصار لکھا ہے مگر وہ بھی ادھورا، استاد کی زبانی سُنا سُنایا لکھا ہے کس لیے کہ نسب کا پورا حال غالب کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ خود ہندوستان میں پیدا ہوئے اور ان کے اب و عم ان کی طفلی میں مر گئے تھے اور خاندانی شجرہ راقم کے دادا خواجہ مرزا حاجی خاں کے پاس تھا جو رشتہ میں غالب کے بھائی ہوتے تھے۔ اور غالب کی پرورش وہی کرتے رہے۔ غالب نے جس قدر بھائی کی زبانی سُنا تھا جا بجا اپنی تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہے اور اپنی نسل فریدوں کی نسل میں بیان کی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ غالب مغفور اور ہمارے بزرگ سلاطین توران میں تھے۔ غالب کی اور ہماری یک جدی نسل ہونے سے یہ بیان ہرگز غلط نہیں ہے کس لیے کہ وہ شجرہ راقم کی نظر سے عہدِ طفلی میں گزرا ہے اور راقم نے اکثر اپنے عم بزرگوار کی زبان

سے بھی خاندانی نسب کا حال سُننا ہے لہٰذا وہ احوال جس قدر کہ میرے لوحِ سینہ پر نقش ہے نوک ریزِ قلم کیا جاتا ہے:۔

واضح ہو کہ ہماری اور غالب کی اصل نژاد سلاطین توران میں ہے جس زمانہ میں تورانی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا بیخ بُنیاد بھی نہ رہی تو ہمارے خاندان کے لوگ اس لطائف الملوکی میں جا بجا منتشر ہو گئے اور جس نے جہاں امن پائی جا بسا چنانچہ کوئی سو پچاس پشت کے بعد اس خاندان میں دو برادرانِ حقیقی جن کا نام راقم کو یاد نہیں ان کی اولاد میں دو فرزند تولّد ہوئے بڑے بھائی کا بیٹا ترسم خاں اور اور چھوٹے بھائی کا بیٹا رستم خاں تھا۔ ہنوز یہ دونوں بھائی عمر شباب کو نہ پہنچے تھے کہ ان کے والدین فوت ہو گئے۔ یہ دونوں کسی حالت میں اضلاع سمرقند میں آکر آباد ہوئے۔ پھر ایک مدت کے بعد بدخشاں میں آکر رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ سرزمین ترکستان میں نورِ اسلام مثل پرتو خورشید منور ہو رہا ہے۔ یہ دونوں بھائی بھی شرفِ اسلام سے فیضیاب ہوئے اور ترسم خاں نے بدخشاں کے کسی شریف خاندان میں اپنا نکاح بیاہ کر لیا۔ ترسم خاں کی اولاد میں تین دختر اور دو فرزند پیدا ہوئے یعنی ایک فرزند کا نام نصر اللہ بیگ خاں دوسرے کا عبد اللہ بیگ خاں تھا۔ پھر ایک عرصہ کے بعد ترسم خاں نے وفات پائی ان کی اولاد مدت تک بدخشاں میں رہی مگر رستم خاں بھائی کے رنج میں بدخشاں میں نہ رہے بخارا میں آ گئے۔ یہاں آکر تھوڑے عرصہ کے بعد رستم خاں بھی ایک دولت مند گھر خواجگانِ چشت میں جو خواجہ عبید اللہ احراری کے نسل میں تھا بیاہے گئے۔ اُن کے ہاں قطب الدین خاں فرزند پیدا ہوئے۔ ہنوز قطب الدین خاں سن بلوغ کو نہ پہونچے تھے کہ اُن کے والدین گزر گئے۔ اب قطب الدین خاں لفظ خواجگی سے ممتاز ہوئے۔ یہاں سے سلسلۂ ذات ہمارا اور غالب کا جدا ہو گیا رستم خاں کے بعد خواجہ قطب الدین کا اُسی خاندان میں عقد ہوا۔ اُن کے ہاں ایک فرزند خواجہ حاجی خاں تولّد ہوئے اُن کی عمر قریب بلوغ کے پہونچی تھی کہ

والدین کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر سن کر نصر اللہ بیگ خاں اور عبد اللہ بیگ خاں مع اپنی
بہنوں کے بھتیجے کے پاس بخارا میں آئے۔ کچھ دن بھتیجے کے شریک حال رہے
پھر بھتیجے سے راز دل بیان کیا اور مشورہ لیا کہ ہمارا قصد ہے کہ ہم ہندوستان
جائیں اور سرکار شاہی میں ملازمت کریں تم کیا صلاح دیتے ہو۔ خواجہ حاجی خاں
جو کہ نوجوان سپاہی پیشہ تھے ہندوستان کے شوق میں چچا کی رائے کے شریک
ہو گئے کہا اچھا میں آپ کے ہمراہ چلوں گا۔ غرض کہ یہ چچا بھتیجے مع متعلقین کسی قدر
جمعیت ذاتی ہمراہ لے کر بخارا سے روانہ ہوئے۔ اوّل سمرقند میں آئے وہاں
ایک امیرزادہ شریف قوم مرزا جیون بیگ خاں چغتا سے ملاقات ہوئی اثنائے
گفتگو میں سفر کا ذکر آگیا۔ مرزا جیون بیگ خاں بھی چلنے کو تیار ہو گئے اور مع
اپنی زوجہ امیر النساء خانم کے ہمراہ ہو لئے۔ غرض یہ ولایتی قافلہ زن و مرد
ہندوستان میں آیا اور شہر شاہجہاں آباد میں مقیم ہوا۔ یہ زمانہ شاہ عالم کی
سلطنت کا تھا اور ملک کی حالت نہایت ابتر تھی۔ بنگالہ کا ملک انگریزوں کے
قبضہ میں تھا اور اودھ کا ملک صوبہ دار اودھ نے دبا لیا تھا ادھر قوم مرہٹہ
ہر طرف ملک کو تاراج کر رہی تھی۔ نواب نجف خاں ذو الفقار الدولہ وزیر سلطنت
تھے مگر بدنظمی رفع نہ ہوتی تھی۔ یہ تازہ وارد ولایتی قافلہ وزیر اعظم سے ملا۔ وزیر
ان سے مل کر بہت خوش ہوا اور ان سب کو نوکر رکھ لیا اور ان کی بسر اوقات
کے لئے ایک پرگنہ پہاسو جو علی گڑھ کے ضلع میں ہے جاگیر میں دیا اور کسی قدر
شاہی فوج بھی مقرر کر دی کہ مرہٹوں کی روک تھام کرتے رہو۔ کئی برس یہ قافلہ
شاہی ملازم رہا ہنوز کوئی کارنمایاں ان سے ظہور میں نہ آیا تھا کہ نواب نجف خاں
وزیر اعظم سے کسی بات پر بگاڑ ہو گیا یہ سب مغل زادے نوکری چھوڑ کر اکبرآباد
چلے آئے وہاں رہنے لگے۔ اتفاق سے بھاؤ اُدے سندھیا نے ان کا حال سن کر
اپنے پاس بلا لیا اور نوکر رکھ لیا۔ نصر اللہ بیگ خاں کو پورے کمپو کا افسر کیا اور
خواجہ حاجی خاں کو ایک رسالہ کا رسالدار کیا اور ایک پوری پلٹن کی کمیدانی میرزا

جیون بیگ خاں کو ملی۔ نصر اللہ بیگ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا عبداللہ بیگ کو گھر پر چھوڑا تھا کہ متعلقوں کی نگرانی کریں۔ دوسرے مرزا عبداللہ بیگ نہایت متقی عبادت گزار تھے۔ خود بھی گھر پر رہ گئے۔ اس اثنا میں مرہٹوں کی شورش زیادہ ہوئی۔ نواب نجف خاں نے انگریزوں سے مدد چاہی کہ مرہٹوں کی سرکوبی کرو۔ انگریز یہ وقت ہی دیکھتے تھے فوراً رضامند ہوگئے، اور فوج لیکر گوالیار پر یورش کردی خوب جنگ ہوئی مگر کچھ کام نہ نکلا آخر انگریز اپنی حکمت عملی کو کام میں لائے، بخشی بھوانی شنکر فوج مرہٹہ کے بخشی کو جو اضلاع دہلی کا رہنے والا تھا لالچ دے کر توڑ لیا۔ فوج کو بیدل کردیا۔ فوج حملے سے باز رہی مگر ان مغلوں کی فوج مقابلہ میں ڈٹی رہی۔ انگریزی فوج کو بڑھنے نہ دیا مجبور ہوکر جنرل مٹکاف لیک کمانڈر انچیف نے مغلوں سے بھی پیام سلام جاری کیے، اُدھر بخشی نے بھی اُن کو روکا۔ جب مغل زادوں نے یہ صورت دیکھی کہ کل فوج بیدل ہوگئی کام نہیں دیتی۔ ہماری قلیل فوج کہاں تک مقابلہ کرے گی۔ ناحق جان دینے سے کیا فائدہ۔ یہ سب بخشی کے پاس گئے، اور گفتگو کی بخشی نے کچھ توجہ نہ کی۔ پھر یہ سب راجہ کے پاس گئے، بمشکل وہاں تک رسائی ہوئی۔ راجہ کو نشیب و فراز سمجھائے، راجہ شراب میں بدمست پڑا تھا۔ جواب دیا کہ جاؤ بخشی سے کہو وہ جو حکم دے اُس کی تعمیل کرو۔ یہ مغل جواب سُن کر ناراض ہوئے اور استعفا دے کر چلے آئے، اور فوج سے علٰحدہ ہو کر اکبرآباد آگئے۔ انگریزی افسر کو اطلاع کردی لو ہم تو جاتے ہیں ملک خالی ہے قبضہ کرلو۔ اب کیا تھا انگریزوں نے ملک پر قبضہ کرلیا راجہ کا نشہ ہرن ہوگیا۔ چار و ناچار اطاعت قبول کرلی۔ کمانڈر انچیف تاج بخشی کرکے چلا آیا۔ ان مغلوں نے اکبرآباد میں سکونت اختیار کی تھی۔ ایک عرصہ کے بعد نصر اللہ بیگ خاں نے دہلی میں آکر اپنا عقد نواب احمد بخش خاں کی بہن سے کیا۔ اور پھر اکبرآباد میں آگئے، مگر اُن کی زوجہ تھوڑی مدت جی کر مر گئیں۔ پھر نصر اللہ بیگ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی کا عقد مرزا

غلام حسین بیگ اکبر آبادی کی بیٹی سے کیا اُس کے شکم سے دو فرزند ایک اسد اللہ خاں دوسرے یوسف بیگ خاں پیدا ہوئے۔ یہ دونوں اُس وقت اپنے نانا کے گھر میں پرورش پاتے تھے اس اثنا میں مرزا عبد اللہ بیگ پر ایک ناگہانی واقعہ گزرا اور وہ فوت ہو گئے، جس کا ذکر باعث طول ہے لہذا قلم انداز کیا۔ اُسی زمانہ میں سرکار انگریزی کو پھر فراہمی فوج کی ضرورت ہوئی کہ جاٹ کی قوم نے بغاوت شروع کر دی تھی۔ کمانڈر انچیف نے مرزا نصر اللہ بیگ خاں کو بلا کر کہا کہ تمہاری شجاعت اور بہادری ہم پر خوب روشن ہے ہم تم کو فوج دیتے ہیں تم ہمارے ساتھ بھرت پور پر یورش کرو اور فیروز پور میوات کی طرف جا کر مورچہ قائم کرو اور رسد کا انتظام کرتے رہو، ہم نے سرکار الور کو بھی اطلاع دی ہے وہاں سے احمد بخش خاں وکیل راج رسد کا بندوبست کریں گے۔ چنانچہ کمانڈر انچیف نے ایک بڑے کمپو کا افسر نصر اللہ بیگ خاں کو کیا اور عہدہ رسالداری خواجہ حاجی کو دیا اور ایک پلٹن کا کمیدان میرزا جیون بیگ خاں کو کیا یہ مغل حسب الحکم فیروز پور میوات پر آئے اور مورچہ قائم کر دیا اُدھر بختاور سنگھ راجہ الور نے معرفت احمد بخش خاں اپنے وکیل کے رسد کا بندوبست کر دیا اور فوج سے بھی مدد دی۔ آخر انگریزی فوج نے اکبر آباد سے بھرت پور پر یورش شروع کی۔ اِدھر نصر اللہ بیگ خاں بھرت پور کے شمالی سمت سے حملہ کرتے تھے اُدھر احمد بخش خاں مغربی علاقہ کو تاراج کر رہے تھے۔ غرض سب سے پہلے شمالی سمت بھرت پور کی نصر اللہ بیگ خاں نے فتح کر لی پھر انگریزی فوج نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ راجہ نے اطاعت قبول کی۔ بعد فتح ہونے بھرت پور کے انگریزی فوج اکبر آباد واپس آگئی اب انگریزوں نے دیکھا کہ راجپوتانہ بالکل فتنہ و فساد سے پاک ہے اُس وقت جدید فوج کو موقوف کر دیا اور نصر اللہ بیگ خاں کو اس فتح کی خیر خواہی کے صلہ میں دو پرگنہ سونک سونسا اور پونہانہ ہوڈل، پلول کے علاقہ میں پانچہزار روپے سالانہ آمدنی کے ۱۸۰۱ء میں نسلاً

بعدنسلِ جاگیریں عطا کیے، اور مرزا جیون بیگ خاں کے سو روپے ماہانہ نقد پنشن مقرر کی اور اسی زمانہ یعنی ۱۸۰۵ء میں احمد بخش خاں کو بصلہ خیر خواہی پانچ لاکھ کا ملک فیروزپور جھرکہ علاقہ میوات دے کر رئیس خود مختار کیا اور الور کی سرکار سے بھی ایک پرگنہ لوہارو ایک لاکھ کی آمدنی کا اسی خیر خواہی میں احمد بخش خاں کو ملا تھا۔ نصر اللہ بیگ خاں چند سال زندہ رہے مگر چھوٹے بھائی کے غم میں تحلیل ہو گئے تھے۔ آخر عمر نے وفا نہ کی انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد خواجہ حاجی خاں اُن کے بھتیجے یعنی راقم کے حقیقی دادا نصر اللہ بیگ خاں اپنے چچا کی اولاد اور متعلقین کی سرپرستی کرتے رہے اُس وقت مرزا اسد اللہ خاں کی عمر نو برس کی تھی اور یوسف بیگ خاں پانچ برس کے تھے ایک ایرانی اہلِ فضل و کمال ان کو تعلیم دیتا تھا۔ بعد وفات نصر اللہ بیگ خاں کے مرزا خواجہ حاجی خاں نے اپنے چچا کی جاگیر کا استغاثہ کیا۔ احمد بخش خاں نے بھی سفارش کی۔ سرکار نے وہ جاگیر بدستور خواجہ حاجی خاں کے نام نسلاً بعد نسلِ مقرر کر دی۔ اور عہد نامہ میں لکھ دیا کہ یہ جاگیر بعد نصر اللہ خاں کے سرکار سے تم کو عطا ہوئی ہے تم متعلقان نصر اللہ بیگ خاں کی بھی پرورش اور دستگیری کرتے رہو چنانچہ خواجہ حاجی خاں بطور اپنے فرزندوں کے ان بچوں کی پرورش کرتے رہے۔ بعد ایک مدّت کے خواجہ حاجی خاں مع متعلقان نصر اللہ بیگ خاں دہلی میں آکر آباد ہوئے۔ اور مرزا جیون بیگ خاں بھی دہلی میں آگئے، اس عرصہ میں مرزا جیون بیگ کے ہاں تین اولاد ہوئی تھیں ایک دختر مہر النساء خانم اور دو فرزند اکبر بیگ و افضل بیگ۔ دختر کی عمر چودہ سال کی تھی اور اکبر بیگ بہن سے چھوٹے تھے اور اُن سے چھوٹے افضل بیگ تھے۔ خواجہ حاجی خاں نے تھوڑے دن ٹھہر کر عقد کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ مرزا جیون بیگ خاں کی دختر سے عقد کر لیا۔ اُن کے شکم سے دو فرزند ایک دختر تولّد ہوئے۔ دختر کا خورد سالی میں انتقال ہو گیا۔ دونوں فرزند یعنی خواجہ شمس الدین خاں و خواجہ بدرالدین خاں باپ کی

یادگار رہیں رہے۔ اس اثنا میں ایک دن نواب احمد بخش خاں دہلی میں آئے ہوئے تھے۔
خواجہ حاجی خاں سے ملنے کو آئے' اور ہنگام گفتگو یہ بیان کیا کہ بھائی' تم اپنی جاگیر کے
انتظام میں تکلیف پاتے ہو گے۔ بہتر اور مناسب یہ ہے کہ اپنی جاگیر میری ریاست
کے شامل کر دو۔ جاگیر کی آمدنی بہ آسائش پہونچا کرے گی۔ خواجہ حاجی خاں رضامند
ہو گئے' اور سرکار انگریزی میں درخواست دیدی نواب احمد بخش خاں نے بھی
سفارش کر دی۔ وہ جاگیر فیروزپور کی ریاست کے شامل ہو گئی' اور نواب احمد بخش
خاں کو سرکار نے خط لکھدیا کہ خواجہ حاجی خاں کی جاگیر تمہاری ریاست کے شامل
کی جاتی ہے کس لئے' کہ تمھاری سرحد سے ملی ہوئی ہے۔ تم کو لازم ہے کہ تم اس
جاگیر کی پوری آمدنی خواجہ حاجی خاں اور متعلقان نصر اللہ بیگ خاں کے لئے دوام
کو جاری رکھو۔ اور دیتے رہو۔ چنانچہ یہ گورنمنٹ انگریزی کا خط عہد ناماجات میں
بنام احمد بخش خاں چھپا ہوا ہے اور یہ معاملہ ۱۸۰۵ء کا ہے۔ اس کارروائی' کے بعد
خواجہ مرزا حاجی خاں نے مرزا اسد اللہ خاں کا عقد الٰہی بخش خاں معروف کی
صاحبزادی اُمراؤ بیگم سے کر دیا۔ کس لئے' کہ دونوں بھائی' جوان ہو گئے تھے اسد اللہ
خاں کے ہاں ایک لڑکا ہوا تھا۔ مگر زندہ نہیں رہا۔ لاولد رہے۔ دوسرے بھائی'
یوسف بیگ خاں کا عقد خواجہ حاجی خاں نے اپنے سیدات کی رشتہ کی بہن سے
کر دیا۔ جن کے بطن سے ایک دختر تولد ہوئی' اور وہ صاحبِ اولاد ہوئی' جس کی
نسل اب تک حیدر آباد میں موجود ہے اور بہ اقبال مندی بسر کرتی ہے۔ اب
زمانہ وہ ہے کہ خواجہ حاجی خاں کا بعارضہ فالج بعمر چونسٹھ برس انتقال ہو گیا۔
اور نواب احمد بخش خاں رئیس فیروزپور بھی راہی ملک بقا ہوئے۔ ان کے بعد
نواب شمس الدین احمد خاں بڑے صاحبزادہ مسند نشین ریاست ہوئے۔ مدت
تک حکمراں رہے۔ اتفاق سے شمس الدین خاں پر ایک مقدمہ قتل رزیڈنٹ دہلی
کا قائم ہوا اور مقدمہ کو بڑا طول کھنچا۔ آخر بعد تحقیقات کامل سرکار انگریزی نے
شمس الدین خاں کو پھانسی دیدی۔ ملک ضبط کر لیا۔ ہماری جاگیر بھی ملک کے

ساتھ ضبطی میں آگئی۔ کیونکہ اسی ریاست کے شامل ہو چکی تھی۔ مرزا اسد اللہ خاں کو اُن کے ہم چشموں اور احباب وغیرہ نے اغوا کرنا شروع کیا کہ یہ وقت اچھا ہے۔ جاگیر تمہارے چچا کی ہے تم وارث ہو۔ دعویٰ کرو اور قابض ہو جاؤ۔ اسد اللہ خاں کے چھوٹے بھائی دیوانگی کی حالت میں کسی قابل نہیں تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں لوگوں کے بہکانے سے برخلاف ہو گئے، اور جاگیر کا استغاثہ کر دیا۔ بھتیجوں نے چچا کو سمجھایا کہ آپ ایسا نہ کریں۔ جاگیر ہاتھ سے جاتی رہے گی پھر کیا ہوگا۔ مگر مرزا اسد اللہ خاں نے نہ مانا اور دعویٰ کر دیا۔ مجبور ہو کر بھتیجوں نے بھی دعویٰ پیش کیا کہ جاگیر ہمارے باپ کو ملی ہے ہم وارث ہیں ہم کو ملنی چاہیے۔ غرض یہ مقدمہ کئی برس دائر رہا۔ جملہ دعویدار معاش سے پریشان رہے۔ انجام کار سرکار کی حکمت عملی کام آگئی۔ عدالت نے یہ تجویز کی کہ آئندہ سے جاگیر کی آمدنی نصف متعلقان نصر اللہ بیگ خاں کو اور نصف متعلقان خواجہ حاجی خاں کو ملتی رہے گی جاگیر نہیں ملے گی فریقین کو حکم سُنا دیا گیا۔ مرزا اسد اللہ خاں نے بہت کوشش کی۔ کلکتہ گئے اور ولایت میں استغاثہ کیا۔ مگر ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ جو سرکار نے تجویز کر دی اُس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ جاگیر کی نقدی حسب الحکم سرکار سے اجرا ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا اسد اللہ خاں کی دونوں پھوپھیاں مر گئیں اُن کا حصّہ ضبط ہو گیا۔ انکے بعد یوسف بیگ خاں مر گئے، اُن کا حصّہ ضبط ہو گیا مگر سرکار نے اُن کی زوجہ کے نام گزارہ کے لئے تیس روپیہ مہینہ مقرر کر دیا اسکے بعد مرزا اسد اللہ خاں بعد ایام مفسدہ ۱۸۵۷ء، ۱۲۸۳ھ میں جان بحق ہوئے، اُن کا حصّہ ضبط ہوا۔ اسد اللہ خاں کے اوصاف و کمالات عالم پر ظاہر ہیں۔

مختار الدین احمد آرزو

سّرِ غالب در حدیثِ دیگراں

"آپ کا خط اخیر اکتوبر میں آیا، اور میں نومبر کے شروع میں دورے کو جانے والا تھا، خیال ہوا کہ دہلی پہنچ لوں، حضرت غالب سے مل لوں تو پھر خط کا جواب، ملاقات کی کیفیت، سب ایک ہی دفعہ لکھوں، اس کی حقیقت یوں ہے کہ چھٹی نومبر کو یہاں سے روانہ ہوا رُڑکی میں لشکر سے جا ملا، جب وہاں سے کوچ ہوا تو حکم ہوا کہ اب دہلی نہ جائیں گے، میرٹھ پہنچ کر موقع ملا، جی نے نہ مانا، دو روز کی رخصت لے کر دہلی گیا، احباب سے ملنا، شہر کا دیکھنا، مزارات کی زیارت کرنی، دو دن میں کیا کرتا، بہر حال اوروں سے ایک بار، حضرت غالب سے دو بار ملا، اور انھیں دیکھ کر بہت رنج ہوا، فی الواقع اب وہ پیر فانی ہو گئے ہیں، اور بڑی بے لطفی یہ ہے کہ سامعہ بالکل باطل ہے، لکھ کر باتیں ہوتی ہیں، عرصۂ دراز کے بعد ملاقات ہوئی، جی چاہے کہ بہت سی باتیں کیجیے، لکھنے میں بھلا کہاں تک لکھیے، مگر ہوش و حواس بہت درست شوخی طبیعت اور ظرافت کا وہی عالم، بہ خلاف مولوی صدر الدین خاں کے کہ ان کے حواس میں بھی فتورِ کلی ہے۔..."

یہ عبارت خواجہ غلام غوث بے خبر کے ایک خط کی ہے جو انھوں نے اپنے دوست اور مرزا غالب کے شاگرد سید عبدالرزاق شاکر کو لکھا تھا۔

کچھ ہی دن پہلے 'صلائے عام' کا ایک پرانا پرچہ دیکھ رہا تھا (جنوری ۱۹۱۱ء) اس میں ایک مضمون "غدر سے پہلے کی دہلی" پر نگاہ پڑی، میر حیدر حسین سہیل کہتے تھے:

'اسد اللہ خاں غالب کو میں نے دیکھا ہے، یہ والد کی ملاقات کو فراش خانہ

آئے تھے، میں بہت کم سن تھا، اتنا یاد ہے کہ رنگ گورا تھا داڑھی کترواں تھی، بال ترشوائے تھے، کشیدہ قامت قوی الجثہ تھے۔

تذکرہ 'آبِ بقا' میں، شاد لکھنوی پیر و میر کے ترجمہ میں درج ہے کہ ان کی مرزا غالب سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی، ہمیں ان کے تاثرات معلوم نہ ہو سکے، دل میں خیال ہوا کہ کاش ان کے معاصرین تذکرہ نویس، جنھیں مرزا سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا ان سے ملاقات کے سلسلے میں کچھ حالات لکھ چھوڑتے، یا مرزا کے وہ تمام تلامذہ اور ملاقاتی جو ان کے یہاں حاضر باش تھے یا کبھی کبھی آیا کرتے تھے مرزا سے ملاقات کا حال لکھ جاتے تو کیسا اچھا ہوتا، اور مرزا کی روز مرہ کی زندگی اور ان کی مجموعی شخصیت کے بارے میں ہمارے پاس کتنا وافر مواد موجود ہوتا۔

اس خیال کے آتے ہی تذکروں، تاریخوں اور ان تمام مصنفین کی طرف نگاہ گئی جو غالب کے معاصرین میں تھے اور جن سے اس بات کی امید تھی کہ انھوں نے غالب کے متعلق کچھ لکھا ہو، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کامیابی کی راہ میں بڑی رکاوٹیں تھیں لیکن یہ کوشش بالکل بنجر بھی ثابت نہیں ہوئی، 'میر صفیر کا بیان' اردو میں دیکھا تھا لیکن تذکرۂ 'جلوۂ خضر' تک مدتوں رسائی نہیں ہوئی، اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے، طباعت کے لئے کتاب کی کاپی راقم کے خیال کے مطابق خود میر صفیر نے لکھی تھی، اور اپنے مطبع اردو میں شائع کی تھی، اس کی صرف ۲۵۰ جلدیں چھپی تھیں اور قیمت کوئی ڈیڑھ دو روپیہ، عام شائقین کے علاوہ خود تلامذۂ صفیر کی تعداد کچھ کم نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب تبرک ہو کر تقسیم ہو گئی، راقم کو یہ کتاب آٹھ نو سال کی تلاش کے بعد دستیاب ہوئی، اگر نہ ملتی تو ان کے بیان پر حواشی لکھنا ممکن نہ ہوتا، حضرت غوث علی شاہ قلندر اور خواجہ عزیز الدین کے بیانات کا علم تو پہلے سے تھا، یہاں مکمل بیانات ایک خاص ترتیب و تہذیب سے آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے ہیں۔

شیخ ریاض الدین کی کتاب کا ذکر غالبیات پر کام کرنے والے بزرگوں اور دوستوں کے لئے، ایک نئی چیز ہے، نہ اس کتاب کا آج تک پتا تھا اور نہ اس

مصنّف کا، اس کا بیان قدیم ہے اور کافی دل چسپ ہے، در اصل ابتدا میں ارادہ صرف اسی بیان کو پیش کرنے کا تھا لیکن یہ داستان کچھ ایسی لذیذ تھی کہ اسے "دراز تر" کرنا پڑا۔

یہاں صرف بیانات پیش کرنے پر قناعت نہیں کی گئی ہے، بلکہ مصنّفین سے متعلق تمام ضروری اطلاعات کے ساتھ ساتھ نقد کی روشنی میں نہایت غیر جانب دارانہ انداز میں ان کے بیانات کو اچھی طرح جانچنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

اب سب سے پہلے آپ حضرت غوث علی قلندر شاہ سے ملیے:

(۱)

حضرت سیّد غوث علی شاہ قلندر (ولادت در قصبۂ استھانواں، بہار ۱۲۱۹ھ وفات در پانی پت ۱۲۹۶ھ) تیرھویں صدی ہجری میں سلسلۂ قادریہ کے بڑے مشہور بزرگ گزرے ہیں، ان کے حالات و ملفوظات ان کے "خادم طریق ودصی بالتحقیق" شاہ گل حسن نے مرتب کر کے شائع کیے، میں اردو اور فارسی میں جس قدر ملفوظات دیکھنے کا اتفاق ہوا بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس قدر دل چسپ اور عام فہم کتاب کوئی اور دیکھنے میں نہیں آئی، یہ بڑے جہانیاں جہاں گشت تھے، ملفوظات میں پچاسوں اُن مقامات کا نام آتا ہے جہاں جہاں کی سیاحت کی تھی، اور بیسوں ان بزرگوں کے اسماء ملتے ہیں، جن سے انھیں ملنے کے مواقع حاصل ہوئے تھے۔ ان لوگوں میں مولانا فضل حق: ۱۲۲، ۲۴۵، مفتی صدر الدین ۱۲۴ اسمٰعیل میرٹھی کے اسما قابلِ ذکر ہیں۔ مرزا غالب سے بھی ملاقاتیں ہوئی تھیں، یہ اس زمانے کی بات ہے جب شاہ صاحب دہلی گئے ہوئے تھے اور "زینت المساجد" میں فروکش تھے، ان کا قیام دہلی میں کب تھا یہ معلوم نہ ہو سکا ورنہ مرزا سے ان کی ملاقات کے زمانہ کی تعیین ہو جاتی، صرف یہ معلوم ہے کہ ان کا قیام چھ ماہ دہلی میں رہا اور مرزا سے ہمیشہ ملاقاتیں رہیں، راقم کا قیاس ہے کہ یہ سن ستاون سے پہلے کی بات ہوگی، اس قیاس کی تائید دو باتوں سے ہوتی ہے، مرزا نے دہلی میں مختلف مکان بدلے، لیکن وہ ہمیشہ 'بَلّی ماران' اور آس پاس کے 'دائرے' ہی میں 'قدم' رکھتے رہے۔ پھر وہ مالی پریشانیوں اور ہجوم افکار کا زمانہ تھا، اس وقت ہر دو دن کے بعد ایک

خوان سجا کر شاہ صاحب کے لیے لے جانا ویسے بھی مستبعد معلوم ہوتا ہے، پھر یہ امر غور طلب ہے کہ اس وقت تک رجب علی بیگ سرور سے نہ ان کے تعلقات تھے نہ ملاقات، اسی زمانے میں مرزا کی ان سے ملاقات ہوئی اور تعلقات قائم ہوئے، مرزا نے ان کی کتاب دگلزارِ سرور، پر ایک تقریظ بھی لکھی ہے جو اس کتاب کے علاوہ عودِ ہندی میں بھی موجود ہے۔

غوث علی شاہ، پہلی مرتبہ خود ہی مرزا سے ملنے گئے، پھر بعد میں چھ ماہ تک مرزا سے ہمیشہ ملاقات رہی اور ان ملاقاتوں کا بڑا اچھا اثر شاہ صاحب پر پڑا ان کے ملفوظات میں دو مقام پر مرزا غالب کا ذکر ہے اور جس انداز میں انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور غالب کے اخلاق و عادات کی تصویر جس طرح کھینچی ہے اس سے غالب ہی نہیں خود شاہ صاحب کے اعلیٰ اخلاق پر روشنی پڑتی ہے، ورنہ ان دونوں کا کیا میل مرزا ایک رند مشرب آدمی اور شاہ صاحب اپنے وقت کے بڑے اہل دل بزرگ۔

ان کے ملفوظات میں مرزا غالب کے اشعار بھی ملتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مرزا سے کتنی محبت تھی۔ کچھ شعر یہ ہیں:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے (ص ۳۲) حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے (ص ۳۶) رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ (ص ۱۳۱) کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا (ص ۱۴۱)

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک (ص ۱۴۱) اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

ع گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل (ص ۲۰۴)

اب ان کی مرزا غالب سے ملاقات کا حال انھیں کی زبانی سنیے:

ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے نہایت حسنِ اخلاق سے ملے، لب فرش تک آن کر لے گئے، تمام حال دریافت کیا، ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی

ایک غزل بہت ہی پسند ہے علی الخصوص یہ شعر:

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو　　تیرے کوچے کی شہادت ہے سہی

کہا صاحب، یہ شعر تو میرا نہیں کسی اُستاد کا ہے فی الحقیقت نہایت اچھا ہے۔

غزل مرزا نوشہ:

عشق مجکو نہیں وحشت ہی سہی　　میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رُسوائی　　اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے　　غیر کو تجھ سے محبّت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو　　آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام　　دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں　　نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف　　آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اُس دن سے مرزا صاحب نے دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد، میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے، ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلف نہ کیجے، مگر وہ کب مانتے تھے ہم نے ساتھ کھانے کے لئے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں، مے خوار روسیاہ گنہ گار مجکو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے البتہ اولش کا مضائقہ نہیں ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ تشتری میں لے کر کھایا اُن کے مزاج میں کمال کی کسر نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی سرور مصنّف فسانہ عجائب لکھنؤ سے آئے، مرزا نوشہ سے ملے اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے

کہا چہار درویش کی، میاں رجب علی بولے اور فسانۂ عجائب، کیسی ہے مرزا بے ساختہ کہہ اُٹھے اجی لاحول ولاقوۃ اس میں لُطف زبان کہاں، ایک تُک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں، جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا، بہت افسوس کیا اور کہا ظالمو پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے یہ قصہ سُنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہوگیا آیئے آج اُن کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں، ہم ان کے ہمراہ ہو لیے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پُرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات میں نے فسانۂ عجائب کو جو بہ غور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہوگی اور کیوں کر ہو، اس کا مصنّف اپنا جواب نہیں رکھتا، غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کرکے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا دوسرے دن ان کی دعوت بھی کی اور ہم کو بُلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی، مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور درحقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ المؤمن مَن سَلِمَ المسلمونَ من یدِہٖ ولسانِہٖ۔

مباش در پئے آزار و ہرچہ خواہی کُن ۔۔۔ کہ در طریقتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ تم کو کسی سے محبت بھی ہے، کہا کہ ہاں حضرت علی مرتضیٰؓ سے۔

پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا واہ صاحب آپ تو مغل بچّہ ہو کر علی مرتضیٰؓ کی محبّت کا دم بھرتے ہیں، ہم ان کی اولاد کہلائیں اور محبّت نہ رکھیں، کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے[1]

---

[1] تذکرۂ غوثیہ: ۹۸ --- ۱۰۰

ایک روز راقم خدمت میں حاضر تھا کہ کسی شخص نے مرزا نوشہ صاحب کے انتقال کی خبر سنائی آپ نے فرمایا انا للہ و انا الیہ راجعون۔

نہایت خوب آدمی تھے، عجز و انکسار بہت تھا فقیر دوست بدرجہ غایت اور خلیق ازحد تھے، ایک روز ہم ان کے پاس گئے، تو انھوں نے اپنے یہ دو قطعے پڑھے تھے:

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار ساقی و مغنی و شرابے و سرورے
زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند حق را بہ سجودے و نبی را بہ درودے

بروزِ حشر الٰہی چو نامۂ عملم کنند باز کہ آں روز باز خواہِ من است
بکن مقابلہ آں راز سرنوشتِ ازل اگر زیادہ و کم باشد آں گناہ من است

رند مشرب، بے شر، رحم دل تھے اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے لیکن افسوس یہ ہمارے محب بھی چل دیے۔"[1]

شاہ صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ 'وحشت ہی سہی' والی غزل غالب نے انھیں سنائی لیکن فحوائے کلام سے یہی مترشح ہوتا ہے۔ مرزا نے کہا ہوگا کہ جو شعر آپ سنا رہے ہیں وہ تو میرا نہیں، لیکن اس زمین میں میں نے غزل لکھی ہے اور وہ یہ ہے۔

زینت المساجد، عالمگیر کی صاحب زادی زینت النسا، بیگم کی یادگار ہے جس کی تعمیر دریا گنج میں ۱۱۱۹ھ میں انھوں نے کرائی تفصیل کے لئے دیکھیے، واقعات دارالحکومت ۲/۱۲۷، آثار الصنادید، مفتاح التواریخ بیل: ۲۹۷

رجب علی بیگ سرور کی انشا پردازی کے متعلق غالب کی رائے اس تقریظ میں ملے گی جو انھوں نے گلزارِ سرور (ترجمہ حدائق العشاق) پر لکھی تھی اور عود ہندی اور اردوئے معلیٰ، دونوں میں موجود ہے۔ ذیل کی سطریں دیکھیے، اس میں فسانۂ عجائب

---

[1] تذکرہ غوثیہ: ۳۵۵ — ۳۵۶

کا بھی ذکر آگیا ہے:

"ہاں اے صاحبانِ فہم و ادراک، سرورِ سحر بیاں کا اردو کی نثر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شاہ معنی کے واسطے کیسا گراں بہا پیرایہ ہے:

رزم کی داستان گر سُنیے ہے زباں ایک تیغ جوہردار
بزم کا التزام گر کیجیے ہے قلم ایک ابرِ گوہربار

مجھ کو دعویٰ تھا کہ اندازِ بیان کی خوبی میں فسانۂ عجائب بے نظیر ہے، جس نے میرے دعویٰ کو اور فسانۂ عجائب کی یکتائی کو مٹا یا وہ یہ تحریر ہے، کیا ہوا کہ ایک طرح اور ایک قماش کی ہیں یہ دونوں دل فریب نقش ایک ہی نقّاش کے ہیں، مانا کہ ایک نقش دوسرے کا ثانی ہے، یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقّاش لاثانی ہے، مانی نقّاش بے معنی صورتیں بنا کر دعویٰ پیمبری کا کرے کیا عقل کی کمی ہے، یہ بندۂ خدا معنی کی تصویر کھینچ کر دعویٰ خدائی نہ کرے کس حوصلہ کا آدمی ہے" (عود ہندی طبع اوّل: ۱۸۱، اردوئے معلیٰ حصّہ دوم طبع لاہور: ۳۵۱)

مرزا غالب نے جو دو فارسی کے قطعے، شاہ صاحب کو سنائے تھے اُن میں پہلا تو بہت مشہور ہے، اور کلیاتِ فارسی میں موجود (طبع ۱۸۶۳ء: ۱۴۲) لیکن دوسرا قطعہ نہ تو ان کے دیوان میں ہے نہ سبد چیں کی اشاعت اوّل میں اور نہ غالب کی کسی اور تحریر میں اس کا ذکر ملتا ہے اس لیے بے حد اہم ہے۔

(۲)

نسیرِ دہلی، شیخ محمد ریاض الدین امجد کا مختصر سا سفر نامہ ہے جس کا دوسرا تاریخی نام 'سرورِ ریاض' ہے جس سے ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) کے اعداد نکلتے ہیں، سرورق پر مصنف کا نام اس طرح لکھا ہے: ناثرِ عدیم المثال، ناظم صاحبِ کمال، گل سرسبد گلستانِ معانی، عندلیب چمنستانِ شیوا بیانی، معاصرین میں سرآمد جناب شیخ محمد ریاض الدین امجد..." یہ ۴۴ صفحات کی مختصر سی کتاب ہے جو مطبع حیدری واقع آگرہ کٹرہ حاجی محمد حسن مرحوم، باہتمام مرزا علی حسین طبع ہوئی، ابتدا میں مصنف کی تمہید ہے آخر میں آغا حسین

کی تقریظ اور میرزا حاتم علی مہر، مرزا عنایت علی ماہ، عزیزالدین اکرم تجلی، کے تاریخی قطعات درج ہیں۔

یہ سفر بہت مختصر مدّت کا تھا خود مصنّف لکھتے ہیں: 'پہلی محرم ۱۲۷۷ھ کی شب سے چوتھی محرّم کی صبح تک اوقات راہ میں کٹے' اور چوتھی کی صبح سے چودھویں محرّم کی شب تک سیر دیکھ کر دہلی میں چھٹا روزمرہ کا لکھا گیا' پھر چودھویں محرّم سے سولھویں تک اور وقت راہ میں منقضی ہوا۔[۵] سفر کی غرض و غایت خود مسافر ہی سے سُنئے:

مدت سے دل میں شوق تھا... کہ دلّی جو متھرا سے قریب ہے کچھ بعید نہیں جایئے اور اس شہر کو آنکھوں سے کہ قابل دید ہے دیکھ آیئے۔ زمانۂ انقلاب سے پہلے ایک میرے چھوٹے بھائی... مولوی نیاز علی سلمہٗ بذریعہ عہدہ سب ڈپٹی انسپکٹری کے سررشتۂ تعلیم میں تھوڑے عرصہ تک بہت لطف کے ساتھ دہلی میں قیام پذیر تھے... لیکن جب موقع ہاتھ نہ لگا بے سروپا بیٹھا رہا، علاوہ اس کے کسی نے یہ خبر سُنائی کہ تبدیلی ان کی ضلع رہتک میں عمل میں آئی بعد اس کے فتنہ و فساد نے سر اُٹھایا مجبور بیٹھا رہا قدم نہ ہلایا... آخر کار جب آتشِ فتنہ و فساد مندفع ہو کر زمانہ اصلی وضع پر آیا، تو دل نے بیٹھے بٹھائے وہی ولولا اُٹھایا اور اسی عرصہ میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے افسر نے ان کو دہلی میں مدرّس مدرسہ تعلیم المسلمین مقرر فرمایا ہے الحاصل یہ ارادہ مصمم ہوا کہ اسی ۱۸۶۰ء کی تعطیل محرّم میں جاؤں اور دلّی دیکھ آؤں، ہرچند یہ بھی خیال آیا کہ اب وہ شہر اُجڑ گیا ہے ویسا نہیں رہا جانا بے کار ہے، پھر سوچا کہ خدا تصور کو سلامت رکھے ویرانہ کو دیکھیں گے آبادی کا تصور کر لیں گے، آدمی کم ہو گئے ہوں گے مکانات تو رہے ہوں گے... الغرض جب یہ قصد مسلّم ہو چکا تو پھر یہ سوجھی کہ دلّی جاؤ گے کیا کیا لاؤ گے کسے دو گے کوئی کہے گا کہ دلّی سے کچھ لائے یا دیسے ہی چلے

---

[۵] سیر دہلی: ۶۰

آئے تو کیا کہو گے... اس لیے یہ تجویز ہوئی کہ دلی میں جو کچھ دیکھوں اور سنوں وہ لکھ کر احباب کی نظر کروں، خصوصاً... مولوی رُوح اللہ، یہ صدر دیوان اضلاع مغربی و مشرقی کے وکیل ہیں ان کو بطریقِ تحفہ اور ہدیہ کے دوں اور کہوں کہ بھئی دلی سے آئے ہیں اور یہ تحفہ لائے ہیں۔[1]

مصنف کے متعلق زیادہ اطلاع نہ مل سکی[2] اس سفرنامے سے جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہ ہے پورا نام ریاض الدین امجد ہے معلوم نہیں امجد تخلص ہے یا کیا، غزلوں میں تو ریاض تخلص ملتا ہے ممکن ہے دونوں تخلص ہوں، اصلی وطن سندیلہ تھا۔ قیام متھرا میں تھا، ان کے چھوٹے بھائی مولوی نیاز علی دہلی کے سررشتہ تعلیم میں سب انسپکٹر تھے، پھر ۱۸۶۰ء میں مدرس مدرسہ تعلیم المعلمین مقرر ہوئے، کتاب کی نثر میں بڑی شوخی اور رنگینی ہے، خوب صورت لڑکیوں، طوائفوں، کسبیوں کا ذکر بڑے خلوص اگہرے ذوق وشوق اور بیحد دلچسپی سے کرتے ہیں، اور صفحے کا صفحہ اس ذکر انور پر خرچ کر دیتے ہیں، اس سفرنامے سے بہت اچھی روشنی اس بات پر پڑتی ہے کہ ۱۸۶۰ء میں دہلی میں مشہور طوائفیں کون سی تھیں اور ان کا رنگ ڈھنگ، طور طریقہ، پوشاک اور وضع قطع کیا تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ سفرنامہ کی ترتیب کے وقت مصنف شباب کی مستیوں سے سرشار تھا اور عبارت کی رنگینی اور شوخی کی اصل وجہ یہی ہے۔ کتاب میں رواجِ زمانہ کے مطابق اشعار بھی کثرت سے نقل کیے ہیں، یہ زیادہ تر خواجہ وزیر کے ہیں اس سے ان کی وزیر سے دلچسپی کا پتا چلتا ہے۔ ان کے علاوہ مرزا اعظم، ناسخ، خواجہ درد، انیس، آتش، نظیر کے اشعار بھی درج ہیں۔ دہلی میں انھوں نے دس دن قیام کیا جن جن لوگوں سے ان کی ملاقات ہوئی ان میں حکیم عبدالرحیم، مولوی قطب الدین خاں، خواجہ علی احمد، میر بادشاہ صاحب منصف سکندر آباد، حافظ عبدالصمد، بدرالدین علی خاں مہرکن نقشی قابلِ ذکر ہیں۔ مفتی صدر الدین آزردہ اور ماسٹر رام چند سے

---

[1] سیر دہلی: ۳-۵ [2] ریاض الدین امجد خلف شیخ غیاث الدین اشرف، باشندہ سندیلہ شاگرد وزیر، گلزار سخن (جگناتھ فیض): ۱۸۲

کوشش کے باوجود ملاقات نہ ہو سکی۔

مذکورہ بالا اصحاب کے سوا، مصنّف نے جس کا ذکر سب سے زیادہ تفصیل سے کیا ہے وہ مرزا غالب ہیں، ان کا ذکر کتاب میں تین مقامات پر آیا ہے، دو جگہ اُن سے اپنی ملاقات کا حال بیان کیا ہے اور ایک جگہ[1] صرف سرسری سا ذکر ملتا ہے۔

مرزا غالب سے، مصنّف کی دو ملاقاتیں انھیں کے گھر پر ہوئی تھیں، شعروسخن کے چرچے رہے تھے، اُنھیں ہنستے بولتے، اُٹھتے بیٹھتے، دیکھا تھا اور جو کچھ محسوس کیا تھا اُسے ضبطِ تحریر میں لے آئے تھے، اب تک جن لوگوں کی مرزا سے ملاقات کا حال معلوم ہوا ہے، جن کے ملاقات کی تاریخیں متعین ہو سکی ہیں اُن میں یہ ملاقات اور غوث علی شاہ کے علاوہ اس کے اندراجات سب سے قدیم ہیں اس لئے بہت اہم ہیں۔

اب اس تمہید کے بعد خود مصنف سے مرزا غالب کی ملاقات کا حال سُنئے:

بیان جناب مستغنی عن الالقاب مرزا اسداللہ خاں غالب دام افضالہم کی ملاقات سے لُطف اٹھانے کا

چھبیسویں جولائی [۱۸۶۰ء مطابق ۶ محرم ۱۲۷۷ھ] کو صبح کو اُٹھا، دہلی کے قلعہ میں اکبرآبادی دروازے سے پہنچا، یہاں پہلے چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکان ہندوستانی

---

[1] مصنّف سمی انقلاب کے چند ہی سال بعد دہلی گئے تھے، اس وقت وہاں عمارتوں اور اشخاص پر تباہی و اضمحلال کے اثرات بہت گہرے تھے، ایک جگہ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'سچ جو پوچھو تو یہاں ہر ماہ محرم ہے، ہر دم تازہ غم و الم ہے، اب بھی قدیم مکانوں میں محفلیں ہوتی ہیں جیسے حامد علی خاں اور عالیہ بیگم کے یہاں، سو وہاں بے سروسامانی ہے، بڑی پریشانی ہے، جہاں بڑی تیاری کے علم تھے، اب ان کا نشان بھی نظر نہیں آتا۔ یوسف مرزا اور حسین مرزا کے یہاں گو افسردگی ہے لیکن دن کو محفل قرینے کی ہوتی ہے یہی بقول جناب فیض مآب اسداللہ خاں کے: اب بھی مرثیہ لکھیں تو ایک کا لکھیں، نوحہ کیجیے، تو دو کا کیجیے، جب تمام شہر برباد ہو کر بگڑ جائے تو کیا خاک بن آئے' ص: ۴۴

ٹور کے غریبوں نے اور بڑے بڑے انگریزی وضع کے بادشاہ زادوں اور امیروں نے بنائے تھے ہر طرح کا تکلف تھا خوب سجا تھا لیکن بہ نظر صفائی ان کو سرکار ابداقتدار نے مسمار کر دیا میدان ہموار کر دیا.... وہاں سے کلکتہ دروازہ سے نکل کر سرن داس کے باغیچہ کے نیچے ہو کر نئے پُل کے اوپر پہنچا.... بعد اس کے ہوا کھاتا ہوا بادل پورہ میں گیا، پھر منصور علی خاں کی حویلی میں کہ اب بھی وہاں عمارات وسیع اور مکانات رفیع، دروازہ عالی شان مکلف مکان صحن کشادہ صاف گلی کوچہ شفاف موجود ہیں لیکن آدمی مفقود ہیں، ہوتا ہوا بیگم کے باغ، میں آیا، یہ باغ بہت آراستہ پیراستہ اب کمپنی باغ، اس کا نام ہے کیف کا مقام ہے... ہر طرف آبشاریں رواں ہیں روشوں کے کناروں پر دوب لگائی ہے اچھی رنگت جمائی ہے غرض کہ آم اور جامن اور مولسری کے پرانے پرانے پیڑ تھے اور نیچے درختوں کے گرے ہوئے پھولوں کے ڈھیر تھے، خدا بخش نے دو چار سو پھول اٹھائے، ایک ہار گوندھا تین گجرے بنائے، اور تھوڑے سے مرزا نوشاہ کے مکان پر جس کا ذکر آئے گا گر پڑے سو ہیں چھوڑ آئے، وہاں سے خواص پورہ میں جہاں عوام لوگوں کی بستی تھی اور علی الخصوص میاں نیاز علی نے پہلے پہل یہاں سکونت کی حویلی لی تھی پہنچا، وہاں سے سرائے، میں آیا یہاں تین دروازے عالی شان ہیں اور ایک دروازہ ہے اس میں خدا بخش خیاط کی دوکان ہے اب بھی پانچ چار وہاں بڑے بڑے مکان ہیں، پھر چاندنی چوک میں ہوتا ہوا بلی ماروں میں ہو کر شیر افگن خاں کی بارہ دری میں جہاں نواب اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشاہ رہتے تھے گیا، مرزا کی ملاقات سے شرف یاب سعادت ہوا، سبحان اللہ ذات جامع الکمالات کے اوصاف خارج از شرح وبیان ہیں، یہ سر آمد زمان، دانان شیراز وصفاہان ہیں مغتنمات روزگار نفیس الطبع، قدیم الوضع، عالی وقار، والا تبار، ناخدائے سفینہ، سخن دری، دریکتائے بحر معنی پروری آسمان زمین ذی کمالی، نردبان بام نازک خیالی مجموعہ اوراق خردمندی، شیرازہ اجزائے جرائد معنی بندی، مہر سپہر بلاغت، اسد بیشہ فصاحت، رشکِ انوری، روشن طالب، حق تو یہ ہے کہ شعرائے ماضی وحال ہر فن شاعری میں غالب،

قد میانہ نہیں بلکہ دراز، اکبر آباد کے سارے انداز، کترے ہوئے سفید کہ سیاہ ڈاڑھی کے بال، گورے چٹے خوب صورت بدرجہ کمال "کان الت شموس بلا۔ تہ الطالعۃ د غمام فصاحتہ متقاطراً" میاں نیاز علی نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ بھی شاعر ہیں اس فن میں کچھ کچھ ماہر ہیں، فرمایا کہ کچھ سنائیے، طبع کے جوہر دکھائیے، غرض کہ ہیچ داں نے دو غزلیں ایک فارسی دوسری اردو کی سنائیں، مرزا نے ستائشیں جس کے سزاوار نہ تھا فرمائیں۔

غزل فارسی

شنیدم از صبا من آید اینک شہسوار من — زباں دادم کہ برخیزد بہ تعظیمش غبار من
نمے آید صبا اکنوں زمدت بر مزار من — غبار خاطر او گشت شائد ایں غبار من
گداز اے باغباں مارا گماں زردی سبز ظالم — کہ گلہا میستند ایں لخت دل اندر کنار من
بدامادی سخن پرداز آں نو کتخدا ہستم — عروس فکر ہر شب مے نشیند در کنار من

ریاض از آرزوے وصل آں گل چاک گردیدم
کہ زیں سودا چو آتش سوخت آخر مشت خار من

غزل اردو

پھر وہ آئے گھر میں مجھ ناکام کے — کٹ گئے دن گردش ایام کے
وہ اُٹھے پہلو سے ہم بیٹھے رہے — دل کو سینہ کو جگر کو تھام کے
لائے ہاتھوں ہاتھ اہل کارواں — ورنہ ہم تھے ایک دو ہی گام کے
ہاتھ اُٹھاؤ ہمرہان قافلہ — اور ہیں ہم ایک دو ہی گام کے
عشق جس کو ہے وہی انسان ہے — ورنہ یہ سب آدمی ہیں نام کے
یہ صدائے قیس تھی او جذبۂ شوق — ناقۂ لیلیٰ کو ٹھہرا تھام کے
تپ سے اک فرحت ہو تپ ہے عشق میں — ولولہ ہیں ابخرے سرسام کے

خوب لکھی ہے غزل تم نے ریاض
کیوں نہ ہو قابل ہو تم انعام کے

اور اسی غزل میں مرزا کے ایک شعر میں دوسرا اپنا شعر ملا کر چار مصرعوں کا قطعہ بنایا تھا خیر وہ بھی سُنایا تھا، قطعہ:

اب نہیں ہیں آپ کے مصرف کے ہم ۔۔۔ رات کے دن کے نہ صبح وشام کے
عشق نے غالب نکما کر دیا ۔۔۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

جب یہ زبان پر لایا تو مرزا نے برجستہ یہ فرمایا کہ اے بھئی چُپ رہو یوں کہو کہ "ضعف نے غالب نکما کر دیا" یا: دہر نے غالب نکما کر دیا۔ عشق کیسا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔ پھر ارشاد کیا کہ ریختی زبان میں اچھے معنی نکالتے ہو خاصے شعر ڈھالتے ہو، الحاصل دلّی کے ثقات لکھنؤ کے حضرات ہندو مسلمان پیر و جوان بلا۔ ایک لڑکا بھی خیر آباد کا رہنے والا آفت کا پر کالا، مولوی فضل حق کا نواسا، سن میں ذرا سا، قطبی میر پڑھتا، بات بات میں لڑتا جھگڑتا، حاشیہ نشینانِ بساطِ ادب تھے، اہلِ کمال سب کے سب تھے، بعدہٗ مرزا نے تین بند مرثیہ کے اپنی تصنیف کے سُنائے، لوگ روئے پیٹے چلّائے، وہ بند میں نے طلب کئے مرزا نے اپنے دستِ خاص سے لکھ دیئے:

مرثیہ

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو ۔۔۔ اے دجلۂ خوں چشمِ ملایک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم لب عیسیٰ پہ فغاں ہو ۔۔۔ اے ماتمیان شہ معصوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تاب سخن وطاقت غوغا نہیں ہم کو ۔۔۔ ماتم میں شہ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو ۔۔۔ گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو

یہ خرگہ نہ پایہ جو مدت سے بچا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رُتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا ۔۔۔ کچھ اور ہی نقشہ ہے دل وچشم وزباں کا
کیسا فلک اور مہر جہاں تاب کہاں کا ۔۔۔ ہوگا دلِ بے تاب کسی سوختہ جاں کا

اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس روسے کہو برق نہیں ہے

مرزا خود فرماتے تھے کہ یہ حصّہ دبیر کا ہے وہ مرثیہ گوئی میں فوق لے گیا ہے، ہم سے آگے نہ چلا ناتمام رہ گیا۔[۵۱]

دوبارہ حاضر ہونا اسد اللہ خاں غالب کی خدمت میں۔

"یکم اگست ۱۸۶۰ء [۱۲ محرم ۱۲۷۷ھ] صبح کو جناب مستغنی عن الالقاب اسد اللہ خاں غالب کے مکان پر آیا، اُنھوں نے اگلے پچھلے آگرے کے باشندوں اور میلوں کا تذکرہ فرمایا، فارسی کا دیوان دکھایا اور میر طالب علی اور میر خیر الدین حسین اور منور علی شاہ اور مرزا تقی بیگ کو توال اور دیگر عمال کے جلسوں کا جو آگرے میں گزرے ہیں، جس عہد میں یہ بھی آگرے میں تھے سنایا دیر تک حاضر رہا اور دل میں یہ کہا کہ کیا خدا کی قدرت ہے زمانہ کہیں جوہر سے خالی نہیں رہتا دو چار اہلِ کمال سب جگہ موجود ہیں زمانِ ماتقدم میں کیسے کیسے فاضل اجل، شاعر بے بدل اس شہر میں ہوتے گئے، اور اس خلوت کدے میں سوتے گئے، اب صرف مرزا کا دم ہے سو خدا قائم رکھے، اس شہر میں دائم رکھے۔"[۵۲]

اب ریاض کے اس بیان کے متعلق بعض باتیں مختصر طور پر عرض کی جاتی ہیں:

"بیگم کا باغ"، اس کا نام "ملکہ کا باغ" بھی ہے، یہ باغ جہاں آرا بیگم نے ۱۰۶۰ھ میں بنوایا تھا جو چاندنی چوک کے بازار میں گھنٹہ گھر کے سامنے ہے، بعد میں میونسپل کمیٹی کے دفاتر یہاں کی عمارتوں میں آگئے تھے اس لیے لوگ اسے "کمپنی باغ" بھی کہتے ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے واقعات دارالحکومت دہلی ۲/ ۲۲۹

"شیر افگن کی بارہ دری"، محلہ بلّی ماران میں متعدد گلیاں اور حویلیاں ہیں داہنی

---

[۵۱] سیر دہلی: ۲۱ــ۲۷

[۵۲] سیر دہلی: ۵۶

طرف گلی سوداگران، حویلی حسام الدین حیدر، یہیں سے قاسم جان کی گلی کو راستہ جاتا ہے بارہ دری شیر افگن بھی یہیں پر ہے، بارہ دری اب نہیں رہی، گلی اسی نام سے مشہور ہے۔ واقعات ۲/ ۲۴۰۔ بلی ماران کے لئے دیکھئے: ۲۳۸

ریاض کی فارسی و اردو کی غزلیں نہایت معمولی ہیں اور اگر واقعی غالب نے ستایش کیا معنی، پوری غزلیں سن بھی لیں تو ان کی مہمان نوازی اور ان کے اعلیٰ اخلاق کی یہ کھلی ہوئی دلیل ہے۔

مرزا، آخر عمر میں اپنے مصرع: عشق نے غالب نکما کر دیا، میں عشق کو 'ضعف' سے بدل دیا کرتے تھے۔ برکات حسن مارہروی کے ساتھ بھی ایسا ہی قصہ ہوا تھا۔ دیکھئے جلوۂ خضر ۲/ ۶۰

مرثیہ کے یہ تین بند صفیر بلگرامی نے بھی درج کئے ہیں لیکن ریاض کو تقدم زمانی حاصل ہے اس سے اس مرثیہ کا زمانۂ تصنیف ۱۸۶۰ء یا اس سے پہلے ہو جاتا ہے، دبیر کی مرثیہ نگاری اور اس کی فوقیت کا اظہار یہاں بھی موجود ہے، حیرت ہے کہ وہ انیس کا نام نہیں لیتے۔ صفیر کے سامنے اگر وہ دبیر کا نام لیتے ہیں تو اس کے تو کچھ وجوہ اور بھی ہو سکتے ہیں، لیکن یہاں تو کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔

۱۸۶۰ء تک مرزا کا دیوان فارسی صرف ایک ہی بار شائع ہوا تھا، اسلئے مرزا نے ریاض امجد کو اپنے دیوان فارسی کی پہلی اشاعت (۱۸۴۵ء) دکھائی ہو گی۔

میر طالب علی، خیر الدین حسین، منور علی شاہ، مرزا تقی بیگ، ان اصحاب کا اس وقت کچھ پتا نہ چل سکا۔

(۳)

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی (ولادت کشمیر ۱۸۲۱ء ۔ وفات لکھنؤ ۱۹۱۵ء) لکھنؤ کے آخر دور کے بڑے باکمال شاعر تھے، بزرگوں کا وطن کشمیر تھا لیکن صغر سن ہی میں لکھنؤ آکر بس گئے تھے، یہیں تحصیل علم کیا، ۱۸۸۴ء میں کیننگ کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے، اور عمر بھر فارسی زبان و ادب سے گہری دلچسپی لیتے رہے،

غالب کے ایک معاصر

خواجہ عزیزالدین عزیز لکھنوی
۱۸۲۱ء — ۱۹۱۵ء

Title

Author

Accession No.

Call No.

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date

کلیات فارسی طبع ہو چکا ہے اور تمام اصنافِ سخن پر حاوی ہے تلامذہ میں عشرت لکھنوی، ریاض، حسن خاں خیال، مرزا ہادی رسوا، قاضی خلیل الرحمٰن خلیل بریلوی، عارف لکھنوی اور مرزا کاظم حسین محشر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

خواجہ نے کشمیر کا سفر متعدد بار کیا تھا، ایک سفر کے دوران میں دہلی میں مرزا غالب سے ملاقات بھی کی تھی، اس سفر کی ٹھیک تاریخ نہیں معلوم، صرف یہ معلوم ہے کہ وہ ۱۲۸۰ھ میں دہلی سے گزرے تھے، اس سفر کی یادگار ایک نہایت خوبصورت فارسی مثنوی "گل گشت کشمیر" کے علاوہ اردو نثر کی ایک عبارت بھی ہے جس میں انہوں نے دہلی ٹھہر کر مرزا غالب سے ملاقات کا حال درج کیا ہے۔

ان کے کلیات مطبوعہ میں فارسی مکاتیب تو ہیں لیکن کوئی اردو تحریر موجود نہیں، ہمیں ان کی کسی ایسی کتاب کا بھی علم نہ ہو سکا جس میں یہ تحریر پائی جاتی ہو، اردوے معلیٰ طبع لاہور ۱۹۲۰ء کی ابتدا میں مرزا غالب پر ایک مضمون رسالہ 'ادیب' سے نقل کیا گیا ہے اس میں یہ تحریر خواجہ عبدالرؤف عشرت کے حوالے سے نقل کی گئی ہے جو تذکرۂ 'آبِ بقا' یا عشرت کی کسی اور کتاب میں ہماری نظر سے نہیں گزری 'ادیب' سے مراد غالباً وہ رسالہ ہے جو نوبت رائے نظر الہ آباد سے شائع کرتے تھے علی گڑھ میں اس رسالے کی تمام جلدیں موجود نہیں، اس لئے اس کے متعلق کچھ کہنے سے قاصر ہوں 'آثارِ غالب' اور 'غالب' میں اس ملاقات کا حال درج ہے لیکن حوالہ درج نہیں، اکرام صاحب کے یہاں مختصر اندراج ہے اور جناب مہر کے یہاں مختصر تر۔ یہاں خواجہ عزیز کا مکمل بیان نقل کیا جا رہا ہے گو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں کچھ اور عبارت بھی تھی جو اردوے معلیٰ طبع لاہور میں حذف کر دی گئی ہے۔

کلیاتِ عزیز کے مقدمے میں نواب صدر یار جنگ نے بھی مرزا سے اس ملاقات کا بہت مختصر طور پر ذکر کیا ہے، وہاں ایک دو سطریں ایسی ہیں جو کہیں درج نہیں، راقم نے یہ سطریں قوسین کے اندر متن میں داخل کر دی ہیں۔

خواجہ عزیز فرماتے ہیں :

"ایک مرتبہ ہم لکھنؤ سے کشمیر جا رہے تھے، اتفاق سے کچھ دیر کے لئے دہلی اُتر پڑے، سرائے میں قیام کیا پھر اسٹیشن پر جانے کے لئے اڈّے سے بگھی منگوائی، ابھی بگھی آئی تھی کہ یکایک ہم کو خیال ہوا کہ حسنِ اتفاق سے دہلی آنا ہوا ہے تو مرزا غالب سے بھی ملاقات کر لینی چاہیے۔ فوراً بلّی ماروں کا محلہ دریافت کر کے جانے کو مستعد ہوئے، کچھ دور چل کر لوگوں سے پتہ دریافت کیا، اتنے میں ایک صاحب ملاقاتی مل گئے، خیریت پوچھنے کے بعد کہنے لگے، چلئے میں مرزا صاحب سے ملاقات کرا دوں۔

مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا، ایک بڑا پھاٹک تھا جس کے بغل میں ایک کمرا اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی، اس پر ایک نحیف الجثہ آدمی، گندمی رنگ، اسّی بیاسی برس کا ضعیف العمر لیٹا ہوا، ایک مجلد کتاب سینے پر رکھے ہوئے، آنکھیں گڑھے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ یہ مرزا غالب دہلوی ہیں جو بگمانِ غالب دیوانِ قاآنی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

ہم نے سلام کیا لیکن بہرے اس قدر تھے کہ اُن کے کان تک آواز نہ گئی، آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا تھا کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے سے کروٹ بدلی اور ہماری طرف دیکھا، ہم نے سلام کیا، بہ مشکل چارپائی سے اُتر کر فرش پر بیٹھے، ہم کو اپنے پاس بٹھایا، قلم دان اور کاغذ سامنے رکھ دیا، اور کہا: آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی ہے لیکن کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا، جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب لکھ کر دو، نام و نشاں پوچھا، ہمارے ساتھ جو صاحب گئے تھے ہر چند انھوں نے تعارف کرانے کی کوشش کی مگر بے سود ہوئی، جب ہم نے نام و پتا لکھا تو کہا: "مجھ سے ملنے آئے ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہو گے، کچھ اپنا کلام بھی سناؤ"، ہم نے کہا ہم تو آپ کا کلام زبانِ مبارک سے سننے کی غرض سے آئے تھے، بہت دیر تک اپنا کلام سنایا کئے، پھر اصرار کیا کہ تم بھی کچھ سناؤ، ہم نے یہ مطلع سنایا:

مہِ مصر است داغ از رشکِ مہتابے کہ من دارم
زلیخا کور شد از حسرتِ خوابے کہ من دارم

[غالب کو 'مہ مصر' کی ترکیب میں تامل ہوا، کہا 'ماہِ کنعاں' سُنا ہے، 'مہ مصر' نئی ترکیب ہے، صائب کا شعر سند میں پیش کیا تو مرزا بہت خوش ہوئے[1]] عجیب لطف اور مزے سے اس مطلع کو دُہرایا اور حد سے زیادہ تعریف کی، پھر آدمی سے کہا: کھانا لاؤ، ہم سمجھے پرخیالِ مہمان نوازی تکلیف کر رہے ہیں، لکھ دیا کہ ہم صرف تھوڑی دیر کے لئے دہلی اُتر پڑے تھے، ریل کا وقت بالکل قریب ہے، اور بگھی سرائے میں کھڑی ہے اسباب بندھا ہوا رکھا ہے، پابہ رکاب آپ سے ملنے آئے تھے، اب اجازت چاہتے ہیں، کہنے لگے: 'آپ کی غایت اس تکلیف فرمائی سے یہ تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں، ضعف کی حالت دیکھی کہ اُٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں، سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھ کو خبر نہیں ہوتی، غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا، کلام سُنا، اب ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے' اتنے میں کھانا آیا، دو پھلکے اور ایک تشتری میں بھنا ہوا گوشت جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا، پھلکے کا باریک پرت لے کر دو چار نوالے بمشکل کھائے اور کھانا بڑھا دیا، تعجب ہوتا ہے کہ اس مقدار خوراک پر کیوں کر بسر کرتے ہیں'

اب اس بیان سے متعلق بعض قابلِ ذکر باتیں پیش کی جاتی ہیں:

مکان: خواجہ عزیزالدین، مرزا سے سنہ ۱۲۸۰ھ میں ملے تھے انھوں نے مرزا کے مکان کے متعلق کچھ ایسی باتیں نہیں لکھیں جن سے یہ یقین ہو سکے کہ وہ اس وقت کس مکان میں تھے اور اس کا کیا حال تھا، یہ معلوم ہے کہ وہ اواخر ۱۸۵۱ء یا اوائل ۱۸۵۲ء میں پٹیالے والے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں چلے آئے تھے، اسکے بعد جولائی ۱۸۶۰ء تک وہ اسی میں رہے، غلام اللہ خاں نے جب یہ حویلی خرید لی

---

[1] توسین کی عبارت مقدمہ کلیاتِ عزیز سے ماخوذ ہے: ۵

تو مرزا کو یہ خالی کرنی پڑی بلی ماران میں کوئی رہنے کے لائق مکان نہ ملا ناچار لوہارو والوں نے کڑوڑا کل والی حویلی رہنے کو دی، مرزا ۹ جولائی ۱۸۶۰ء کی دوپہر کو وہاں منتقل ہو گئے۔ وہ اس مکان میں کب تک رہے اور پھر کب وہ کسی اور مکان میں منتقل ہو گئے یہ معلوم نہیں لیکن معلوم ہے کہ وہ جولائی ۱۸۶۴ء میں کسی دوسرے مکان میں منتقل ہو چکے تھے جس کی چھت برسات میں ایسی چھلنی تھی کہ ابر دو گھنٹے برستی تھی تو چھت چار گھنٹے جس مکان میں مرزا کے آخری دن گزرے ہیں اور جہاں ان کا انتقال ہوا اس میں بالاخانہ کے ایک کمرے میں وہ رہا کرتے تھے۔ خواجہ عزیز بالاخانہ کا ذکر نہیں کرتے بلکہ پھاٹک سے متصل ایک کمرے کو ان کا قیام گاہ بتاتے ہیں۔ یہ اگر درست ہے تو یہ وہی مکان ہونا چاہیے جس میں کڑوڑا کل کی حویلی کے بعد وہ ۱۸۶۰ء کو آئے تھے اور جہاں وہ ۱۸۶۴ء تک رہے، خواجہ عزیز الدین، مرزا غالب سے ۱۸۶۳ء میں ملے تھے۔

عمر: مرزا کی عمر کے متعلق خواجہ کا انداز صحیح نہیں، ممکن ہے ضعف اور امراض کے ہجوم کی وجہ سے وہ اسی بیاسی ہی سال کے معلوم ہوتے ہوں لیکن اس وقت ان کی اصلی عمر ۶۸ سال بحساب سنین قمری اور ۶۶ سال بحساب عیسوی تھی۔

مہ مصر: دیوان کی روایت 'در حسرتِ خوابے' ہے، یہ غزل مرزا کو سنائی گئی تھی اور انھیں پسند بھی آئی تھی اس لیے یہاں پوری غزل درج کی جاتی ہے:

مہ مصر است داغ از رشک مہتابے کہ من دارم
زلیخا کور شد در حسرتِ خوابے کہ من دارم

نہ گلچیں را بہ دامانست و نہ در جام ساقی را
بیادِ دوست در دل آتش و آبے کہ من دارم

دلست ایں کاں حریفِ آتشِ عشقت بود ورنہ
جہنم بر نمے تابد تب و تابے کہ من دارم

بہ تیغ کند عشقم تا قیامت نیم جاں خواہد
دریغا کار با بے درد قصابے کہ من دارم

بود افسانۂ کز خواب باشد راحتِ مردم
بہ تلخی مرگ بہتر از شکر خوابے کہ من دارم

ببیں آں روئے و موئے و خط و خال و چشم و ابرو را
بہ دل دادن چہ می پرسی ز اسبابے کہ من دارم

عزیزا از ہمت بحر و نہ صدف بیروں بود جایش
بہ عالم جستجوئے درّ نایابے کہ من دارم

غالب کے ایک شاگرد

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی

۱۲۴۹ھ —— ۱۳۰۷ھ

(کلیاتِ عزیز: ۵۵ مطبع نامی لکھنؤ ۱۳۱۹ھ/۱۹۳۱ء)

'ماہِ مصر'، ماہِ کنعاں کے مرادف ہے اور لغات میں موجود ہے، مرزا کے تامل پر حیرت ہے، یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ سند میں کون سا شعر عزیز نے پیش کیا تھا۔ صائب کا یہ شعر راقم کو بہت دنوں سے یاد ہے لیکن اس وقت جو مطبوعہ دیوان سرسری طور پر دیکھا تو اس میں نہ ملا:

زصد ہزار پسر ہم چو 'ماہِ مصر' یکے　　چناں شود کہ چراغِ پدر کند روشن

(۴)

میر صفیر بلگرامی (۱۲۴۹-۱۳۰۷ھ) کے بزرگوں کا وطن بلگرام تھا، خود ان کی ولادت مارہرہ میں ہوئی لیکن پانچ ہی برس کی عمر میں اپنے خاندان کے ساتھ آرہ ضلع شاہ آباد (بہار) میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ خود لکھتے ہیں:

مولد و مسکن، وطن ہے اے صفیر　　تین جا مارہرہ، آرہ، بلگرام

ابھی کم عمر ہی تھے کہ شاعری کا شوق پیدا ہوا، پندرہ برس کے تھے کہ اپنے پھوپھا سید محمد مہدی خبر بلگرامی کے شاگرد ہوئے، بیس برس کے تھے کہ امان علی سحر کے شاگرد ہوئے، پچیس سال کی عمر میں مرثیہ گوئی کا شوق پیدا ہوا اور دبیر کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا، ۱۲۸۰ھ کے لگ بھگ فارسی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس رشتہ سے کہ صاحبِ عالم مارہروی (۱۲۱۱-۱۲۹۸ھ) ان کے نانا تھے وہ مرزا غالب کے شاگرد ہوئے اور ۱۲۸۲ھ میں ایک لمبا سفر کر کے مرزا غالب کی خدمت میں پہنچے اور دو ڈھائی ماہ تک ان کے پاس مقیم رہے، اپنی ملاقات کا حال انھوں نے بڑی تفصیل سے اور دل چسپ انداز میں جلوۂ خضر میں لکھا ہے۔

راقم کے علم میں مرزا غالب کے کسی ملنے والے نے اس شرح بسط سے ان سے اپنی ملاقات کا حال نہیں لکھا اس لئے یہ بیان بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اسے آج سے ۱۴ سال پہلے قاضی عبدالودود صاحب نے رسالہ 'اردو' میں شائع کیا تھا لیکن اب وہاں تک رسائی بھی عام نہیں۔ انھوں نے اس تحریر کی تمہید میں لکھا تھا:

"میر صفیر مرحوم کے بیان میں بعض باتیں محل نظر معلوم ہوتی ہیں:
میرزا کا دبیر کو بے مثال قرار دینا اور انیس کا ذکر تک نہ کرنا۔ مرزا کی غذا کے متعلق حالی اور صفیر کے بیان میں بہت فرق ہے شاعروں کے مختلف طرزوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ لفظ بہ لفظ مرزا کے ایک خط سے ماخوذ ہے جو اردوئے معلیٰ میں موجود ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ بجنسہ انھیں الفاظ میں خیالات کا اظہار دوبارہ کیا گیا، اور جو باتیں خط کی تحریر کے وقت یاد نہ آئی تھیں وہ تقریر کے وقت بھی فراموش رہیں، مثلاً ناسخ و آتش کے اشعار۔ میر صفیر مرحوم، ناسخ کے شاگرد کے شاگرد تھے، لیکن ناسخ سے جو عقیدت انھیں تھی وہ ان سے براہِ راست مستفید ہونے والوں میں بھی کسی کو نہ ہوگی، جب وہ ناسخ کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو قصیدے کا انداز آجاتا ہے، اس لئے یہ بخوبی ممکن ہے کہ لاشعوری طور پر ناسخ کے متعلق کچھ ایسی باتیں ان کے قلم سے نکل گئی ہوں، جو دراصل غالب کی بہ نسبت خود ان کے ذاتی خیالات سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں۔"

اب آپ صفیر بلگرامی کا بیان ملاحظہ فرمائیں:
مؤلف کا دہلی جانا اور حضرت غالب سے شاگردی کا خلعت پانا۔
۱۲۸۰ھ ہجری میں بندہ سید فرزند احمد صفیر اپنی دوسری شادی کے واسطے بلگرام گیا، اور بعد شادی کے اپنے نانا صاحب عالم صاحب سجادہ نشیں مارہرہ ضلع ایٹہ کی خدمت میں حاضر ہوا، رستے میں فرخ آباد پڑا، وہاں جناب ڈپٹی کلب حسین خاں بہادر نادر سے ملاقات کا لطف اٹھایا، جب مارہرے پہنچا اور نانا صاحب کی خدمت سے فیض یاب ہوا، وہاں حضرت غالب کا چرچا اور اُن کا ذکر بہت پایا، نانا صاحب سے اور ان سے ایک ربط خاص تھا، مگر لطف یہ ہے کہ ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی، میں نے خواہش کی کہ حضرت غالب کا شاگرد ہوں۔ اور ایک عریضہ مع دو غزل فارسی اور دو غزل ہندی کے مارہرے سے روانہ کیا، حضرت غالب نے اس کے آٹھویں دن ایک جلد مثنوی 'ابر گہر بار' اور جواب میرے خط کا مجھے بھیجا، میں نے ایک مخمس

قدسی کی غزل پر بہ فرمائش تفضل حسین خاں (جنھوں نے نعت کہنے والوں کا تذکرہ جمع کیا تھا) لکھا تھا اس کو حضرت غالب کے پاس اصلاح کے لئے بھیج کر بلگرام آیا اور وہاں سے آرے پہنچا، حضرت غالب نے اس مخمس پر ایک جگہ مقطع میں اصلاح دے کر بھیج دیا، جب میں نے بوستانِ خیال کو اردو کر کے اس کی جگہ ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بہ ذریعہ اودھ اخبار مشتہر ہوا، حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے پاس بھیجا، میں نے ایک جلد بھیج دی، اس وقت سے خط وکتابت رہی، یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے ۱۲۸۲ھ میں بے اختیار مجھے آرے سے دہلی چلنے کی تحریک کی اور بے شان گمان مارہرے پہنچا، اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ مع چند ملازموں کے روانہ، دہلی ہوا، آموں کا موسم تھا نانا صاحب نے اپنے باغ کے آم ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھ کر دیئے، میں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوا، دس بجے شب کو دہلی پہنچا، شب جمنا پار لال قلعے کے نیچے بسر کی۔ صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلہ بلی ماراں میں حضرت غالب کے پاس پہنچا، حضرت برآمدے میں بیٹھے کلی پی رہے تھے، ماموں صاحب بھی حاضر ہوئے، دیکھ کر بشاش ہو گئے، اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا پوچھا یہ کون ہیں عرض کیا صفیر، ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا، بولے ذرا ٹھہر جایئے، یہ کہہ کر بہ دقت ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اٹھے، اور بغل گیر ہوئے، اور برآمدے سے اندر آ کر بیٹھے، گرمی کے دن تھے، صفر کا مہینہ تھا، حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا پاجامہ سیاہ بوٹے دار دریس کا کلی دار، نیفہ سُرخ ٹول کا، بدن میں مرزائی، سر کھلا ہوا، رنگ سُرخ سفید، منہ پر داڑھی دو انگل کی، آنکھیں بڑی، کان بڑے، قد لمبا، ولایتی صورت، پاؤں کی انگلیاں بہ سبب کثرت شرب کے موٹی ہو کر اینٹھ گئی تھیں، اور یہی سبب تھا کہ اٹھنے میں دقت ہوتی تھی، آنکھوں میں نور موجود تھا، کان کی سماعت میں کچھ نقل آچلا تھا۔

الغرض اندر آ کر بیٹھے، بعد مزاج پرسی کے نانا صاحب کو بہت پوچھا اور کہا

افسوس کوئی سبب ایسا نہیں ہوتا جو حضرت کی ملازمت کروں، اتنے میں نواب ضیاء الدین خاں بھی تشریف لائے، حضرت نے مجھے ان سے ملایا۔ وہ بھی وجیہہ آدمی رئیسوں کی وضع پر تھے، کُرتا پہنے خلطہ دار پاجامہ، سر پر ٹوپی، جریب ہاتھ میں، بعد اس کے حضرت نے ان سے میرا حال کہا اور فرمایا یہ میری ملاقات کو آرے سے آئے ہیں، اس کے بعد کچھ ان سے سرگوشی ہوئی جب وہ اُٹھ گئے، اور دوپہر قریب ہوئی تو حضرت اُٹھے اور مجھے اور میرے ماموں کو اپنا تمام مکان دکھایا، ہر جگہ کا نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ مقام فلاں کام کے لیے، اور یہ فلاں کام کے واسطے، آخر زینے کے پاس آئے، اور چھت پر چلے، ہم لوگ بھی ساتھ تھے، اوپر جا کر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک کمرا گلی کے رخ بنا ہوا تھا۔

لطیفہ: فرمایا میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے یہ کہہ کر ہنسے اور بولے آپ سمجھے، میں نے کہا سمجھا، یعنی گرمی کے دن میں دہلی کی گرمی اور تمازت آفتاب سے در و دیوار اس قدر جلتے ہیں کہ آدھی رات تک ان کی گرمی فرو ہوتی ہے، الغرض، پھر کوٹھے کے نیچے آئے اور فرمایا اس مکان کے دکھانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان میں گنجائش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں، اس لیے، ضیاء الدین خاں صاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب ہے، آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے، گو تھوڑا سا دور ہے مگر آرام بہت ملے گا، میں نے عرض کی مجھے حضوری ضروری ہے، فرمایا کچھ ایسا دور نہیں ہے، یہ کہہ کر اپنے ایک رفیق کو بُلایا اور میرے ساتھ کیا، اس مکان میں پہنچے، وہ مکان عالی شان تھا ایک بڑا پھاٹک بر سر سڑک۔ جس پر ایک بنگلہ خوش نما بنا ہوا اس کے اندر ایک خانہ باغ تر و تازہ، اس کے بعد ایک ایوان عالی شان فرش و فروش سے آراستہ، سجا سجایا، اس کی پشت پر محل سرا، دونوں بغلوں میں کمرے، غرض بہت خوش آب و ہوا مکان ملا، ہم سب چھ آدمی تھے اس مکان کے ایک کونے میں سما گئے، الغرض ابھی اچھی طرح سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پانچ خوان جن پر خوان پوش خوش نما پڑے تھے انھیں رفیق کے ساتھ آئے،

معلوم ہوا کھانا ہے اور ایک خوان میں خوش رنگ و خوش بو تخمی آم تھے۔ میں نے خیال کیا کہ جب یہ آم خود ایسے ہیں پھر میرے ساتھ کے آم بھیجنے کے قابل کب ہیں، الغرض کھانا کھایا، بہت مزیدار اور خوش گوار تھا، قورمہ، قلیہ، شیر مال، پلاؤ، زردہ، شیر برنج، متنجن، کباب، پراٹھا، سب کچھ تھا، بعد کھانے کے آم جو کھانے بیٹھا، صورت حرام نظر آئے، بالکل کھٹے، میں پورب کے آم کھائے ہوئے تھا، بڑی نفرت ہوئی، "اپنے ساتھ کے آم نکال کر کھائے، اس سے کہیں بہتر پائے"، پھر تو میں نے نصف ٹوکرا حضرت غالب کی خدمت میں بھیجا، وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد ایک رباعی لکھ کر آئی جس کا آخری مصرع مجھے یاد ہے:

کھانا نہ اسے کہ یہ پرائے ہیں آم،

اور سب آم منگا لیے، آم کا شوق حضرت کو بہت تھا، الغرض شام کو میں پھر حاضر خدمت ہوا، آموں کی بہت تعریف کی، قریب مغرب میں فرودگاہ پر آیا، صبح کو فیض صفیر رسالۂ تذکیر و تانیث کا لے کر گیا، حضرت نے خود لے کر اسے دیکھا اور بے عینک کے دیکھا اور دو چار روز میں تمام رسالہ دیکھ ڈالا، اور بہت تعریف کی اور اس کی تقریظ لکھ کر مجھے دی جو اس رسالے کے ساتھ چھپی ہے، اور عود ہندی میں بھی موجود ہے۔

ہر روز کی ملازمت سے طبیعت محظوظ ہوتی رہی، ایک دن قریب دوپہر کے پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں قریب پٹی کے حاضر تھا، بولے کیوں حضرت برف کا پانی پیو گے میں نے کہا اگر کوزہ کا پانی پینا ہو تو پلوائیے، ہنس کر بولے ضرور، اور آدمی کو پکار کر کہا کہ فلاں کوئیں سے پانی لے آؤ، میں نے کہا حضور نے برف کا پانی کہا تھا، فرمایا برف ہی کا ہے، غرض پانی آیا، بہ با واقعی سرد تھا، فرمایا یہ ایک کنواں ہے جس کا پانی ایسا ہوتا ہے۔

ایک دن ایک صاحب نے مجھے پوچھا اور مذہب کو استفسار کیا، میرے ماموں صاحب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "منہم"، اور میری طرف اشارہ کر کے

فرمایا "متا"۔

ایک دن مرثیے کا ذکر آگیا فرمانے لگے میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا تین بند کہہ کر دیکھا تو واسوخت ہوگیا وہ بند یہ ہیں[1]... پھر فرمایا کہ واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے، دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اُٹھا سکتا۔

ایک دن فرمایا کہ آپ کہتے ہوں گے کہ غالب کچھ اچھی اچھی چیزیں کھاتا ہوگا اور میرے کھانے کے لئے معمولی، پلاؤ، قورمہ، قلیہ، شیرمال وغیرہ بھیج دیتا ہوگا، آج آپ میرا کھانا دیکھیے، الغرض گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا، ایک دسترخوان بچھایا گیا، اس پر ایک چینی کے پیالے میں شوربا اور ایک میں بھرا ہوا گھی گرم کیا ہوا، اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت کی بوٹیاں اور ایک تانبے کی رکابی میں تین پھلکے روبے کے، اور ایک رکابی تانبے کی خالی، پھر وہ رفیق آکر بیٹھے، اُنھوں نے پھلکوں کے کنارے توڑ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کیے، اور خالی رکابی میں رکھے پھر ایک چمچے سے تھوڑا گھی اور شوربہ لے کر ان ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملا کر حلوے کی طرح بنا کر لقمے کے انداز سے ایک طرف رکابی میں رکھ دیا، اتنے میں حضرت پلنگڑی سے اُترے اور دسترخوان پر آبیٹھے، پہلے وہ دونوں لقمے نوش جاں فرمائے، اس کے بعد آدھا پیالہ شوربا اور آدھا پیالہ گھی کا پی گئے، البتہ آدھ سیر گھی سے کم نہ ہوگا، بعد اسکے پھلکوں کے دو چھلکے لے کر شوربا ملا ملا کر کھائے، اس پر پھر بقیہ گھی اور شوربا پی لیا، اور کھا چکے، اور فرمایا بس میرا کھانا یہی ہے، شب کو پاؤ بھر بادام مقشر نمک میں تلوا کر کھا لیتا ہوں۔

ایک دن نواب ضیاء الدین خاں نے میری دعوت کی، بہت تکلف کا کھانا کھلایا، میں ان کھانوں کی تعریف نہیں کر سکتا، بہت دیر تک باتیں ہوا کیں،

---

[1] یہ تین بند بعینہ وہی ہیں جو ریاض الدین امجد کے سیر دہلی میں مندرج ہیں اور راقم نے اس مضمون کی ابتدا میں نقل کئے ہیں۔ اس لئے یہاں حذف کر دیئے گئے۔

ایک دن مولوی صدرالدین صاحب آزردہ کے پاس مجھے لے گئے، اُن کے فیض سے بھی کامیاب ہوا۔

ایک دن پنکھے کے میلے میں دس روپے دے کر اپنے عزیزوں کی طرح مجھے بگھی پر بھیجا، وہ میلا بھی قابلِ دید تھا، دہلی کا میلا کیا کہنا ہے، میں نے دہلی کی سیر خود اختیاری بھی خوب کی، جامع مسجد کو دیکھا، سبحٰن اللہ کیا کہنا ہے۔ . . تبرکات کی زیارت کی جناب امیر اور حسنین علیہم السلام کے دستِ مبارک کے قرآن لکھے ہوئے دیکھے، خطِ کوفی میں تھے، چوک کی سیر روز کرتا تھا، بازاروں میں پھرتا تھا، مگر دہلی عجب مقام ہے، جہاں کسی کو کسی سے کام نہیں، چیزوں کی خریداری کرو، دام پوچھو، چیز لو، دام دو، کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں کے رہنے والے ہو، خواجہ امان صاحب مترجم بوستانِ خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے، دو مرتبہ مشاعروں میں بھی لے گئے، وہاں کی غزلیں میرے دیوان 'خم خانہ' میں چھپی ہیں۔

غرض دہلی میں رہ کر خوب سیر کی، خوب لطف اُٹھائے، آخر رمضان ۱۲۸۲ ہجری تک آرہ چلے آئے، جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے خط و کتابت جاری رہی، آخر ۱۲۸۵ھ میں انتقال فرمایا۔

کلام معجز نظام ان کا فارسی اور اردو ہر جگہ موجود ہے، مگر دو غزلوں میں سے کچھ لکھتا ہوں، ایک وضع اوّل کی دوسری وضع ثانی کی[1]

مجھ سے اور حضرت غالب علیہ الرحمۃ سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی، اور سبب اس کا یہ ہوا کہ ان دنوں حضرت اپنے ایک رسالے کا مسودہ اردو زبان کی تحقیق میں کاتب سے لکھوا رہے تھے، جو میں نے اس کے صاف شدہ اجزا ہاتھ میں لے لیے، حضرت نے دیکھ کر فرمایا ہاں، اس کو دیکھو یہ ایک

---

[1] جلوۂ خضر جلد اوّل ص ۲۲۱ - ۲۲۸

چیز ہیں نے ان دنوں بہ فرمائش ڈائرکٹر صاحب لکھی ہے، اس میں اردو کی مختصر تاریخ اور کچھ قواعد تھے، کوئی پانچ چھ جزو کا رسالہ تھا، جناب ڈائرکٹر صاحب نے مؤلف کے نانا حضرت صاحب عالم کو بھی خط لکھا تھا کہ زبان اردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجئے، چناں چہ حضرت نے اس کا اہتمام میرے سپرد کیا تھا، مگر میں نے اس کا مسودہ درست کرکے بھیج دیا تھا، پھر خدا جانے کیا ہوا، اس طرح حضرت غالب کو بھی لکھا تھا، وہ اسی رسالے کو لکھوا رہے تھے، الغرض اسی رسالے کو پڑھنے میں کچھ دہلی و لکھنؤ کی زبان کا ذکر آگیا، فرمایا، میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے، ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا، اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے، ہاں قواعد لکھ نہیں گیا، قواعد جاننے والا اس کے کلام میں مزا پاتا ہے، ہماری دتی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رہا، مگر یاد رہے، اس مضمون میں دلی کے برابر میں کسی کو نہیں سمجھتا، پھر ہنس کر فرمانے لگے، اس زبان پر اس کے سوا اور ہوتا کیا، میں نے بھی ایک طرز خاص ایجاد کیا تھا، جس میں ہر طرح کے مضمون کو نشو و نما ہو سکتا تھا، مگر یاروں نے چلنے نہ دیا، اور سچ پوچھو تو یہ ایجاد ناسخ کا ہے، میاں، جب ناسخ کا کلام دہلی میں پہنچا، جیسا تم نے دلی کے دیوان کا حال سنا ہوگا کہ دتی میں آیا تو جیسے نئی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں، اسی طرح اس کے کلام پر گر پڑے، اس وقت فارسی کی شاعری دہلی میں بہت چمکی تھی مگر اردو کی مداخلت فقط بول چال میں تھی۔ اس کو سلسل نظم میں جو دیکھا تو نو خیز اور فارسی داں سب اس کی تقلید پر چلنے لگے، اور ہر ایک نے اپنے اپنے معلومات کے مطابق رہبری کی۔ مگر وہ فقط زبان کو نظم کر دیتا تھا۔ کچھ ایسی دقت نہ ہوئی، پھر بھی جتنے لوگوں نے ادھر توجہ کی، ہر ایک کی نئی طرز ہوگئی، مگر ناسخ کے کلام نے دہلی میں آکر سب کو حیران کر دیا، اور قاعدے کے ساتھ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا، دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا، یہاں تک کہ شعرا نے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا، اس وقت ہم تین شاعر باذوق

نام برآوردہ تھے، میں اور مومن خاں اور ذوق۔ ذوق نے ادھر کم رغبت کی، کیوں کہ ان کو اپنے مضمون ہی کے باندھنے میں دقت پڑتی تھی، زبان کی طرف کب خیال کر سکتے ہیں، مگر مومن خاں نے خیال کیا۔ پہلے یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے، شاہ نصیر کی جو طرز ہے وہ معلوم ہے، مگر مومن خاں نے ان کو چھوڑ کر ناسخ کی طرز پر غور کیا اور فارسی کی تراش خراش پر توجہ کی، ادھر میں نے بھی، غرض ہم دونوں دہلی کے طرز زبان کو چھوڑ کر ترکیب اور بندش کی درستی میں مصروف ہوئے، مگر جب بہت کچھ کہہ گئے تو دیکھا کہ ہم دونوں کی طرز الگ الگ ہو گئی، اور کوئی ناسخ سے نہ ملی۔ میں نے تو میر تقی میر کا انداز اختیار کیا اور مومن خاں اپنے اسی رنگ میں رہے۔ خلاصہ یہ کہ دہلی کی زبان میں ہر شاعر کے کلام میں اختلاف پاؤ گے اور اختلاف کی وجہ یہی ہے کہ ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا جس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی ایک ہی زبان ہو گئی۔ وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہنچتے، ناچار اپنی جودت طبع سے جو کچھ ہوا وہ کیا مگر یاد رہے کہ مضمون دہلی کا اور زبان لکھنؤ کی مستند ہے ایک تمھارے بحر صاحب فرماتے ہیں:

نہاتا ہے وہ مہ دریا میں کپڑے حور دھوتی ہے

یہ معشوق کی تعریف نہیں ہوئی، بلکہ ایسا غریب معشوق ہے کہ کھڑے گھاٹ کپڑے دھلواتا ہے، اسی طرح شعرائے لکھنؤ کے اور چند شعر پڑھے، میں نے عرض کی کہ حضور یہ سب سچ فرمایا مگر اتنا تو خیال کیا جائے کہ شاعر کو مضمون مل جانے اور باندھنے سے کام ہے، عشق و عاشقی ان کی بلا جانے، نہ یہ حقیقی عاشق اور نہ ان کا کوئی حقیقی معشوق، ان کے خیال کو خدا نے ایسی قوت عنایت فرمائی ہے کہ دوسروں کے حالات کو اپنے وہم کے زور سے ایسا باندھ دیتے ہیں کہ ہو بہو ہو جاتا ہے۔

ایک حقیقت میں اپنے شعر کی عرض کروں، میں چھپرے میں ایک دوست کی ملاقات کو گیا، وہاں چند اشخاص اور بھی بیٹھے تھے، دو آدمی الگ کربیوں پر تھے، مجھ سے لوگوں نے کہا کچھ شعر پڑھیے، میں نے چند شعر پڑھے، من جملہ ان کے ایک یہ شعر بھی پڑھا:

کس وقت سے ہم جام ہتھیلی پہ لئے ہیں
تو، تھوڑی سی رنجش کو زیادہ نہیں کرتے

اس شعر پر وہ دونوں شخص جو کرسیوں پر تھے، آپس میں کہنے لگے، بھئی یہ تو رات کا بالکل واقعہ ہے، جناب پھر پڑھئے گا میں نے پھر پڑھا، ان لوگوں نے اس شعر کو لکھ لیا، اور حقیقت یہ ہے کہ نہ میں شراب پیوں، اور نہ ایسا شرابی شخص میرے پاس تھا، جس کے واسطے میں شراب جام میں بھر کر یہ کہتا، فقط وہم و خیال کا یہ کھیل ہے حضور مطلب اس تقریر سے یہ ہے کہ شاعر کے خیال میں جو کچھ آجائے، اس کو باندھ دینا چاہیئے، کیا غریب معشوق نہیں ہو سکتا ہر ایک کا معشوق الگ ہوتا ہے، کسی کو گورا پسند ہے، کسی کو سانولا، معشوق من است آں کہ بہ نزدیک تو زشت است، کا حال ہے۔

یہ سُن کر حضرت غالب ہنسے اور فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہے، مگر میاں میں نے غزل گو شعرا کے لئے ایک میزان درست کی ہے، وہ یہ ہے کہ فارسی میں رودگی اور فردوسی سے لے کر خاقانی اور سنائی اور انوری وغیرہم تک ایک گروہ ہے، ان حضرات کا کلام تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے، پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہیں، سعدی و جامی، و ہلالی یہ اشخاص متعدد ہیں، فغانی ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا، خیالہائے نازک اور معانیِ بلند کا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے، سبحان اللہ قالبِ سخن میں جان پڑ گئی۔ اس روش کو بعد اس کے صاحبانِ طبع نے سلاست کا پرداز دیا، صائب و کلیم و سلیم و قدسی و شفائی اس زمرے میں ہیں، رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا، اد سعدی کی تحریر نے بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہریں، خاقانی اس کے اقران، ظہوری اسکے امثال، صائب اس کے نظائر، اب ان میں جس کی طبیعت کو خفانیت کی طرف میلان ہو گیا، جس کو بہ ظاہر عشق مجازی کا زینہ، آخر، اد حقیقی کا زینۂ اول کہہ سکتے ہیں، ان کا

کیا پوچھنا، اور جو مجازی میں پورے نکلے، وہ بھی قدم بہ قدم ٹھہرے، اور ان کے بعد کے درجے والے سب حقیقی ہیں ہیں:

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار — زیک جام اند در بزمِ سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں — خمارِ چشم ساقی تیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم — ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ 'چیزِ دگر' حصے میں پارسیوں کی آئی ہے، ہاں اردو زبان میں اہلِ ہند نے وہ چیز پائی ہے، جیسے میر تقی میر:

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو — رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا:

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار — خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

قائمؔ:

قائمؔ اور تجھ سے طلب بوسے کی کیوں کر مانوں — ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بد آموز نہیں

مومن خاں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے یہاں کم تر، آتش کے یہاں بیش تر، یہ تیر نشتر ہیں، مگر مجھے کوئی ان کا شعر اس وقت یاد نہیں ہیں نے التماس کیا کہ میں ان لوگوں کے شعر عرض کروں، فرمایا ہاں پڑھو

ناسخ:

یہ بھی کہتا ہے جلوہ میرے بُت کا — کہ اک ذات خدا ہے اور میں ہوں
جن کی رفتار کے مائل ہیں ہم — وہی آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں
رکھو کسی طرح تو سروکار، مہرباں — کرتے رہو جفا ہی، وفا گر نہ ہوسکے
مر چلا ہوں امیدواری میں — ایسے ہاں سے وہ کرتے کاش نہیں

یہ شعر سُن کر حضرت غالب نے فرمایا، ہاں، ان میں بعض نشتر ہیں، پھر میں نے آتش کے شعر پڑھے:

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اُٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

دمِ آخر بھی بالیں پر مرے ہم راہ یار آئے — رقیبوں نے محل رکھا نہ باقی عذر خواہی کا

اس بلائے جاں سے آتشؔ دیکھیے کیوں کر بنے — دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوئے دوست

سجدۂ شکر خدایا میں کیے رکھتا ہوں — قدمِ یار پہ ہے سر کو جھکانا شبِ وصل

یہ شعر سُن کر فرمایا، ان میں بھی بعض[5]

حواشی :

(۱) میر صفیر کی دوسری شادی، سید غلام حسین قدر بلگرامی (۱۲۴۹-۱۳۰۱) کے خاندان میں ہوئی تھی (جلوۂ خضر ۲/۲۲۷) خود قدر کی شادی صفیر کے خاندان میں کواتھ ضلع آرہ بہار میں ہوئی تھی۔

(۲) کلب حسین نادر سے مرزا غالب کے بھی تعلقات تھے، دیوانِ قصائد چھپ چکا ہے اور اس میں مرزا کا لکھا ہوا دیباچہ بھی ہے، جو عودِ ہندی: ۱۸۵ اور اردوئے معلّیٰ: ۳۵۲ میں بھی موجود ہے۔ صفیر نے، نادر سے اپنی ملاقات کا بڑا دل چسپ حال لکھا ہے، یہاں اس کا اختصار پیش کیا جاتا ہے:

'جب میں ۱۲۶۱ھ میں اپنی شادی کے لئے بلگرام گیا اور وہاں سے بشوق زیارت نانا صاحب مارہرہ روانہ ہوا، رستہ میں فرخ آباد پڑا، فتح گڈھ میں جہاں چھاؤنی سرکاری ہے، جناب نادر نے ایک بنگلہ بنوایا تھا، اس میں رہتے تھے، مجھے معلوم تھا مخصوص ان کی ملاقات کے لئے، میں نے فرخ آباد میں قیام کیا، اور ایک بجے دن کو جناب نادر کی ملاقات کو گیا، دو بجے پہنچا، باغ میں بنگلہ خوش نما تھا، غلام گردش میں دو چار کُرسیاں بچھی تھیں اور کمروں کے دروازے بند تھے، ہم اور ایک عزیز ہمارے ساتھ تھے بیٹھ گئے۔ حیران تھے کہ کیوں کر اطلاع کی جائے ایک نوکر اُن کا ادھر سے گزرا، اس سے کہا گیا کہ ڈپوٹی صاحب سے جا کر اطلاع کرو کہ ایک صاحب پورب سے

---

[5] جلوۂ خضر جلد اوّل: ۲۴۰ در ذکر مومن

آپ کی ملاقات کو آئے ہیں وہ گیا، اور آیا اور کہا کہ پوچھتے ہیں کہ آپ کون ہیں۔

لطیفہ: میں نے سُنا تھا کہ ڈیپوٹی صاحب شاعر کے نام سے فوراً چلے آتے ہیں میں نے کہا جاکر کہہ کہ ایک 'شاعر' آئے ہیں، اس نے جاکر کہا کہ ایک 'سائل' آئے ہیں، جواب ملا کہ اس وقت جایئے کل صبح کو آیئے گا، جب مجھ سے آکر یہ جواب کہا گیا میں نہایت متحیر ہوا کہ ڈیپوٹی صاحب کو سُنا کیسا تھا اور جواب کیسا پایا، پھر میں نے پوچھا تم نے کیا کہا تھا اس نے کہا میں نے کہا تھا 'سائل' آئے ہیں، میں یہ سُن کر ہنسا اور کہا یہی سبب ہے جو ڈیپوٹی صاحب نے ایسا جواب دیا، جاکر کہو شعر، غزل کہتے ہیں، اور یہ فقرہ میں نے ذرا زور سے کہا، شائد کمرے میں جو باہر سے بند تھا سُن رہے تھے، ایک بار جس جگہ میں بیٹھا تھا وہ دروازہ کھلا اور جناب نادر نہلائے ہوئے بال پوچھتے سامنے آئے، اور بولے: کون حضرت ہیں؟

میں سامنے گیا اور بولا میرا نام سیّد فرزند احمد تخلص صفیرؔ ہے، بلگرام وطن ہے، آرہ مسکن ہے، حضرت صاحب عالم کا حقیقی نواسا ہوں اور میر محمد عسکری صاحب کا پوتا یہ سُنتے ہی بے تابانہ ننگے پاؤں باہر نکل آئے اور مجھ سے بغل گیر ہو کر اندر لے گئے، اندر جاکر دیکھا تو کمرا بہت آراستہ تھا، سامنے ایک مسہری لگی تھی جس کا پردا رنگین گوٹے پٹھے سے آراستہ، چھت کا پنکھا رنگین پٹھا لگا، ایک طرف مسند لگی تکئے رکھے، سب رنگین، اور خود جناب نادر کی عمر پچاس سے متجاوز تھی، مسند پر بیٹھے اور مجھے بھی بٹھایا، حال پوچھا، میں نے سب کیفیت اپنے آنے کی بیان کی، معذرت کرنے لگے کہ معاف کیجیے گا، اس نادان نے سائل کہا اس لئے میں نے صبح کو آنے کو کہدیا تھا مجھ سے پوچھا آپ کس کے شاگرد ہیں، میں نے کہا جناب سحر لکھنوی کا، فرمایا غدر میں وہ بلگرام ہوتے ہوئے یہاں بھی آئے تھے اور یہاں سے جاکر راہ میں انتقال کیا، پھر اُنھوں نے مجھ سے شعر پڑھنے کو کہا، اتنے میں جناب امداد حسین صفیر فرخ آبادی شاگرد جناب بحر علیہ الرحمۃ بھی تشریف لائے اور چند خوش مذاق بھی موجود ہوئے... چند شعر سر دیوان 'صفیر بلبل' کے پڑھے سب نے۔ بہت تعریف کی اور خود جناب نادر

نے اپنی بیاض نکالی اور اپنی غزلیں پڑھنا شروع کیا...!![51]

(۳) صفیر و غالب کی خط و کتابت کے لئے دیکھا جائے راقم کا مضمون: غالب کے خطوط بہ نام صفیر بلگرامی، مطبوعہ نگار[52] شاہ عالم بھی غالب کے شاگرد تھے! انکے نام اردوئے معلیٰ میں غالب کے دو خط بھی موجود ہیں دیوان فارسی واردو حبیب گنج میں موجود ہے اور راقم کی نظر سے گزر چکا ہے۔

(۴) تفضل حسین خاں کی کتاب راقم کی نظر سے گزری ہے، اس وقت پیش نظر نہیں جہاں تک یاد آتا ہے اس میں صفیر کا مخمس موجود نہیں اور نہ قاضی محمد عمر کی 'حدیث قدسی' میں موجود ہے، جس میں اس عہد کے تقریباً ہر ممتاز شاعر کا مخمس پایا جاتا ہے۔ اس کتاب میں بدرالدین علی خاں مہرکن نقشی: ۱۰۱، رحیم بیگ سردھنہ رحیم ۱۱۶، فتح الملک رمز ۱۲۰، غالب ۱۱۴، مجروح ۹۲ مہر ۹۰ عیش ۹۲ مومن ۹۱ مولوی ظہور علی دہلوی ۵۶، بہادر شاہ ۵۵ کے علاوہ اور بیسیوں کے مخمس موجود ہیں۔ صفیر کا مخمس ان کی اپنی کتاب 'میلاد معصومین': ۳۲ (عزیزی پریس آگرہ) میں موجود ہے۔

(۵) آموں کی تعداد میں صفیر سے بھول ہوئی ہے، ایک ٹوکرے میں (ٹوکرا بھی ایسا جو مارہرے سے دہلی تک بہ آسانی آجائے) چھوٹے چھوٹے بھی دو ہزار آم نہیں آسکتے، اور غالب تو آم کے شیدائی تھے، اور مارہرہ کے آموں کی دعوت انہیں برسوں سے دی جارہی تھی، اس لئے ظاہر ہے صفیر بہت اچھے آم لائے ہوں گے، اچھے اور بڑے دانے دو ہزار کی تعداد میں ایک ٹوکرے میں کیوں کر سما سکتے ہیں!

(۶) صفیر، مرزا غالب کی ثقل سماعت پر زیادہ زور نہیں دیتے لکھتے ہیں کان کی سماعت میں کچھ ثقل آچلا تھا، اس سے دو سال پہلے خواجہ عزیزالدین ان سے ملنے آئے تھے ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سننا ان کے لئے بالکل ممکن نہ تھا، لکھ کر باتیں ہوتی تھیں، ان دونوں کے بیانات میں بڑا تضاد ہے۔

---

[51] جلوۂ خضر: ۲/۲۶۰۔ [52] بابت جولائی ۱۹۵۱ء

(۷) صفیر، غالب کے ان رفیق کا نام نہیں بتاتے جو غالب کے ساتھ تھے، اور جو نواب ضیاء الدین رخشاں کے مکان میں صفیر اور ان کے ساتھیوں کے لیے کھانا لوا کر آئے تھے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے ساتھ مستقل طور پر رہتے تھے۔ ان کے ملازموں کے علاوہ ہمیں کسی اور شخص کی اطلاع نہیں ہے جس کا قیام ان کے ساتھ ہو۔ نہ صفیر سے بتایا کہ ان کے ساتھ چھ آدمی اور کون تھے، شاہ عالم کا تو ذکر آیا ہے، بقیہ چار کون تھے۔

(۸) صفیر کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ اُن کا رسالہ 'تذکیر و تانیث' غالب نے ان کے سامنے دو چار دنوں میں دیکھ ڈالا اس کی تصحیح کی اور پھر تقریظ لکھ کر دے دی، ایک دوسری جگہ بھی تقریباً یہی بات لکھی ہے: "رسالہ 'فیض صفیر' جو تانیث و تذکیر کے باب میں ہے، حضرت نے کئی روزوں میں خود اپنی آنکھ سے ملاحظہ فرمایا اور جا بہ جا اصلاح دی اور اس کی تقریظ لکھی۔"[۵۱]

لیکن غالب کے ایک غیر مطبوعہ خط سے جسے راقم نے دریافت کیا ہے، اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے دیباچہ بعد کو لکھ کر مارہرہ روانہ کر دیا تھا وہاں سے صفیر کو عظیم آباد بھیجا گیا، مرزا، صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:

"دیباچے کا عظیم آباد کو روانہ ہونا معلوم ہوا مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ لختِ جگرِ نور بصر مولوی سید فرزند احمد کو وہ دیباچہ پسند آیا یا نہیں، ہات رعشہ دار، آنکھیں ضعیف البصر، حواس مسلوب ہیں، قصہ مختصر من کل الوجوہ وہاں غالب مغلوب ہیں۔"[۵۲]

ظاہرا، صفیر بلگرامی کی جس کتاب کے دیباچے کا عظیم آباد روانہ ہونے کا ذکر ہے اس سے مراد 'فیض صفیر' ہی ہے، اس لیے کہ صفیر کی کسی اور کتاب پر غالب کا دیباچہ یا تقریظ موجود نہیں۔

---

[۵۱] جلوۂ خضر ۲/۲۲۶

[۵۲] علی گڑھ میگزین 'غالب نمبر': ۹۷ نوادرِ غالب

صفیر نے دیباچہ عظیم آباد کے بجائے مارہرہ اس لیے بھیجا ہو گا کہ یہ سیّد احمد حسن بلگرامی کی فرمائش سے غالب نے لکھا تھا وہ چاہتے ہوں گے احمد حسن اور صاحب عالم وغیرہ پہلے دیکھ لیں پھر پٹنہ کے مطبع میں جائے۔

(۹) میر صفیر کے ماموں، شاہ عالم مارہروی سُنّی المذہب تھے اور میر صفیر شیعی، اسی لیے کسی کے استفسار کے جواب میں مرزا نے ان کی طرف دیکھ کر کہا 'منھم' (یہ اُن لوگوں میں سے ہیں) اور میر صفیر کی طرف اشارہ کرکے کہا 'منا' (ہم لوگوں میں سے ہیں)

(۱۰) مرثیہ کے ذکر میں اگر غالب انیس کا ذکر نہ کرکے صرف دبیر کا ذکر کرتے ہیں، تو جائے تعجب نہیں مقام حیرت یہ ہے کہ وہ ریاض الدین امجد بھی مرثیہ کے ذکر میں صرف دبیر کا نام لیتے ہیں، کیا واقعی ایسا تو نہیں کہ مرزا دبیر کو انیس پر بدرجہا فضیلت دیتے ہوں کہ موخرالذکر کے ذکر کو بھی ضروری نہیں سمجھتے ہوں۔

(۱۱) مرزا غالب کی غذا کا بیان صفیر کی غلط فہمی پر مبنی ہے، اوسط درجے کے تندرست آدمی بھی آدھ سیر گھی اُٹھا کر پی نہیں جاتے، چہ جائے کہ غالب بایں ضعف و اضمحلال، وہ 'آبِ گوشت' ہو گا جسکی طرف غالب نے اپنے خطوں میں اور حالی نے یادگار میں اشارہ کیا ہے، آبِ گوشت کے روغن کو جو پیالے کی سطح پر تھا اسے وہ گھی سمجھ گئے، اور یہ لکھ دیا کہ آدھا پیالا گھی کا پی گئے۔

(۱۲) ترجمہ نیّر رخشاں کے لیے، ملاحظہ ہو، جلوۂ خضر ۱/۲۲۸

(۱۳) اکبر شاہ ثانی کے منجھلے لڑکے مرزا جہانگیر ایک مقدمے میں ماخوذ تھے، بادشاہ بیگم نے منّت مانی کہ وہ چھوٹ کر آئیں تو خواجہ بختیار کاکیؒ کی مزار پر چادر اور پھولوں کی مسہری چڑھاؤں گی، کام یابی کے بعد یہ تقریب بڑے دھوم دھام سے منائی گئی، قطب میں کئی دن تک میلا رہا، پھول والوں نے جو مسہری بنائی تو اس میں خوبصورتی کے لیے ایک پھولوں کا پنکھا بھی لٹکا دیا، ظفر ولی عہد سلطنت نے 'پنکھا' کہہ کر گزرانا:

نور و الطاف و کرم کی ہے یہ سب اسکے جھلک ۔۔۔ کہ وہ ظاہر میں ملک اور ہے باطن میں ملک

اس تماشے کی نہ کیوں دھوم ہو افلاک تلک　　　آفتابی سے خجل جس کے ہے خورشید فلک

یہ بنا اس شہِ اکبر کی بدولت پنکھا

بادشاہ کو میلا بہت پسند آیا، دلی والوں سے پوچھا کہ اگر ہر سال بھادوں کے شروع میں یہ میلا ہوا کرے تو کیسا ہو، مسلمان درگاہ پر پنکھا چڑھائیں ہندو جوگ مایا جی پر چڑھائیں۔

دلّی والے راضی ہوئے اور پھول والوں کی سیر کی بنیاد پڑ گئی، اسے پھول والوں کی سیر کہہ لیجئے یا پنکھے کا میلا، بات ایک ہی ہے، تفصیل کے لئے، دیکھئے مضامین فرحت حصہ دوم ص ۵۔

مرزا غالب ایک خط میں خواجہ بے خبر کو لکھتے ہیں: اس شہر میں ایک میلہ ہوتا ہے پھول والوں کا کہلاتا ہے۔ بھادوں کے مہینے میں ہوا کرتا ہے، امرائے شہر سے لے کر اہلِ حرفہ تک قطب جاتے ہیں، دو تین ہفتہ تک وہیں رہتے ہیں، مسلمان و ہنود دونوں فرقے کی شہر میں دوکانیں بند پڑی رہتی ہیں، بھائی ضیاء الدین خاں اور شہاب الدین خاں اور میرے دونوں لڑکے سب قطب گئے، ہوئے ہیں اب دیوان خانہ میں ایک میں ہوں اور ایک داروغہ اور ایک بیار خدمت گار" اردوئے معلّی: ۲۱۳

صفیر کا بیان کہ پنکھے کے میلے کے لئے مرزا نے انھیں دس روپئے دے کر عزیزوں کی طرح بگھی پر بھیجا، محل نظر ہے، اس عہد میں روپیہ کی قیمت بہت کافی تھی، بہادر شاہ جو شہنشاہِ ہند تھے وہ تو اپنے اُستاد، ذوق کو ابتدا میں چار روپیہ ماہوار دیا کرتے تھے۔

(۱۴) جامع مسجد کے تبرکات اور اس کی تفصیل کے لئے "واقعات دارالحکومت دہلی" ۲/۱۱۰ دیکھا جائے، تبرکات وہاں اب بھی ہیں۔

(۱۵) صفیر نے غالب کی جو دو غزلیں نقل کی ہیں، ان کے پہلے شعر یہ ہیں:

صفائی حیرت آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر　　　تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں　　　شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

(۱۶) غالب نے اردو زبان کی تحقیق میں کوئی رسالہ پانچ چھ جزو کا لکھا تھا، یہ محلِ نظر ہے[۵۱]، صفیر کے علاوہ اس رسالے کا ذکر کسی نے نہیں کیا، خود غالب کی تحریروں میں اسکا پتا نہیں، اس قدر اہم موضوع پر ان کی کوئی تصنیف ہوتی تو اور معاصرین بھی اس کا ذکر ضرور کرتے، اور وہ کتاب اس قدر جلد فنا بھی نہ ہو جاتی، خود غالب کے ایک خط سے اس کے خلاف مترشح ہوتا ہے، وہ خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں: جناب کیمسن صاحب بہادر افسر مدارس غرب و شمال کا باوجود عدم تعارف خط مجکو آیا، کچھ اردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا، اس کا جواب لکھ بھیجا، نظم و نثر اردو طلب کی تھی مجموعۂ نظم بھیج دیا، نثر کے باب میں تمھارا نام نہیں لکھا مگر یہ لکھا کہ مطبع الٰہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے بعد انطباع وحصول اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دوں گا"[۵۲]

ایم کیمسن، اس وقت ڈائرکٹر تعلیمات ممالک مغربی و شمالی ہند تھے، وہ ایک تذکرۂ شعرا مرتب کرنا چاہتے تھے جس میں تاریخ ادب اردو کی بھی آجاتی، انھوں نے غالب اور صاحب عالم مارہروی کو اس سلسلے میں خطوط لکھے تھے اور اوروں کو بھی ضرور لکھے ہونگے، غالب نے اس کا جواب لکھ بھیجا، قابلِ غور امر یہ ہے کہ غالب کسی کتاب کی تصنیف کا

---

[۵۱] قواعد صرف فارسی میں مرزا کی ایک تصنیف 'نکات و رقعات غالب' ضرور موجود ہے جسے میجر فلر کے پاس بھیجا گیا تھا، اس نے مدارس میں پڑھانے کے لیے ۵۰۰ نسخے اس کے مطبع سراجی میں ۱۲۸۶ھ میں چھپوائے تھے، اس کے اہتمام میں منشی پیارے لال دہلوی بہت رہے تھے، اس نایاب کتاب کا ایک نسخہ جناب سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کے پاس موجود ہے اور انھوں نے عنایت فرما کے اسکی ایک نقل ہمیں عنایت فرمائی ہے۔

[۵۲] عود ہندی: ۵۰، طبع اوّل۔ غالب کے اس خط کے جواب میں بے خبر نے جو خط انھیں لکھا تھا اسکی مندرجہ ذیل سطریں قابلِ ذکر ہیں: منشی ممتاز علی خاں صاحب کو میں نے کل لکھا کہ آپ ایک عرضی جناب کیمسن صاحب بہادر کے حضور میں بھیج دیں اور اس میں یہ لکھیں کہ حضرت غالب نے آپ کو جس مجموعۂ نثر کا ذکر لکھا ہے اسے میں مرتب کرتا ہوں عنقریب چھپنا شروع ہوگا۔ کچھ جلدیں مدرسوں کے لئے آپ بھی خریدیں تو آپ کی اس اعانت سے کتاب جلد چھپ جائے۔ اس سے بہتر اور کوئی طریقہ صاحب تک ذکر پہنچانے کا میری رائے میں نہ آیا۔

ذکر نہیں کرتے، "خط مجکو آیا... اس کا جواب لکھ بھیجا" سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بس اسکے جواب میں ایک خط لکھ دیا ممکن ہے وہ خط کچھ طویل ہو، لیکن پوری کتاب لکھی ہو یہ قرین قیاس نہیں، مجموعۂ نظم سے مراد دیوان غالب جس کے کئی ایڈیشن اس وقت تک نکل چکے تھے، مجموعۂ نثر یعنی عودِ ہندی جس کی ترتیب و اشاعت کا کام خواجہ غلام غوث کر رہے تھے، یہ مجموعہ مطبع مجتبائی میرٹھ سے چھپ کر شائع ہوا، لیکن مرزا، ابتدا میں یہی سمجھتے رہے کہ اس کی طباعت کا کام بھی الہ آباد ہی میں ہو رہا ہے جہاں غلام غوث مقیم تھے۔ صفیر کا یہ بیان بھی صحیح نہیں کہ ڈائرکٹر نے صاحب عالم کو 'زبان اردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیجنے کو کہا تھا'، کیمپسن کا اصل خط احسن مارہروی مرحوم کے اخلاف کے یہاں میں نے دیکھا ہے اس میں کہیں اس کا ذکر نہیں، اس خط سے بعض اور امور پر روشنی پڑتی ہے اور قیاس غالب ہے کہ مرزا غالب کو بھی اسی خط کی نقل بھیجی گئی ہوگی اس لئے یہاں پورا خط درج کیا جاتا ہے:

عنایت فرمائے دوستاں سید صاحب عالم معانی دار مارہرہ زاد عنایتکم

بعد اظہارِ شوق و مراسمِ عرفیہ کے واضح رائے محبت پیرائے ہو، چونکہ اکثر اوصافِ جمیلہ و محامدِ نبیلہ آپ کی در باب واقفیتِ تاریخ و زبان دانی و دیگر فضائل و کمال کے گوش زد ایں جانب کے ہوئے، اس لئے آپ کو براہِ دوستانہ اس امر کی تکلیف دی جاتی ہے کہ اگر آپ کو حال مفصل ایجاد زبانِ اردو معلوم ہو تو اس کی کیفیت مجھے تحریر کر کے مجھے ممنون کیجیے، اور اس تحقیقات سے وہ دریافت حال زبانِ مسطور مطلوب ہے کہ جس سے حال زمانہ، ابتدائے اجرائے اردو اور نیز تصریح اس امر کی کہ کس عہد سے زبان مذکور داخل نوشت و خواند اہلِ ہند ہوئی، معلوم ہو جائے، اور کن کن اُستادوں نے زبان مذکور میں ابتدائً شعر و سخن یا نثر کے مضامین لکھنے شروع کئے، اور کتنے محاوراتِ قدیمہ اب تبدیل ہو گئے، اور اس تبدیلی سے اُس زبان میں آیا شستگی و رفتگی آئی یا کسی طرح کا نقص پیدا ہوا، اور اگر کلام اُن اساتذۂ قدیم کے یاد ہوں یا کسی تذکرے میں آپ کی نظر سے گزرے ہوں تو بطور

مشتے نمونہ از خروارے، سلکِ تحریر فرما کر ممنون کریں اور جو کوئی کتاب حاوی ان امور کی مل سکے اس کو بطور عاریت یا بہ قیمت جیسا مناسب ہو؟ فرمائیں نہایت موجب احسان مندی ہوگا، اور چوں کہ جس کتاب کا ایں جانب کو قصدِ تالیف ہے اور جس کی امداد کے لئے آپ کو تکلیف دی گئی ہے اس میں حال شعرا وغیرہ کا بقید نام و مسکن و زمانہ لکھا جائے گا، آپ جو کیفیت ان اُستادوں کی تحریر فرمائیں تو اس میں امورِ صدر کا ضرور لحاظ رہے۔ فقط

المرقوم ۶ ر جون ۱۸۶۶ء کیمپ کوہ منصوری۔ رقیمۃ الشوق ایم کیمسن

نہ صاحبِ عالم کے جواب کا جسے بقول صفیر انھوں نے مرتب کیا تھا پتا ہے اور نہ مرزا غالب کے اُس خط کا جو اُنھوں نے کیمسن کے جواب میں لکھا تھا، کچھ علم ہو سکا ہے۔

(۱۷) ناسخ کے سلسلے میں وہ خط بھی قابلِ مطالعہ ہے جو انھوں نے عبدالغفور نساخ کو لکھا تھا: "ہم فقیر لوگ اعلان کلمۃ الحق میں بے باک و گستاخ ہیں، شیخ امام بخش ناسخ، طرزِ جدید کے موجد اور پرانے ناہموار راہوں کے ناسخ تھے، آپ ان سے بڑھ کر بہ صیغۂ مبالغہ بے مبالغہ نساخ ہیں، تم دانائے رموز اردو زبان ہو سرمایۂ نازشِ قلم روِ ہندوستاں ہو۔" [۱]

(۱۸) بحر کا شعر دیوان میں یوں ہے:

کسی کا ہم نے یہ عالم نہیں دیکھا نہانے میں نہاتا ہے وہ گُل، کوثر میں کپڑے حور دھوتی ہے

(دیوان بحر مطبوعہ مصطفائی، لکھنؤ ۱۲۸۵ھ ص ۲۵۲)۔ یہاں 'مہ' کی جگہ 'گل' اور دریا کی جگہ 'کوثر' ہے۔

(۱۹) یہ حیرت میں ڈال دینے والی بات ہے کہ فارسی شاعری کے مختلف طرز ادا کے متعلق، صفیر نے جو کچھ غالب کی زبان سے سُنایا ہے وہ پوری عبارت چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے ایک خط میں موجود ہے ابتدائی سطریں صفیر نے حذف کر دی ہیں یہ

---

[۱] عود ہندی: ۱۲۵۔ خطوط غالب: ۳۱۴ بھی دیکھا جائے۔

اس لیے ضروری تھیں کہ اس سے پورے خط کا پسِ منظر واضح ہو جاتا ہے: میرا قیاس اس کا مقتضی ہے کہ پیر و مرشد حضرت صاحب عالم مجھ سے آزردہ ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ میں نے ممتاز و اختر کی شاعری کو ناقص کہا تھا، اس دفعہ میں ایک میزان عرض کرتا ہوں، حضرت صاحب، ان صاحبوں کے کلام یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل، واقف سے لے کر بیدل، ناصر علی تک اس میزان میں تولیں، میزان یہ ہے کہ رودکی و فردوسی سے لے کر خاقانی و ثنائی ...... الخ" یہاں سے آخر تک کی عبارت دونوں میں مشترک ہے، مثال میں جو اشعار درج کیے ہیں وہ وہی ہیں جو خط میں ہیں، جو اشعار یاد نہیں ہیں، وہ یہاں بھی فراموش ہیں۔ راقم کی رائے میں اس کے علاوہ اور کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی کہ جلوۂ خضر کی اس عبارت کے لکھتے وقت غالب کا اصل خط مارہرہ والا موجود ہوگا ساری عبارت وہیں سے نقل کی، اس وقت انھیں اس کا خیال نہ ہوگا کہ یہ خط غالب کے مجموعۂ خطوط میں شائع ہو چکا ہے یا شائع ہو سکتا ہے، انھوں نے سوچا ہوگا مارہرہ آ کر اس خط کو کون دیکھے گا۔ یہ خط عود ہندی اور اردوئے معلیٰ دونوں میں موجود ہے۔ "ہے" کی یائے تحتانی لکھ چکا تھا کہ جلوۂ خضر کی ایک عبارت پر نظر پڑی:

"جن دنوں میں حضرت غالب کی ملازمت کو مارہرہ ہو کر دہلی گیا تھا وہ انشا مرتب ہو رہے تھے چناں چہ اس مسودہ کی نقل میں اپنے ساتھ بھی لایا تھا، اب تو وہ کتاب چھپ گئی مگر میرے نام کے خطوط چوں کہ بعد اس کے میرے پاس آرہ اور پٹنہ میں آئے تھے وہ اس ترتیب میں شامل ہونے سے رہ گئے"، مگر ایک تقریظ رسالہ "رشحات صفیر، المشہور بہ فیض صفیر" میں چھپی ہے، تشریح اس نثر اردو کی ان شاء اللہ تذکرۂ نثر اردو میں کی جائیگی،

[۱۰ر جون ۱۹۵۲ء]

حمید احمد خاں

غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک

چاندنی چوک سے مڑ کر بلّی ماروں کے اندر کچھ دُور تک چلے جائیے تو شمسی دواخانہ کی عمارت اور حکیم محمد شریف خاں کی مسجد کے درمیان ایک کشادہ گلی نظر آتی ہے۔ کچھ نئی کچھ پُرانی عمارتیں، کچھ سنورتے کچھ بگڑتے ہوئے مکان ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ گلی میں ذرا فاصلے پر داہنے ہاتھ کوڑے کا ڈھیر ایک خاک انداز کے پاس پڑا ہے، اور ہمیشہ پڑا رہتا ہے۔ گلی کے دونوں طرف کی عمارتیں زیادہ تر چھوٹی اینٹ کی پرانی عمارتیں ہیں لیکن جس خاص بات کو آپ ایک سرسری نظر میں محسوس کئے بغیر نہیں رہتے، وہ ان نیم منہدم عمارتوں میں اونچی اونچی محرابوں کی کثرت ہے۔ ان بلند محرابوں سے پتا چلتا ہے کہ اس گلی کے گزشتہ مکینوں کی زندگی عظمت و شان سے خالی نہ تھی۔ یہ گلی قاسم جان کی گلی کہلاتی ہے اور اٹھارہویں صدی کے دوسرے نصف سے لے کر آج کے دن تک اسی نام سے مشہور ہے۔ گلی کے اس نام کے پیچھے ایک کہانی ہے جو شاہ عالم بادشاہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانے کے قریب تین شریف زادے، جو آپس میں بھائی بھائی تھے، قسمت آزمائی کے لئے بُخارا سے روانہ ہوئے منزل بہ منزل اٹک اور پنجاب سے گزرتے ہوئے، مٹتی ہوئی مغلیہ سلطنت کی اُجڑی راجدھانی میں پہنچے۔ شہر میں پہنچ کر وہ بالآخر اسی گلی میں آباد ہوئے جس کے نکڑ پر ہم آپ کھڑے اس وقت باتیں کر رہے ہیں۔ شہرت اور دولت ان تین بھائیوں میں سے کم از کم دو کے حصے میں ضرور آئی۔ پہلے قاسم جان کے اقبال کا ستارہ چمکا۔ خود گلی کا نام اس کا شاہد ہے کہ جاہ و ثروت کے لحاظ سے قاسم جان اپنے بھائیوں کے سرتاج تھے لیکن انیسویں

صدی کے شروع میں تقدیر ایک بار پھر مسکرائی اور اس مرتبہ عارف جان کا بیٹا لوہارو اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست پر متمکن نظر آیا۔ قاسم جان اور عارف جان کی اولاد اب بھی اس گلی کی حویلیوں اور محل سراؤں میں موجود ہے۔ لیکن ہمارے یہاں کھڑے ہونے اور اس عام رہ گزر پر عقیدت کی آنکھوں کا فرش بچھانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پرانے شرفا کی اولاد یہاں آباد ہے یا بجائے خود اس گلی کی پرانی داستان سے ہمیں غیر معمولی دلچسپی ہے۔ ایک ادر کشش ایسی ہے جو لوگوں کو دور دور سے کھینچ کر یہاں لاتی رہے گی۔ اس کشش کو چار حرفوں کا ایک لفظ بیان کر دیتا ہے، اور وہ لفظ ہے: غالبؔ۔

گلی قاسم جان کے چپے چپے کے ساتھ غالبؔ کی زندگی کو کسی نہ کسی پہلو سے، کسی نہ کسی منزل میں، تعلق رہا ہے۔ غالبؔ کا اصل وطن آگرہ تھا۔ لیکن ابتدائے شباب ہی میں وہ آگرے کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے دلّی میں آ رہے تھے۔ اس تبدیلیٔ وطن کے بعد وہ پچاس پچپن برس تک دلّی میں رہے۔ اس تمام مدت کا بیشتر حصہ انھوں نے گلی قاسم جان ہی کے کسی نہ کسی مکان میں گزارا اور اگر کبھی تھوڑے عرصے کے لئے باہر نکلنا بھی پڑا تو اسی محور کے گرد چکر کھاتے رہے۔ لیکن غالبؔ کی ذات سے قطع نظر، اس تعلق کا سلسلہ خود غالبؔ کے خاندان تک پہنچتا ہے۔ اسی گلی میں، شاید غالبؔ کی پیدائش سے بھی پہلے، غالبؔ کے چچا کا عقد عارف جان کی بیٹی سے ہوا تھا۔ دس پندرہ برس بعد جب غالبؔ خود بالک دولھا بنے ہوئے عارف جان کی پوتی امراؤ بیگم کو بیاہنے آئے تو اپنی برات یہیں قاسم جان کی گلی میں لائے تھے۔ اور پھر تقریباً ساٹھ سال بعد جب بوڑھے شاعر کا جنازہ اٹھا تو اسی گلی کی ایک ڈیوڑھی سے دوست اور شاگرد اور عزیز میت کو کندھا دیتے ہوئے، جامع مسجد اور دلّی دروازے کی راہ سے، درگاہ حضرت نظام الدین کو روانہ ہوئے۔ اس دن اسی گلی کے ایک مکان میں ستر برس کی ایک بڑھیا ماتم میں جھکے ہوئے سر پر ایک سفید دوپٹہ اوڑھے اپنی اس بیوگی کے غم میں آنسو بہا رہی تھی جس کی میعاد کو سال بھر بعد مرحوم شوہر کی پہلی برسی کے دن موت کے ہاتھوں ختم ہونا تھا۔

سامنے کے سرے پر، جہاں گلی ختم ہونے سے پہلے بائیں ہاتھ کو گھومتی ہے،

ایک بڑی محراب نظر آرہی ہے۔ اگر اس محراب سے گزر کر اندر چلے جائیں تو چند پرانی عمارتیں ملتی ہیں جن میں سے ایک عارف جان کے بیٹے نواب احمد بخش خاں والیٔ لوہارو کی حویلی ہے۔ روایت کہتی ہے کہ یہی حویلی غالبؔ کے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروفؔ کا بھی مسکن تھی۔ اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غالبؔ اٹھارہ بیس برس کی عمر میں جب ہمیشہ کے لیے دلّی چلے آئے، تو پہلے پہل چند سال تک اسی مکان میں رہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ غالبؔ کی زندگی کے آخری چند سال ایک ایسے مکان میں بسر ہوئے، جو گلی کے اس دوسرے سرے پر ہے جدھر ہم مسجد اور دواخانے کے درمیان کھڑے ہیں۔ دلّی میں ان کے پہلے مکان اور آخری مکان کی یہ باہمی نسبت معنی خیز ہے۔ گلی کے پہلے سرے سے چل کر اس سرے تک آیئے تو گویا آپ نے غالبؔ کے شباب سے لے کر وفات تک کی تمام منزلیں طے کرلیں۔ دلّی میں ان کی زندگی لوہارو والوں کی عظیم الشان حویلی سے شروع ہوئی اور اس کھنڈر میں ختم ہوئی جس کی زیارت کے لیے، ہم آپ گلی کے اس سرے پر کھڑے ہیں۔

گلی میں چند قدم چلیے، تو مسجد کے پیچھے (اور اس سے ملی ہوئی) ایک دواخانے کی نئی عمارت کو چھوڑ کر ہمیں ایک بڑی ڈیوڑھی نظر آتی ہے۔ اندر جاکر دیکھیے تو مختصر سا صحن گرتی ہوئی عمارت [illegible] سے بھر بھر کر کچھ اور مختصر ہوگیا ہے۔ صحن کے مشرق کی طرف دو بوسیدہ سے کمرے جو [illegible]ت مسجد کا سہارا لیے ہوئے ہیں ابھی تک اپنی سخت جانی کے اظہار کے لیے کھڑے ہیں۔ یہ ڈیوڑھی، یہ صحن اور یہی دو کمرے غالبؔ کی آخری فرودگاہ کی یادگاریں ہیں۔ وہ بالاخانہ جو، خود ان کے بقول، "لگنے بیٹھنے اٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل" تھا اب باقی نہیں رہا۔ بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ اینٹوں کا یہ ڈھیر اب تک کھڑا کس طرح رہا۔ گلی کے دوسری طرف، غالبؔ کے دیوان خانے کے تقریباً سامنے ہندوستانی دواخانے سے متصل غالبؔ کا زنان خانہ تھا۔ یہاں اب ہندوستانی دواخانے کا کارخانہ، دواسازی ہے لیکن اس کا حلیہ اب اتنا بدل چکا ہے کہ اگر بیگم غالبؔ پھر کسی طرح یہاں پہنچ سکیں تو انھیں اپنے گھر کو پہچاننے میں خاصی دقت محسوس ہو۔

غالب دن کا بیشتر حصہ دیوان خانے میں گزارتے تھے جب تک بڑھاپے کے ضعف اور امراض نے غلبہ نہ پالیا، ان کا معمول یہ تھا کہ صبح ناشتے کے بعد اپنے بالاخانے کے دالان میں دوستوں کو خط لکھنے بیٹھ جاتے۔ خط لکھ کر اور پر لفافہ رکھ دیتے اور داروغہ کلو بند کر کے ٹکٹ لگا دیتے تھے۔ دوپہر کو قصّے کہانی کی کوئی کتاب لے لیتے یا چوسر اور شطرنج سے جی بہلاتے۔ کبھی عارف جان یا قاسم جان والوں میں سے کوئی لڑکا گلی میں سے آتا ہوا دکھائی دیتا تو اسے آواز دے کر اوپر بلا لیتے تھوڑی دیر اسی سے ہنسی مذاق کی باتیں کر کے کچھ اپنا مگر زیادہ اس کا دل خوش کرتے۔ گرمیوں میں دوپہر کو بالعموم سو جاتے تھے۔ سہ پہر کو اُٹھتے تو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ یہ ملاقاتیں زیادہ تر اس ڈیوڑھی میں ہوتیں جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔ اسی ڈیوڑھی میں مونڈھے پڑے رہتے تھے۔ غالب بالاخانے سے نیچے اُترتے۔ دوست اور شاگرد اپنے اپنے وقت اور سہولت کے لحاظ سے جمع ہوتے اور یہیں بیٹھتے۔ غالب ایک بڑے چوڑے مونڈھے پر جو لال کھاروے سے منڈھا ہوا تھا ٹانگیں سمیٹے ہوئے بیٹھا کرتے۔ چلمیں آگے پڑی رہتیں۔ ذرا دائیں ہاتھ کی طرف حقّہ ہوتا۔ غالب اس عمر میں اونچا سننے لگے تھے۔ جب کوئی شخص بات کرتا تو سننے کے لئے کان اس طرف کو جھکا دیا کرتے تھے۔ ملنے والے اگر کہیں قریب سے آتے تو پیدل چلے آتے تھے۔ فاصلے سے آنے والوں میں پابند وضع بزرگ پالکی میں تشریف لاتے۔ پالکی دروازے کے سامنے رُکی، وہ بزرگ نیچے اُترے۔ غالب نے ذرا دیکھا اور پھر اپنے خاص لہجے میں (لفظوں کو خوب پھیلاتے ہوئے) کہا "آیئے، آیئے! آپ کا مزاج اچھا ہے؟"

یہ دیوان خانے کی زندگی کی تصویر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حرم سرا میں زندگی کا کیا نقشہ تھا جہاں غالب کی نصف صدی سے زائد کی رفیقۂ حیات کے دن گزرتے تھے؟ غالب کا ہر روز کا معمول تھا کہ ایک موٹی سی لکڑی ٹیکتے ٹیکتے کم از کم ایک مرتبہ زنان خانے کو ضرور جاتے۔ یہاں وقت کس طرح گزرتا، کیا باتیں ہوتیں، کیا قصّے قضیے طے ہوتے، ان تفصیلات پر بظاہر ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصے پہلے اسی گلی قاسم جان کے اندر، لوہارو والوں کی اس حویلی میں جس کا ذکر ابھی آ چکا ہے، ایک سن رسیدہ

بی بی موجود تھیں جنھوں نے غالب کی زندگی کے آخری دَور کا یہ پہلو اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ یہ بی بی عارف جان کی پڑپوتی، غالب کے دوست نواب ضیاء الدین خاں نیّر رخشاں کی بیٹی اور مرزا زین العابدین خاں عارف کی بہو نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم تھیں۔ مجھے جولائی ۱۹۳۸ء میں اپنے کرم فرما اور محترم دوست حکیم محمد کامل خاں صاحب دہلوی کی معرفت بگا بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تھا۔ بگا بیگم صاحبہ اپنی حویلی کے ایک دالان میں پردے کے پیچھے تشریف لے آئیں۔ پردے کے دوسری طرف ایک تخت پر حکیم صاحب اور میں بیٹھ گئے۔ میں نے مرزا غالب اور ان کی بیگم صاحبہ کے متعلق کئی سوالات کیے، جن کا جواب بگا بیگم صاحبہ مجھے تفصیل سے دیتی رہیں۔ ان کی عمر اس وقت نوّے برس کے لگ بھگ تھی، مگر آواز میں بڑھاپے کی کمزوری کا کوئی خفیف سا اثر بھی میں نے محسوس نہیں کیا۔ برجستہ اور بے تکان بات کرتی تھیں۔ گفتگو کی ہر منزل پر مجھے ان کے ذہن کی بیداری اور احساسِ ظرافت کی موجودگی کے ثبوت ملے۔ میں ان کے ہر جواب کی یادداشتیں قلم بند کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بار بار میں نے محسوس کیا کہ میرا قلم ان کی شستہ تقریر کی روانی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

جو کچھ میں نے ان سے سُنا، اس کی کیفیت یہاں لکھنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ غالب کی خانگی زندگی سے متعلق بگا بیگم صاحبہ کو کیا خصوصیت حاصل تھی جس کی بنا پر ان کی دی ہوئی معلومات ہمارے لئے قابلِ قدر ہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غالب کی اولاد میں سے کسی بچے نے بھی برس سوا برس سے زیادہ کی عمر نہ پائی۔ انکی بیگم صاحبہ نے اولاد سے مایوس ہو کر آخر اپنے بھانجے (اور قاسم جان کے پڑپوتے) زین العابدین خاں عارف کو منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ مرزا غالب بھی عارف سے حقیقی اولاد کی سی محبت کرتے تھے جس کا اظہار مرزا صاحب کے اردو اور فارسی کلام دونوں میں موجود ہے۔ جب عارف کا انتقال[1] ہو گیا تو غالب ان کے دونوں بیٹوں، باقر علیخاں

---

[1] ۱۸۵۲ء میں

اور حسین علی خاں، کو اپنے پاس لے آئے اور انھیں اسی لاڈ پیار سے رکھا جس سے اپنی اولاد کو رکھتے[۱]۔ بڑے لڑکے باقر علی خاں کی شادی غالبؔ نے خود اپنی زندگی میں کی۔ اس طریقے سے جو بہو غالبؔ کے گھر میں آئی، وہ یہی بگا بیگم صاحبہ تھیں۔ ان تمام رشتوں کی کیفیت ذیل کے شجرے سے بخوبی ذہن نشین ہو جائے گی:

[۱] غالبؔ کے اردو خطوں میں اس کی طرف جا بجا اشارے ملتے ہیں۔ اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط (بنام میر مہدی مجروح) میں لکھتے ہیں: "لو بھئی اب تم چاہو بیٹھے رہو، چاہو اپنے گھر جاؤ۔ میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک میں اور ایک میرا پیارا بیٹا حسین علی خاں، یہ ہم روزہ خوار ہیں؛ وہی حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے: 'کھلونا منگا دو۔ میں بھی بجار جاؤں گا'۔"
بگا بیگم صاحبہ کے پھوپھی زاد بھائی خضر مرزا مرحوم مجھ سے بیان فرماتے تھے: میں نے اپنی آنکھوں

اس میں شک نہیں کہ بگا بیگم صاحبہ نے غالب کا صرف آخری زمانہ دیکھا لیکن چونکہ وہ رات دن گھر میں رہتی تھیں اس لئے ان کے بیان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کہیں کہیں جہاں انھوں نے قیافے سے بات کی ہے، ان کا بیان درست نہیں ہے (مثلاً غالب کی عمر کے متعلق) مگر جو باتیں ان کی دیکھی ہوئی تھیں، ان کی صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مثلاً جب میں نے پوچھا کہ مرزا صاحب کے چلنے کا انداز کیا تھا تو فوراً بولیں: "سہج سہج چلتے تھے، بڈھے تھے، اسّی برس کی عمر تھی" ظاہر ہے کہ اس قول کا صرف پہلا حصہ بالکل درست اور دوسرا تخمیناً درست ہے۔ لیکن ہم کتنے ہی صحت پسند ہوں ہمارا یہ تقاضا ضرورت سے زیادہ سخت ہوگا کہ بگا بیگم صاحبہ کے کسی تخمینے میں بھی کوئی فرق نہ نکلے۔

اتنا تو سب جانتے ہیں کہ جس قدر مرزا غالب طبیعت کے لحاظ سے آزاد تھے، اسی قدر ان کی بیگم صاحبہ اپنے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کی طرح پرہیزگار اور نماز روزے کی پابند تھیں۔ اس وجہ سے میاں بیوی کے درمیان اکثر نوک جھونک ہوتی تھی[1]۔ چنانچہ غالب

ـــــ دیکھا ہے کہ حسین علی خاں مرزا غالب سے شوخیاں کرتے اور کبھی انکی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے تھے۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی انکی بہت ناز برداری ہوئی۔ مرزا صاحب نے کہا "ارے حسین علی آکر پڑھ لے" انھوں نے جواب دیا "دادا جان، آتا ہوں" اور دوسری طرف نکل گئے۔ کھیل تماشے کا تو انھیں لپکا تھا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے پر ایک دفعہ بیس روپے خرچ کر دیئے اور پھر مرزا صاحب کے پاس منہ بسورتے ہوئے آئے کہ دادا جان بیس روپے دلوا دیجئے۔ مرزا صاحب نے کلّو کو بُلا کر کہا "بھئی، انھوں نے ایک پتھر ادھر مارا۔ دیدے بیس روپے"۔

خضر مرزا مرحوم نے اپنے بچپن کے دنوں کا ایک اور واقعہ مجھے اس طرح سنایا: "ایک دن میں چلا جاتا تھا۔ بھائی حسین علی خاں بھی گلی میں سے جا رہے تھے۔ مرزا صاحب نے ہمیں دیکھا اور آواز دی "ابے لمڈو! یہاں آؤ"۔ ہم پہنچے تو مرزا صاحب نے ہمارے لئے مٹھی بھر بادام طشتری میں ڈال دیئے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو مرزا صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "ابے یہ کیا! منہ سے کھا۔ میرے مرغی کے بچے یوں ہی چُگا کرتے ہیں!"

[1] اس ضمن میں "یادگار غالب" کی متعلقہ عبارت بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

بیوی کو "حضرت موسیٰ کی بہن" کہتے تھے اور اگر زیادہ بگڑتے تو یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ "میرا تو ناک میں دم کر دیا ہے!" مگر یہ جھگڑا محض رندی و زہد کے اختلاف تک محدود نہ تھا۔ جو کچھ میں نے سُنا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اختلاف مزاج کو بھی گھر کی چپقلش میں خاصا دخل تھا۔ چنانچہ خود بگا بیگم صاحب کی موجودگی میں میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی۔ امراؤ بیگم خفا ہوتی تھیں مگر خاموش ہو جاتیں۔ ان سے کہتی تھیں: "بیٹی تو تو بچہ ہے بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر، بڈھا تو دیوانہ ہو گیا ہے!"

اسی قسم کا ایک واقعہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سُنایا کہ (مرزا صاحب) پچھلے پہر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز عصر کے بعد وہ واپس آئے۔ میں اور میری ساس عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ دونوں بھی اسی تخت پر نکڑ پر ہو بیٹھے۔ جب ہم نے سلام پھیرا تو کہنے لگے: "واہ وا! خوب! بہو کو بھی اپنا سا کر لیا۔ کمہاری بو نٹ کا کیڑا اپنے گھر لے جاتی ہے تو چالیس دن میں لسے اپنا سا کر کے نکال دیتی ہے!"

ایک اور لطیفہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سُنایا کہ برسات کے دن تھے مینہ بہت برسنے لگا۔ پوتوں (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) نے کھانا کھایا اور چلے گئے۔ نیاز علی (ملازم) بھی چلا گیا۔ (مرزا صاحب) بیٹھے بیوی سے باتیں کرتے تھے۔ میں یوں بیٹھی تھی، گاؤ تکیئے کے کونے سے لگی ہوئی۔ کہنے لگے: "ایک بیوی، دو میں، تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا! بہو، میں اور میری بیوی بیٹھے ہیں، تم کیوں بیٹھی ہو" اس پر میری ساس بولیں: "اے توبہ! بڈھا تو دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھٹھے کے لیے کوئی چاہیے۔ اب بہو ہی مل گئی"۔ میں اتنے میں اُٹھ کر ایک کونے میں جا چھپی۔ اب انھیں یہ فکر کہ برسات کے دن ہیں اور کیڑے پتنگے کا موسم مجھے ڈھونڈتے پھریں اور کہتے جائیں: "مجھے کیا خبر تھی بہو اس بات کو اتنا بُرا مانے گی!"

میں نے نوکروں اور بچوں کے متعلق پوچھا کہ غالب ان سے کس طرح پیش آتے تھے۔ حسین علی خاں کے متعلق بتایا کہ "چھوٹے پوتے کو دھمکایا کرتے تھے"۔ نوکروں میں کلّو کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا: "کلّو داروغہ کو مرے ہوئے، پندرہ برس ہو گئے۔ لوگ ان کی زیارت کو بہت آتے تھے۔ یہ چودہ برس کی عمر میں مرزا صاحب کے پاس آ کر رہے۔ کلّو داروغہ کا یہ حال تھا کہ پاؤں کی آہٹ سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں ہیں، بہویں ہیں یا بوڑھیاں

ایک اور نوکر مدار خاں تھا۔ ان دونوں کا بیاہ اُنھوں نے خود کیا۔ یہ مجھ سے پہلے کا ذکر ہے میں نے سُنا ہے۔ مدار خاں کے لڑکے کا نام نیاز علی تھا۔ یہ مرزا صاحب نے لے لیا۔ مدار خاں کی بیٹی آبادی کو کلّو نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔"

"کھانا ایک وقت کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کباب تلے ہوئے، دال مربّہ، پسے ہوئے بادام اور حلوا سوہن[1]۔ جب کھانا خراب ہوتا تو پکانے والے کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ پکانے والا کون تھا؟ دوا تھیں۔ مرزا صاحب پان نہیں کھاتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی کھاتے نہیں دیکھا۔ چنے کی دال بیسن کڑھی پھلکیاں بہت کھاتے تھے۔ چنے کی دال ہر سالن میں ایک ایک چمچہ ضرور پڑتی تھی۔ میرے بیاہ کے بعد کی بات ہے کہ چنے کی دال سالن میں پڑی ہوئی میرے سامنے بھی آئی۔ مجھے پسند نہیں تھی۔ مغلانی نے میری ساس سے شکایت کی کہ بہو نہیں کھاتیں چنے کی دال۔ مرزا صاحب یہ بات سُن رہے تھے۔ کہنے لگے: "دوا، یہاں تو آ" دوا گئیں تو ان سے کہا: "پیسے نہیں تھے تیرے پاس؟ بہو کی پسند کی چیز پکالی ہوتی۔" دوا نے جواب دیا: "نہیں، بہو چنے نہیں کھاتی ہیں۔" بولے: "اوہو، خدا سے بھی بڑھ گئیں بہو؟ توبہ توبہ!" پھر میری ساس سے کہنے لگے: "بیوی سنو" وہ بولیں: "میں نہیں سُنتی!" اس پر مجھ سے کہا: "بیٹی، بُرا نہ مانیو۔ ایک بات سُناتا ہوں۔ خدا کے آگے چنا گیا اور فریاد کی کہ باری تعالیٰ یہ کیا بات ہے مجھ کو لوگ طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ بھونتے ہیں، تلتے ہیں، اُبالتے ہیں، پیستے ہیں۔ آخر میرا گناہ کیا ہے؟ خدا نے چنے کی طرف دیکھا اور کہا "دور ہو۔ نہیں میں بھی تجھے کھا جاؤں گا!"

یہ بات سُناتے ہوئے خود بھی ہنستی رہیں۔

میں نے پوچھا "مرزا صاحب کی یادگار کی کوئی چیز آپ کے پاس ہے؟" کہنے لگیں: مجھے کیا خبر تھی کہ لوگ ان کی چیزوں کو اس طرح ڈھونڈیں گے؟ میرے پاس تو کوئی چیز

---

[1] بگا بیگم صاحبہ نے قدرتہً غالب کی شام کی شراب کا ذکر نہیں کیا لیکن عجب نہیں یہ حلوا سوہن ہی شراب کا قائم مقام ہو۔

نہیں ہے۔ ہاں معظم میاں (نواب معظم علی خاں) کے پاس ان کا پیالہ اب تک ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ بھوپال لے گئے تھے" جب میں نے غالب کے مذہب کے متعلق سوال کیا تو بولیں: "ان کے مذہب کا کیا ٹھکانا؟ جہاں بیٹھے اسی مذہب میں ہو گئے" میں نے یہ بھی پوچھا کہ مرزا صاحب کس زمانے میں اونچا سننے لگے تھے؟ جواب دیا: "میں نے تو انھیں بہرا ہی دیکھا۔ جب میرا بیاہ ہوا تو بہرے ہی تھے" غالب کے بھائی مرزا یوسف کی وفات کے متعلق دریافت کیا تو کہا: "سرس کی گلی میں مارے گئے تھے[۵۱] مسجد تہور خاں میں دفن ہوئے" میں نے غالب کے متعلق بھی پوچھا کس جگہ انتقال کیا تو جواب دیا: "دیوان خانے میں، جہاں مجید خاں نے اصطبل بنوایا ہے۔ اس وقت حکیم محمود خاں، حکیم غلام مرتضیٰ اور حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ سب وہیں تھے"

اس سوال کے جواب میں کہ مرزا صاحب نے کس مرض میں انتقال کیا، بگا بیگم صاحبہ نے کہا: "وہ کچھ بیمار تو ہوئے نہیں بس مر ہی گئے۔ ہوا یہ کہ کھانا کھانے آئے۔ چندو[۵۲] بیگم کو بہت چاہتے تھے۔ پوچھا "جیون بیگ کہاں ہیں؟ بلاؤ" احمد بیگ انکے خادم تھے انھیں بھیجا، مرزا صاحب کہنے لگے "اچھا جب وہ آئیں گی تو کھانا کھاؤں گا" یہ کہہ کر لیٹ گئے، کروٹ لے کر لیٹے ہی تھے کہ بے ہوش ہو گئے۔ اسی حالت میں ان کا دم نکلا"

امراؤ بیگم کے متعلق بگا بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا: "جب میں بیاہی گئی تو وہ اچھوروں کی پھانک نہیں۔ جانماز پر بیٹھ کر کہا کرتیں: "اے اللہ! تو کب بلائے گا" ایک روز میں نے پوچھا: "پھپی جان، آپ کو قبر سے ڈر نہیں لگتا؟" کہنے لگیں: "بیٹی، تھکا بیل سرا کو دیکھتا ہے"

یہ ہیں ان معلومات کا بڑا حصہ جو مجھے بگا بیگم صاحبہ سے حاصل ہوئیں۔

[نظر ثانی: ۱۵ اپریل ۵۲ء]

---

[۵۱] فتح دہلی کے بعد ۱۸۵۷ء، [۵۲] بگا بیگم صاحبہ کی بڑی صاحبزادی کا عرف ہے جو اس وقت اپنی عمر کے دو تین سال میں تھیں۔ مرزا غالب انھیں محبت سے "جیون بیگ" کہتے تھے۔ انکی شادی نواب شجاع الدین خاں سے ہوئی۔

مالک رام

میرزا غالبؔ
(حالات عادات خصائل)

میرزا غالبؔ سے اُن کی زندگی میں مجھے بارہا ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے خاندان کے اُن سے بہت پرانے تعلقات تھے۔ بلکہ دور نزدیک سے کچھ عزیزداری بھی تھی۔ میرے والد مرحوم اُن کے ہم عمر اور ہمجولی تھے۔ اور دونوں بچپن میں شیخ معظم کے مکتب میں اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔ لیکن میری ملاقات اُن سے بہت بعد میں ہوئی۔ میرزا صاحب میری پیدائش سے بہت پہلے ہی ۱۸۱۲ء یا ۱۸۱۳ء میں آگرہ چھوڑ کر دہلی چلے آئے تھے۔ پھر اگرچہ اس کے بعد بھی وہ دو ایک مرتبہ آگرہ تشریف لے گئے لیکن صغرسنی کے سبب میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

ایک زمانہ کے بعد جب کاروبار کے سلسلہ میں پہلی بار میرا دہلی آنا ہوا تو چلتے وقت والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ دیکھو میرزا غالبؔ کی خدمت میں ضرور حاضر ہونا اور اُن سے میرا سلام شوق عرض کرنا۔ یہ غدر ۱۸۵۷ء سے پانچ چھ برس پہلے کا ذکر ہے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ میرزا صاحب ان دنوں لال کنواں میں حضرت مولانا نصیر الدینؒ عرف میاں کالے صاحب کی حویلی میں رہتے تھے۔ ۱۸۴۷ء میں ان پر جوآخانہ قائم کرنے کے جرم میں مقدمہ چلا تھا اور اُس کے نتیجہ میں وہ تین مہینے قید خانے میں رہے تھے۔ جب قید سے رہا ہوئے تو میاں کالے صاحب انھیں اپنے ہاں بلوا لے گئے۔ میرزا صاحب نے بہت کہا کہ حضرت! آپ میرے بزرگ اور مخدوم ہیں۔ میں آزاد منش آدمی ہوں۔ میرے یہاں رہنے سے آپ کو تکلیف اور پریشانی ہوگی لیکن کالے صاحب ایک نہ مانے اور مجبوراً میرزا صاحب کو اُن کے

دہلی کا قید خانہ جہاں غالب ۱۸۴۷ء میں تین ماہ قید رہے

نقشہ کابلی دروازہ دہلی قدیم و جیلخانہ و مہندیان
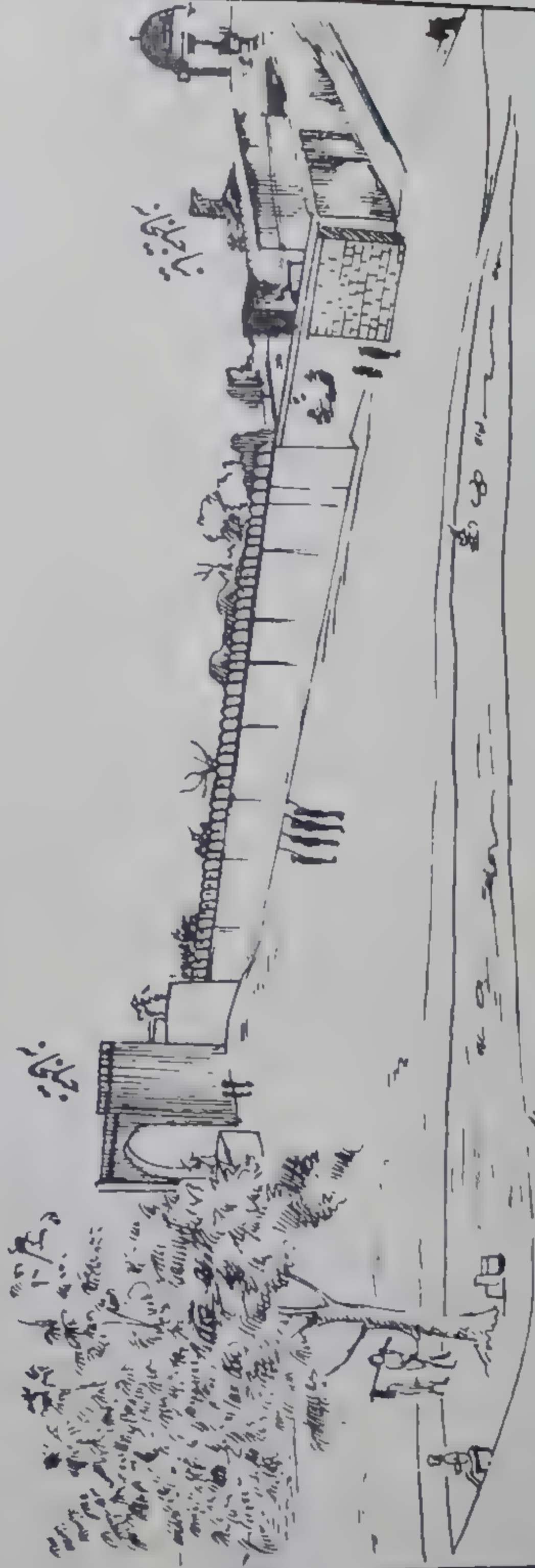
عمل مرزا شاہرخ بیگ

مکان پر قیام کرنا پڑا۔ یہیں وہ مشہور لطیفہ پیش آیا تھا کہ ایک دن ایک صاحب مزاج پُرسی کے لئے حاضر ہوئے اور مبارکباد دی کہ شکر ہے خدا کے فضل سے آپ قید سے آزاد ہوئے۔ تو میرزا بولے "کون بھڑوا آزاد ہوا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں"۔ میرزا غالب اس مکان میں ستمبر ۱۸۴۷ء سے لے کر مارچ ۱۸۵۲ء تک رہے تھے۔

یہاں دہلی میں کام سے مجھے اتنی فرصت نہ ملی کہ جلد ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ لیکن یہی فکر تھی کہ بن ملے واپس گیا تو قبلہ والد صاحب ناراض ہوں گے۔ اس لئے جوں توں کرکے واپسی سے ایک دن پہلے مغرب کے قریب اُن کے مکان پر گیا اور اطلاع کرائی۔ ملازم مجھے اندر لے گیا۔ باہر صحن میں مونڈھے بچھے تھے۔ ایک تخت بھی قریب میں پڑا تھا۔ میرزا صاحب ایک مونڈھے پر بیٹھے تھے۔ بعض اور اصحاب دوسرے مونڈھے پر تشریف رکھتے تھے۔ میں ان میں سے کسی کو پہچانتا نہیں تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان میں صاحب خانہ حضرت میاں کالے صاحب تھے۔ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں تھے۔ نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ تھے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں تھے۔ اور بھی دو تین صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے پہنچ کر آداب عرض کیا اور چپکے سے ایک طرف تخت کے سرے پر بیٹھ گیا۔

میرزا صاحب نے بے تکلفی کے لہجے میں فرمایا: آیئے، آیئے، تشریف رکھیئے۔ فرمایئے،

میں نے اپنا نام بتایا اور عرض کیا کہ میں اکبرآباد کا رہنے والا ہوں اور صرف سلام کو حاضر ہوا ہوں۔ اس پر وہ مسکرا کر کچھ کہنے کو تھے کہ نہ معلوم حاضرین میں سے کس نے کوئی سوال کر دیا اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔

میرزا صاحب کا سن پچاس سے اوپر تھا۔ چوڑا چکلا ہاڑ۔ ڈاڑھی صفاچٹ۔ نازک باریک مونچھیں جنھیں تاؤ دے رکھا تھا۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں۔ سُرخ و سپید رنگ، جس میں چمپئی دمک تھی۔ سر پر لمبے لمبے پٹھے۔ قلموں پر ڈھلکتے ہوئے بال۔ سر پر ایک پلے کی ہلکی سی ٹوپی جس پر کشیدہ کا کام تھا۔ بدن پر تنزیب کا انگرکھا۔

اور نیچے ایک برکا سپید پاجامہ۔ پاؤں میں گھیتلی جوتی۔ ہاتھ میں پیچوان کی سٹک تھی اور کش لگا رہے تھے۔ نواب شیفتہ چالیس سے اوپر تھے۔ اُن کے چہرے سے متانت اور سنجیدگی ٹپکتی تھی۔ بات بہت ٹھیر ٹھیر کر کرتے تھے۔ نواب ضیاء الدین خان ان دنوں جوان تھے۔ تیس[۳] کے لگ بھگ ہوں گے۔ بارعب کتابی چہرہ۔ بھری بھری ڈاڑھی۔ شربتی آنکھیں۔ حکیم احسن اللہ خان اور مولانا نصیر الدین دونوں بزرگ بڑی نورانی شکلوں کے مالک تھے۔ حالانکہ حاضرین میں سب وجیہہ اور باوقار لوگ موجود تھے۔ پھر بھی اس سارے مجمع میں میرزا صاحب کی شخصیت خاص طور پر نمایاں تھی۔

دیر تک اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ کچھ شعر و شاعری، کچھ تصوف، کچھ قلعے کے لطیفے۔ حکیم مومن خاں کا انتقال ہوئے ابھی تھوڑے دن ہوئے تھے، معلوم نہیں، کیسے ان کا ذکر چل پڑا۔ اس پر میرزا صاحب فرمانے لگے: "صاحب، بڑی آن بان کا آدمی تھا۔ ایسا رنگین مزاج اور زندہ دل اور خود دار شخص بھی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا، بلکہ غزل میں ایک نئی روش کا مخترع تھا جب تک اس کا شعر ایک خاص لب و لہجہ سے نہ پڑھا جائے، اس کا پورا لطف نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ مجھے تو اس کا یہ شعر نہیں بھولتا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

نفسِ مضمون، لطفِ زبان، اسلوبِ بیان، غرض اس کی کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ جب تک کسی شخص نے واقعی عشق بازی کی نہ ہو اور کسی کے فراق کا مزہ چکھا نہ ہو، اسے یہ مضمون سوجھ ہی نہیں سکتا۔ زبان کا کیا کہنا اور "گویا" میں جو پہلو ہے، وہ تو کہنے کی بات ہی نہیں۔ سب پر طرّہ یہ کہ سہلِ ممتنع۔ یہ "ورائے شاعری" کچھ اور چیز ہے اور محض خدا کی دین۔ ریختہ میں اس پایہ کے شعر بہت کم ہیں۔ میں نے تو مرحوم سے ایک بار کہا تھا کہ بھائی، میرا سارا دیوان لے لے اور یہ شعر مجھے دے دے۔"

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد پھر کہنے لگے: "صاحب، مومن کے مرجانے سے

زندگی کا لطف آدھا رہ گیا۔ قافلہ خالی ہوتا جاتا ہے۔ مرحوم میرا یار اور ہم عمر تھا۔ میں جب آگرے سے یہاں آیا ہوں تو یہی پندرہ سولہ برس کی میری عمر تھی۔ شاید وہ دو ایک سال مجھ سے چھوٹا ہو۔ لیکن ذہن کا شروع سے بہت تیز تھا۔ اس نے ابتدا میں چند غزلیں نصیر کو دکھائی تھیں۔ لیکن دونوں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نصیر کی قادر الکلامی میں شک نہیں مگر ان کے استعارے اور تشبیہیں ایسی ہی ہیں جیسے پیاز کہ چھلکے ہی چھلکے ہیں، گودے کا نام نہیں۔ اس کے برخلاف مومن نے طبیعت معنی آفریں پائی تھی۔ بھلا کیسے نبھتی۔ بس جلد ہی یہ گھبرا کر ان کے جال سے نکل بھاگے اور پھر کسی کو اپنا کلام نہیں دکھایا اور میرا خیال ہے کہ یہ اچھا ہی ہوا۔ ہم دونوں کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ اس چالیس بیالیس برس کے عرصے میں کبھی کوئی رنج و ملال ہمارے درمیان نہیں آیا۔ حضرت، اتنی لمبی مدت کا تو دشمن نہیں میسر آسکتا، دوست کہاں سے ہاتھ آتا ہے۔ میں نے اس کے مرنے پر ایک رباعی کہی تھی ؎

شرطست کہ ر دے، دل خراشم، ہمہ عمر   خونابہ برُخ، ز دیدہ پاشم، ہمہ عمر
کافر باشم، اگر بہ مرگِ مومن   چوں کعبہ، سیہ پوش نہ باشم، ہمہ عمر

غرض کہ دو گھڑی بڑے لطف کی صحبت رہی۔ اس کے بعد احباب رخصت ہونے لگے۔ میں اس انتظار میں رہا کہ ذرا فراغت اور یکسوئی ہولے تو اپنا تعارف کراؤں۔ چنانچہ جب سب صاحب رخصت ہو لیے تو میں نے جرأت کر کے گذارش کی کہ میں خاص طور پر حاضر خدمت ہوا ہوں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں کون ہوں تو بڑے تپاک سے ملے۔ دیر تک حضرت والد صاحب قبلہ اور آگرے کے دوسرے احباب کا حال پوچھتے رہے۔ پھر پوچھا کہ کہاں اُترے ہو اور کب تک قیام رہے۔ میں نے عرض کیا کہ ایک عزیز کے یہاں پہاڑ گنج میں ٹھہرا ہوا ہوں اور انشاءاللہ کل واپس جا رہا ہوں۔ فرمایا کیا معنی کہ وہ عزیز ہیں اور میں دشمن تھا۔ میاں تمھیں اپنے اور ہمارے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم۔ تمھارے والد تو میرے لنگوٹیے ہیں۔ ہم مکتب میں کریما اور مقیماں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ دن بھر ایک ساتھ

کھیلتے تھے۔ ایک کو دوسرے کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ تمھارے والد پڑھنے لکھنے اور آموختے میں بہت ہوشیار تھے۔ آہ! کیا زمانہ تھا وہ بھی۔ میں نے باقاعدہ طور پر مکتب جانا اور پڑھنا لکھنا، دس بارہ برس کی عمر سے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس پر بڑے خان صاحب (یعنی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان، میرزا صاحب کے نانا جان) بہت خفا ہوئے۔ والدہ بھی بہت ناراض ہوئیں۔ ماموں نے بھی سمجھایا۔ لیکن بیکار۔ معلوم نہیں میرے سر پر آوارگی کا بھوت کچھ ایسی بُری طرح سوار تھا کہ کچھ اثر نہ ہوا اور میں دوبارہ مکتب کی طرف مُنہ نہیں کیا (پھر مسکرا کے کہنے لگے) اب سوچتا ہوں کہ شاید کچھ ایسا بڑا نقصان بھی نہیں ہوا۔ بھلا وہ تعلیم جاری رہتی تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا نا، کہ لوگ مجھے عالم اور مولوی کہنے لگتے۔ لیکن جتنا علم مجھے اب ہے اس سے کیا حاصل ہوا کہ مزید کی آرزو ہو۔ چالیس برس کی بک بک ہے:

کھُلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

اسی طرح تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے کچھ مجھ سے کچھ اپنے آپ سے۔ جب میں نے اجازت چاہی تو فرمایا۔ بھائی کو سلام شوق کے بعد کہنا کہ دل ان کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے اور یہ شعر سُنانا:-

مالذتِ دیدار، ز پیغام گرفتیم
مشتاقِ تو، دیدن ز شنیدن نشناسد

اور دیکھو، اب کے جو دلّی آنا ہو تو میرے ہی پاس ٹھیرنا۔ اس میں تکلف کی کوئی بات نہیں۔ اسے بھی اپنا ہی گھر سمجھو۔

——————:(۲):——————

دوسری بار میں نو دس مہینے بعد ۱۸۵۳ء کی گرمیوں میں دہلی آیا اور جرأت کر کے میرزا صاحب کے مکان پر چلا گیا۔ میں نے اپنے آنے کی اطلاع انھیں پہلے سے دے رکھی تھی۔ وہ ان دنوں بلی ماروں میں حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں کرایہ پر رہتے تھے۔ یہ مکان بہت ہوادار اور مشرق سے کھُلا تھا۔ اس لئے دریا کی طرف سے خوب

ہوا آتی تھی۔ محل سرا اور دیوان خانہ بھی الگ الگ تھے۔ لیکن اس میں ایک نقص تھا کہ کمرے بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔

میں پہنچا تو میرزا صاحب بڑی گرم جوشی سے ملے اور فرمایا کہ میں بہت خوش ہوا کہ تم نے اسے اپنا گھر سمجھا۔ تمھارے والد میرے بھائی ہیں اور تم میرے بھتیجے اور بیٹے ہو۔ پھر فرمایا دیکھو کوئی شرم اور تکلف کی بات نہیں۔ کسی شے کی ضرورت ہو تو بے جھجک مانگ لینا۔ اگر کھانے میں کوئی خاص چیز پکوانے کی خواہش ہو تو دوا سے کہہ دو۔ پک جائے گی۔ اب آؤ تمھیں تمھاری چچی کے پاس لے چلوں۔

اس کے بعد وہ مجھے اندر بیگم صاحبہ کے پاس لے گئے۔ وہ اس وقت زین العابدین خاں عارف مرحوم کے دونوں صاحبزادوں، باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ باقر علی خاں اس وقت پانچ چھ برس کا تھا اور حسین علی خاں ڈھائی تین کا۔ باقر علی خاں، مستقل طور پر رہتا تو اپنی دادی اماں کے پاس تھا لیکن اُس وقت یونہی کھیلتے کھیلتے ادھر آنکلا تھا، حسین علی خاں البتہ میرزا صاحب ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ میرزا صاحب نے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ میرے عزیز ہیں اور رشتے میں بھتیجے ہوتے ہیں۔ کسی کام سے یہاں آئے ہیں۔ تمھارے پاس ٹھیریں گے ذرا خیال رکھنا۔ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ میں آداب بجالایا۔ بیگم صاحبہ نے دعا دی اور فرمایا: "بیٹا تکلف کا خانہ خراب۔ اگر تمھیں کوئی چیز چاہیے تو کسی نوکر سے کہہ دو یا مجھے اندر کہلوا بھیجو۔ مہیا ہو جائے گی۔ اور اگر شرما شرمی میں رہے تو تم جانو۔"

میں شام کے قریب پہنچا تھا اور سفر کی تکان کے سبب میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اشتہا بھی نہیں تھی۔ میرزا صاحب نے کالے خاں (عرف کلو) داروغے سے کہا کہ دیکھو آپ کا پلنگ باہر کے دالان میں لگادو اور پانی کا لوٹا پاس رکھ دو تاکہ صبح مانگنے کی ضرورت نہ رہے۔ میں تھکا ماندہ تو تھا ہی بستر پر پڑتے ہی سو گیا۔

اگلی صبح کو اُٹھا تو دیکھا کہ میرزا صاحب مجھ سے پہلے جاگ چکے ہیں اور ابھی ابھی

دیوان خانے میں آکر بیٹھے ہیں۔ میں بھی ہاتھ منہ دھو آداب عرض کرکے اُن کے پاس جا بیٹھا۔ دیوان خانے میں سپید چاندنی کا فرش ہو رہا تھا۔ صدر میں قالین اور دو تین گاؤ تکیے لگے رکھے تھے۔ ایک طرف قرینے سے لگن میں پیچوان رکھا تھا۔ قالین کے کنارے، چاندی کا پاندان پڑا تھا۔ کمرے میں تین چار پیتل کے اگالدان تھے اور ایک کونے میں بڑی سی چلمچی دھری تھی۔ تھوڑی دیر میں وفادار ملازمہ اندر سے سرپوش ڈھکا ہوا ایک لوٹا اور دو خالی گلاس لائی اور انھیں قالین کے پاس رکھ کے چلی گئی۔ میرزا صاحب نے مجھ سے پوچھا کیوں بھائی حصہ کرو گے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ کیا ہے۔ کہنے لگے۔ بادام اور مصری۔ کوئی حرام چیز نہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک زمانہ سے مجھے گرمی کی شکایت ہے۔ حکیم صاحب نے کہہ رکھا ہے کہ رات کو پندرہ ایک بادام پانی میں بھگو دو۔ صبح چھلکا اُتار کر انھیں خوب گھونٹ لو اور اس شیرہ میں گلاس بھر مصری کا شربت ملا کر پی جاؤ۔ چنانچہ گرمی ہو کر جاڑا، روزانہ صبح نہار منہ، یہ ٹھنڈائی پیتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے دن بھر طبیعت میں تازگی اور فرحت محسوس کرتا ہوں۔ اس تبرید کے لئے مصری خاص طور پر بیکانیر سے منگواتا ہوں کہ وہاں کی مصری صاف اور بہت خشک اور مٹھاس میں خوب ہوتی ہے۔ یہاں جو مصری بازار میں ملتی ہے اس میں نمی ہوتی ہے۔

ہم ابھی بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے کہ ڈاکیہ آیا۔ اور تین چار خط دے گیا۔ میرزا صاحب حقہ پینے اور خط پڑھنے لگے۔ ان میں ایک خط غالباً منشی ہرگوپال تفتہ کا تھا جنھیں غالب، مرزا تفتہ کہتے تھے۔ دوسرا بریلی والے قاضی عبدالجمیل جنون کا تھا۔ دو اور خط اب یاد نہیں رہا کہ کن کے بتائے تھے۔ جب خط پڑھ چکے تو کہنے لگے کہ "لو صاحب، میں تو اب قلعے جاتا ہوں دس بجے تک واپسی ہوگی۔ تم چاہو یہاں بیٹھو، چاہو گھومنے چلے جاؤ۔ قلعے سے واپسی پر کھانا کھائیں گے۔ اگر جاؤ تو اس وقت تک گھر پر پہنچ جانا۔"

میں سیر کے لئے باہر جانے ہی والا تھا کہ میرزا صاحب کے دو تین ملاقاتی

آگئے۔ ایک تو میر افضل علی عرف میرن صاحب کے خسر بزرگوار جناب مولوی مظہر علی صاحب تھے۔ دوسرے پنڈت شیوجی رام مونس میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کا نوجوان بیٹا بال مکند بھی تھا۔ مولوی مظہر علی تو اسی محلے میں میرزا قربان بیگ کے مکان میں رہتے تھے۔ میرزا صاحب کے مسکن اور اُن کے گھر کے درمیان ایک میر خیرات علی کی حویلی تھی۔ پنڈت شیوجی رام کا مکان کچھ فاصلے پر کوچہ پنڈت میں تھا۔ تھوڑی دیر بعد میر احمد حسین میکش آگئے۔ یہ بھی میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ ان اصحاب کو آتا دیکھ کر کلّو حقّہ تازہ کر کے لے آیا۔ سب نے کلّو سے کہا کہ بیگم صاحبہ کی خدمت میں ہمارا آداب کہلوا دو۔ کلّو نے آواز دے کر وفادار لونڈی کو بلوایا، معلوم ہوا کہ وہ باہر سودا سلف لینے گئی ہے۔ نیاز علی چھوکرے نے جھانک کے پوچھا: کیوں دارو غہ جی کیا چاہیئے۔ کلّو نے جواب دیا۔ ابے، بیگم صاحبہ سے یہ کہو کہ مولوی مظہر علی صاحب اور میر احمد حسین اور پنڈت شیوجی رام آداب کہتے ہیں اور پنڈت جی کا صاحبزادہ بال مکند بندگی عرض کرتا ہے۔ جب اندر اطلاع ہوئی تو وفا انگوریلوں کی تھالی لیے، آئی، اور کہا کہ بیگم صاحبہ سب کو آداب اور بال مکند کو دعا کہتی ہیں اور یہ کہا ہے کہ میرزا صاحب اب آئے جاتے ہیں، آپ بیٹھئے، اور حقّہ پیجئے، اور پان کھائیے۔ ہم سب بیٹھے گپ کر رہے تھے کہ دس بجے کے لگ بھگ میرزا صاحب قلعے سے لوٹے۔ سب نے کھڑے ہو کر آداب عرض کیا۔ وہ صدر میں مولوی مظہر علی صاحب کے پاس بیٹھ گئے اور لگے ایک ایک سے گھر بار کا حال پوچھنے۔ مولوی صاحب سے پوچھا کہ میرن صاحب کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔ پنڈت شیوجی رام سے دریافت کیا کہ کہو تمھارے محلے میں اب موسمی بخار کا کیا حال ہے۔ بال مکند سے اس کی تعلیم سے متعلق سوال کیا۔ میکش سے اس کے گھر والوں کا پوچھا کہ شہر میں ہیں یا اپنے میکے بھرام پور گئے ہوئے ہیں۔

باتیں ہو رہی تھیں کہ اندر سے نیاز علی نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے، حکم ہو تو نکلوایا جائے۔ اس پر دوستوں نے اجازت چاہی اور میرزا صاحب اور میں دونوں، بچّوں کے ساتھ اندر گئے۔

اندر ایک دالان میں فرش پر دسترخوان بچھا تھا۔ کھانے میں بھنا ہوا گوشت تھا۔ قیمہ بھرے کریلے تھے۔ بریانی پلاؤ تھا اور ایک ترکاری تھی۔ رَوے کا حلوہ تھا۔ دو تین قسم کا مربے اور تیل کا اچار تھا۔ لیکن ایک بات عجیب دیکھی کہ قیمے اور گوشت اور ترکاری سب میں چنے کی دال پڑی ہے۔ دُلمے میں کم اور گوشت اور ترکاری میں زیادہ میرزا صاحب نے ترکاری کو تو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ دو ایک نوالے کریلے کے ساتھ کھائے تھوڑے سے چاول بھی چکھے۔ البتہ گوشت بہت رغبت سے کھایا اور کافی مقدار میں کھایا۔

جب کھانا کھا چکے تو اُٹھے۔ ددا پانی کا لوٹا اور بیسن کی کٹوری لے آئی، آپ نے بیسن سے ہاتھ دھو لیے کہ ہاتھوں کی چکنا ہٹ چھوٹ جائے۔ باہر دیوان خانے میں آئے، اور پلنگ پر دراز ہو گئے۔ فرمایا نیند نہیں آتی لیکن لیٹنے کی عادت ہے۔ جب تک دو ایک گھنٹے آرام نہ کروں نہ کھانا ہی ہضم ہوتا ہے نہ کوئی کام ہی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے حقّے کے کش لگاتے رہے۔ میں فرش پر بیٹھا تھا۔ پوچھنے لگے کہو کہیں سیر کو گئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ نکلنے ہی والا تھا کہ یہ دوست آگئے، اور ان کی خاطر سے رُک گیا۔ فرمایا واہ اس کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بیٹھتے تم اپنے کام پر چلے جاتے۔ میں ایک زمانہ سے بالعموم ہر روز صبح کے وقت قلعے کو جاتا ہوں بالخصوص جب سے حضرت ظلِ سبحانی نے خاندان تمر کی تاریخ لکھنے پر مقرر کیا ہے، یہ بلا ناغہ کا دستور ہے۔ میری غیر حاضری میں بھی ہمیشہ دو ایک دوست یہاں موجود ہوتے ہیں، حقہ پیا، پان کھایا۔ کبھی کوئی خاص ملنے والے ہوں تو تمھاری چچی چاہیں تو انھیں کچھ کھانے کو بھی بھیج دیتی ہیں۔ جب لوٹ کے آتا ہوں تو ان سے مجلس رہتی ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے، جب حضرت جنت مکانی بہادر شاہ ظفر بہت بیمار ہو گئے تھے اور ان کی جان تک کے لالے پڑ گئے تھے۔ اگرچہ اب بیماری کی وہ خطرناک صورت تو نہیں رہی تھی اور پہلے سے کچھ افاقت تھی، لیکن ابھی ان کی حالت تشویش سے خالی

نہیں تھی۔اس لئے میں نے پوچھا کہ حضرت بادشاہ سلامت کی صحت اب کیسی ہے۔ کہنے لگے: طبیب علاج معالجہ کر رہے ہیں اور حالت آگے سے بہتر بتائی جاتی ہے، لیکن خطرہ پوری طرح رفع نہیں ہوا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ان کا دَم غنیمت ہے۔ آج بھی جب میں گیا ہوں تو خواب گاہ ہی میں حاضری ہوئی۔ ولی عہد بہادر، میرزا فخرو بھی وہیں بیٹھے تھے۔ میرزا سلیمان شکوہ کے پوتے میرزا نور الدین، لکھنؤ سے آئے ہوئے ہیں، وہ بھی تھے۔ یہ رشتے میں اعلیٰ حضرت کے بھتیجے ہوتے ہیں اور اپنے والد میرزا کام بخش اور دادا کی طرح شیعیان اہل بیت میں سے ہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ دو ایک اور مصاحب بھی دست بستہ کھڑے تھے۔ میں نے اطلاع کرائی، تو اندر جانے کی اجازت ملی۔ میں نے مجرا عرض کیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ کمزوری کا کچھ نہ پوچھو۔ پہچانے نہیں جاتے۔ پہلے ہی کون سے سام و نریمان تھے۔ پھر عمر کا تقاضا۔ یوں سمجھو کہ اس اگلے شعبان میں اسّی برس کے ہو جائیں گے۔ رہی سہی کسر اس بیماری نے پوری کر دی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں۔ بہت رُک رُک کر دو ایک باتیں کیں۔ ارشاد فرمایا۔ آج ایک عجیب بات ہوئی۔ فجر کی نماز کے بعد یونہی ذرا میری آنکھ جھپک گئی تو میں نے خواب دیکھا کہ میں حضرت عبّاس علمبردار کی درگاہ پر عَلَم چڑھا رہا ہوں۔ اس پر میرزا نور الدین نے عرض کیا کہ جہاں پناہ، یہ رویائے صادقہ اور اشارۂ غیبی ہے۔ اس خواب کو ظاہر میں پورا کرنا چاہیے۔ فرمایا، بہت اچھا۔ خدا نے ہمیں صحت دی، تو ہم حضرت کی درگاہ پر سونے کا عَلَم چڑھائیں گے۔ سب حاضرین نے خوشی کا اظہار کیا اور دُعا کی کہ شافیِ مطلق جلد صحت بحال کرے اور حضور والا اپنی منّت پوری کریں۔

تھوڑی دیر میں ہم سب نے اجازت چاہی۔ راستے بھر مجھے اس خواب کا دھیان رہا۔ پالکی ہی میں چار رُباعیاں ہو گئیں۔ اب کل جاؤں گا تو خدمت میں عرض کروں گا۔ لو تم بھی سنو:

۱

بر دل از دیدہ فتح بالست ایں خواب
باراں اُمید را سحابست ایں خواب

زنہار گماں مبر، کہ خوابست ایں خواب
تعبیرِ ولائے بوترابست ایں خواب

۲

بینائیٔ چشم، مہر و ماہست ایں خواب
پیرایۂ پیکرِ نگاہست ایں خواب

بر صحتِ ذاتِ شہ گواہست ایں خواب
بیداریٔ بختِ پادشاہست ایں خواب

۳

ایں خواب کہ رُوشناسِ روزش گویند
چوں صبحِ مراد، دل فروزش گویند

زاں رُو کہ بروز دیدہ خسرو، چہ عجب
گر خسرو ملک نیم روزش گویند

۴

خوابے کہ فروغِ دیں، ازو جلوہ گرست
در روز نصیبِ شاہِ روشن گہرست

پیداست کہ دیدنِ چنیں خواب بروز
تعجیلِ نتیجۂ دُعائے سحرست

پھر فرمایا: ایک بات میری یاد رکھو۔ خدا اُن پر فضل کرے گا اور اب یہ اچھے ہو جائیں گے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ جو شخص بھی اہلِ بیت سے محبّت کریگا، خدا اس سے محبّت کرے گا۔

وہ دو ڈھائی بجے اُٹھے۔ ہاتھ مُنہ دھویا اور قالین پہ آن بیٹھے۔ پہلے تھوڑی دیر حقّہ پیتے رہے۔ پھر دوستوں کے خطوں کے جواب لکھے لیکن گرمی اس بلا کی تھی کہ اس دَوران میں آپ نے تین چار بار پانی پیا ہوگا۔ ٹھنڈے پانی کی جھجر جس پر صافی لپٹی ہوئی تھی پاس رکھی تھی۔ اسے اُٹھاتے اور تھوڑا سا آبخورے میں اُنڈیل کر پی لیتے۔ پانچ بجے کے قریب داروغہ جی کو بلایا اور حکم دیا کہ دیکھو میاں کلّو، اب گرمی بہت ہوگئی ہے۔ دوپہر کو یہاں بیٹھنا مشکل ہے۔ کل سے ہماری اندر کی کوٹھری تیار کروا دو اور خس کی ٹٹّی کا بھی انتظام کردو۔ ذرا خیال رکھنا۔ خس تازہ اور چھوٹی چھوٹی ہو۔ جس میں پانی دیر تک ٹھیر سکے اور خوشبو

بھی ہو۔ اور اب برف کا ذخیرہ رکھنا چاہیے۔ میرزا صاحب اپنے حکم احکام ختم بھی نہیں کر پائے تھے کہ کلیان کہار نے آکر اطلاع دی کہ ابھی ابھی باہر صدر الصدور جی پالکی سے اُترے ہیں۔ یہ سُنتے ہی میرزا صاحب جھٹ سے کھڑے ہو گئے اور صدر دروازے تک جاکر مفتی صدرالدین خاں آزردہ کی پذیرائی کی۔ باہر صحن میں مونڈھے بچھ چکے تھے۔ پہلے مفتی صاحب کو ایک مونڈھے پر بٹھایا۔ پھر خود بیٹھے۔ میں بھی ایک تخت پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں یکے بعد دیگرے شیفتہ، صہبائی، نیر رخشاں، داغ اور ظہیر بھی آگئے۔ داغ اور ظہیر چونکہ عمر میں سب سے چھوٹے تھے، اس لئے مؤدبانہ میرے پاس تخت پر آبیٹھے۔ سب قادر الکلام ہی تو تھے، اچھی خاصی مجلسِ مشاعرہ گرم ہو گئی۔ حضرت مفتی صاحب نے میرزا صاحب سے فرمائش کی کہ کوئی تازہ کلام ہوا ہو تو سنائیے۔ میرزا صاحب نے پہلے تو عذر کیا۔ لیکن جب مفتی صاحب کے ساتھ صہبائی بھی اصرار کرنے لگے تو فرمایا کہ شعر کام دل و دماغ کا ہے۔ دُنیاداری کے جھمیلوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ قلعے کی حاضری اور دوست احباب کی خدمت سے فرصت ملے تو انسان کچھ فکر بھی کرے اس پر آج کل آسمان سے آگ برس رہی ہے۔ گرمی کے مارے دماغ ٹھکانے نہیں۔ ایک غزل تھوڑے دن ہوئے، کہی تھی اس کے چند شعر عرض کرتا ہوں:-

چاک از جیبم بہ داماں می رود | تا چہ بر چاک از گریباں می رود
جوہرِ طبعم درخشان ست، لیک | روزم اندر ابر، پنہاں می رود
گر بود مشکل، مرنج اے دل، کہ کار | چوں رود از دست، آساں می رود
جز سخن، کفرے و ایمانے کجاست | خود سخن در کفر و ایماں می رود
آید و از ذوق نشناسم کہ کیست | تا رود، پنداشتی، جاں می رود
می برد، اما نہ یک جا می رود | می رود، اما پریشاں می رود
اوّلِ ماہ است و از شرمِ تو ماہ | آخرِ شب، از شبستاں می رود

کیست تا گوید، بداں ایواں نشیں

آنچہ بر غالبؔ، ز دریاں می رود

باتوں میں اور شعر خوانی میں کسی کو وقت کا خیال نہ آیا۔ آخر مفتی آزردہ مرحوم چونکے اور کہا کہ معاف فرمائیے گا آپ کی پُر لطف باتوں اور کلام میں وقت کا اندازہ نہ رہا۔ اب اجازت دیجیے۔ اگلے جمعہ کے دن غریب خانہ پر مشاعرہ ہے۔ چند دوست جمع ہو رہے ہیں، آپ بھی ضرور قدم رنجہ فرمائیے گا۔ نواب محمد مصطفےٰ خاں اور نواب ضیاء الدین خاں آنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ طرح، 'گریبانم نمی آید'، 'دامانم نمی آید' طے ہوئی ہے۔ لیکن اس کی قید نہیں آپ جو چاہیں پڑھیں۔ میرزا صاحب نے جواب دیا کہ میں ضرور حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔ نیر رخشاں برابر سے بولے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جمعہ کو انھیں ساتھ لیتا آؤں گا۔

تھوڑی دیر میں سب صاحب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ جب میدان صاف ہو لیا تو کلو نے آن کر پوچھا کہ آپ اسی جگہ کھانا کھائیں گے یا اندر چل کر۔ بولے 'میرے لیے تو یہیں لے آؤ۔ یہ چاہیں تو بے شک اندر چلے جائیں۔ میں نے کہا نہیں میں بھی یہیں کھاؤں گا۔ چنانچہ کلّو اور ایاز دونوں ہمارا کھانا دیں مردانے میں لے آئے۔ میرزا صاحب نے صرف تین چار شامی کباب، کھٹی میٹھی چٹنی کے ساتھ، نوش جاں فرمائے، اور اس کے بعد مٹی کے آبخورے سے شراب پینے لگے۔ معلوم ہوا کہ گرمیوں کا معمول ہے کہ سر شام کلو شراب بوتل سے آبخورے میں ڈال دیتا ہے۔ اگر برف موجود ہوئی تو آبخورہ اس میں رکھ دیا، تاکہ شراب ٹھنڈی رہے، ورنہ لال قند کی صافی، پانی میں تر کر کے، آبخورے پر لپیٹ دی جائے گی اور آبخورہ ادھر ہوا میں لٹکتے ہوئے چھینکے پر رکھ دیا جائے گا۔ تاکہ ہوا لگنے سے صافی خشک ہو تو اس سے آبخورہ ٹھنڈا ہو جائے۔

شراب کے ساتھ گھی میں تلے ہوئے نمکین بادام، گزک کے طور پر کھاتے رہے دس بارہ بادام کھائے ہوں گے۔ شراب میں برابر کا عرق گلاب ملاتے گئے۔ فرمانے لگے اس سے شراب کی حدت کم ہو جاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ کوئی وقت مقرر

نہیں تھا۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے یا شام کے قریب، جب چاہا، دو تین گلاس پی لیے۔
بارش کا دن ہو تو اور زیادہ۔ پھر رات کی معمولی شراب اس کے علاوہ۔ کڑوا کریلا اور
نیم چڑھا، مزاج پہلے ہی سے سوداوی تھا۔ ان بے اعتدالیوں نے اسے اور آگ کا
پتلا بنا دیا۔ اب یہ حالت ہے کہ صافی شراب گھونٹ بھر بھی نہیں پی سکتا۔ اس کے
پینے سے سینہ جلنے لگتا ہے۔ اور حلق میں کانٹے چبھنے لگتے ہیں۔ اس لئے اسے گوارا بنانے
کو اس میں عرق گلاب ملاتا ہوں اور مقدار تو تم دیکھ ہی رہے ہو کہ برائے نام رہ گئی ہے۔
میں نے ایک مقطع میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

آسودہ باد خاطرِ غالبؔ کہ خوئے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

میں نے جرأت کر کے کہا کہ اتنے پینے سے چھوڑ دینا اچھا، ایسے گناہِ بے لذت
سے حاصل؟ بولے بھائی ٹھیک کہتے ہو لیکن میاں ذوق نے کیا سچ کہا ہے:۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

۳۵۔۴۰ برس کی عادت، اب چھٹے تو کیونکر، بہر حال شرمسار ہوں۔ اسے
حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں لیکن اس کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ
اور امام علی مرتضیٰؑ کے صدقے میں بخش دے۔

اس کے بعد موضوع بدل گیا۔ دیر تک چہکتے رہے اور آدھی رات کے قریب
سونے کے لئے پلنگ پر گئے۔

اگلے دن دوپہر کا کھانا کھا کے میرزا صاحب اندر کی کوٹھری میں چلے گئے۔
مجھ سے فرمایا یہاں گرمی میں اکیلے بیٹھے کیا کرو گے۔ چاہو تو تم بھی اندر آجاؤ۔ چنانچہ
ہم دونوں کے لئے کلّو نے چارپائیاں بچھوا دیں اور ہم اُن پر دراز ہو گئے۔ فرش پر
پانی کا خوب چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا۔ کوٹھری کی شرقی سمت گلی میں ایک بڑی سی کھڑکی
کھلتی تھی۔ اس پر خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی۔ کلّو نے ایاز چھوکرے کو مقرر کر دیا کہ ہر آدھ
پون گھنٹے کے بعد اس پر پانی ڈالتا رہے۔ میرزا صاحب نے بدن کے سارے کپڑے

اتار دیئے۔ صرف ایک پاجامہ رہ گیا۔ پلنگ پر لیٹ گئے، اور حقہ پیتے رہے۔ کمرے میں پانی کی جھجر اور برف رکھی تھی۔ پیاس محسوس ہوتی تو اُٹھ کر پی لیتے۔ جب عصر کا وقت ہوا اور سائے لمبے ہونے لگے تو کوٹھری سے نکلے۔

آج فرمایا دیکھو میاں، دہلی کی خصوصیات میں سے ایک مسجد جامع کا شام کا بازار بھی ہے۔ چلو آج تمھیں تماشا دکھالائیں۔ چنانچہ کلّو کو حکم ہوا کہ پالکی کا انتظام کر دیا جائے۔ کلیان ہمارے ساتھ جائے گا۔ اگر ہماری غیر حاضری میں کوئی صاحب تشریف لائیں تو انھیں بٹھایا جائے۔ مغرب کے بعد مکان پر پہنچ جائیں گے۔

میرزا صاحب نے پالکی جامع مسجد کی سیڑھیوں سے واپس کر دی اور ہم پیدل سیر کرنے لگے۔ ایک ہنگامہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کہیں بازیگر اپنے کرتب دکھا رہا ہے۔ یار لوگ اُس کے گرد پرا باندھے کھڑے ہیں۔ کہیں بھان متی کا تماشا ہو رہا ہے اور یہاں بھی ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف خوانچے والے طرح طرح کی بولیاں بول رہے ہیں۔ سیڑھیوں پر ہر طرح کی دکانیں سج رہی ہیں۔ چلتے چلتے میرزا صاحب ایک جگہ رُک گئے۔ اور کلیان سے کہا، جاؤ کلّن کی دکان سے رات کے لئے، چار آنے کے سیخ کباب لے آؤ۔ وہ دونے میں کباب رکھوالایا۔ میں نے راستے میں ایک جگہ سے دو تین کتابیں خریدیں اور میرزا صاحب نے بچوں کے لئے کچھ کھلونے اور مٹھائی خریدی۔ واپسی میں چاندنی چوک کے راستے ٹہلتے ہوئے آئے۔ سعادت خاں کی نہر سڑک کے بیچوں بیچ تھی۔ دو رویہ درختوں کی قطار اور دکانوں کی روشنی کا پانی میں عکس، عجیب پُرلطف نظارہ تھا۔ دن بھر کی گرمی سے طبیعت جتنی گھبرائی ہوئی تھی۔ اتنی ہی اس وقت شام کی سہانی فضا میں محظوظ ہوئی۔ سینکڑوں آدمی نہر کے کنارے بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ میں بھی اگر اکیلا ہوتا تو شاید وہاں کسی جگہ بیٹھ جاتا۔ لیکن میرزا صاحب کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی کہ نہ معلوم کون کون صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔

اس لیے، اُن کے ساتھ واپس آ گیا۔

جمعہ کے دن شام کے کھانے کے بعد نواب ضیاء الدین خاں کہ قریب ہی قاسم جان کی گلی میں رہتے تھے۔ اپنے ہاتھی پر سوار ہو کر آ گئے، اور کہا کہ چلیے حضور، صدر الصدور کے مشاعرہ میں۔ چنانچہ ہم دونوں بھی سوار ہو گئے۔ راہ میں سے نواب شیفتہ کو کوچہ چیلان سے ساتھ لیا اور یوں لدے پھندے، ہم سب مفتی صاحب کے مسکن محلہ چتلی قبر میں پہنچے۔ دیکھا کہ اچھا خاصہ مجمع ہو چکا ہے۔ قلعے سے بعض شہزادے بھی آئے ہوئے تھے جن میں سے میرزا خضر سلطان، میرزا بختاور شاہ شاکی، میرزا محمد قویش واقف، میرزا نورالدین شاہی اور میرزا عالی بخت عالی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک عجیب بات دیکھی کہ سب شہزادوں کا ایک سا حلیہ اور ایک سی وضع اور ہر ایک کے ہاتھ میں بٹیر تھی۔ ان میں سے بیشتر "حافظ جیو" عبدالرحمٰن احسان مرحوم اور شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ خود استاد ذوق بھی موجود تھے۔ داغ اور ظہیر اور محمد حسین آزاد تھے۔ صہبائی اپنے بعض شاگردوں کے ساتھ آئے تھے۔ میرزا غالب کے شاگردوں میں سے قربان علی بیگ خاں سالک۔ جواہر سنگھ جوہر۔ غلام حسن خاں محو۔ یوسف علی خاں عزیز اور بعض دوسرے اصحاب موجود تھے۔ ایک ولایت آمدہ شاعر سحابی بھی شریکِ مجلس تھے۔

مشاعرہ دس ساڑھے دس بجے کے قریب شروع ہوا۔ پہلے اردو کے شاعروں نے اپنا اپنا کلام سُنایا۔ ان میں سے بعض کا کلام واقعی بہت پختہ اور دل نشین تھا۔ اساتذہ نے بھی بخل سے کام نہ لیا اور اُن کا دل بڑھانے کو خوب داد دی۔ خصوصاً داغ اور سالک اور ظہیر کی غزلوں کی بہت تعریف ہوئی۔ آخر میں اساتذہ کی باری آئی۔ اب نوجوان اور نوآموز طبقہ خموشی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے آزردہ نے کہ میزبان اور صاحبِ خانہ تھے اپنی غزل سُنائی۔ غالب اور صہبائی اور ذوق سب نے بہت تعریف کی۔ اور آزردہ نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ان کے بعد نیر، رخشاں، شیفتہ، صہبائی وغیرہ نے اپنا کلام سُنایا۔ سب سے آخر میں شمع میرزا غالب کے سامنے آئی۔

انھوں نے پہلے ایک غیر طرحی غزل سنائی۔ اس کے تین چار شعروں کی بہت تعریف ہوئی تھی۔

ہر چہ فلک نخواستست، ہیچ کس از فلک نخواست — ظرفِ فقیہ مے نجست، بادۂ ما گزک نخواست
جاہ ز علم بے خبر، علم ز جاہ بے نیاز — ہم محکِ تو زر ندید، ہم زرِ من محک نخواست
رندِ ہزار شیوہ را، طاعتِ حق گراں نہ بود — لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

آخری شعر پر آزردہ تڑپ اُٹھے۔ اس کی خاص طور پر داد دی اور لے دو تین بار پڑھوایا۔ اس کے بعد میرزا صاحب نے طرحی غزل سنائی۔ جس کے چند شعر میرے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں۔

چہ عیش از وعدہ، چوں باور ز عنوانم نمی آید — بنوعے گفت، می آیم، کہ می دانم، نمی آید
گزشتم زاں کہ بر زخمِ دلِ صد پارہ، خوں گرید — خود او را، خندہ بر چاکِ گریبانم، نمی آید
روش نگستہ و در سایۂ دیوار نشستہ — بکویش، رشک بر مہرِ درخشانم، نمی آید
دعائے خیر شد، در حقِ من، نفریں بجاں کردن — ز نفریں بس کہ می رنجد، بہ لب جانم، نمی آید
دلش خواہد، کہ تنہا سوئے من روئے آورد، لیکن — فریب ہم رہاں، دانم، ز نادانم، نمی آید
دبیرم، شاعرم، رندم، ندیمم، شیوہ ہا دارم — گرفتم رحم بر فریادِ افغانم، نمی آید

ندارم بادہ غالبؔ گر سحر گاہش، سر راہے
بہ بینی مست، دانی، کز شبستانم، نمی آید

سب شعروں کی خوب خوب داد ملی۔ پڑھنے کا انداز یہ تھا کہ انھوں نے ساری غزل ہلکے ترنم سے پڑھی۔ پہلی بار مصرع اولیٰ ایک بارگی پڑھ جاتے پھر اُسے آہستہ آہستہ دُہراتے اور ایک لمحہ کے توقف کے بعد اسی لہجہ میں دوسرا مصرع سناتے۔ جب کوئی صاحب داد دیتے یا مصرع اُٹھاتے تو میرزا صاحب کا دایاں ہاتھ بے اختیارانہ تھوڑا اُٹھ جاتا اور بس ورنہ یوں وہ نہایت دل جمعی سے اپنی جگہ پر بیٹھے رہے اور پہلو تک نہیں بدلے۔

میرزا غالبؔ کی غزل کے ساتھ مشاعرہ ختم ہوا اور اس کے بعد حاضرین ایک

ایک کر کے رُخصت ہونے لگے۔ آزردہ نے سب صاحبوں کا شکریہ ادا کیا۔ ہم بھی چار ساڑھے چار بجے کے قریب واپس مکان پر آئے۔

یہ آٹھ دس دن جو میں میرزا صاحب کے مکان پر رہا مجھے کبھی نہیں بھولیں گے۔ چونکہ میں جس کام سے آیا تھا وہ ختم ہو چکا تھا اس لئے میرزا صاحب سے اجازت لے کر آگرے چلا گیا۔

— ۳ —

اس کے بعد میں لگ بھگ دو برس تک دہلی نہ آسکا۔ اب کے میرا ۱۸۵۵ء میں آنا ہوا۔ میرزا صاحب ابھی تک اسی بلی ماروں والے مکان میں رہتے تھے۔ میں شام کے قریب پہنچا تھا وہ بہت لُطف اور مہربانی سے ملے۔ ان سے مل کر میں اندر گیا۔ جناب بیگم صاحبہ کی خدمت میں بندگی عرض کی۔ انھوں نے دعا دی۔ سفر کا پوچھتی رہیں کہ کہو، راہ میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ اس کے بعد میں باہر آیا۔ میرزا صاحب دیر تک حضرت والد صاحب قبلہ اور اپنے دوسرے ملنے والوں کی باتیں کرتے رہے۔ پھر پوچھا، سُناؤ، کاروبار کا کیا حال ہے۔ میں نے کہا کہ مندہ تو ہے لیکن شکر ہے، بھلی بُری گذران ہوتی جاتی ہے۔ کسی کا کچھ دینا نہیں، یہی غنیمت ہے۔

اس تین چار برس میں میرزا صاحب کی ظاہری شکل و صورت میں بہت فرق آگیا تھا۔ پہلی بار جب ملے میں تو ڈاڑھی گھٹی ہوئی تھی۔ اب چھوڑ رکھی تھی۔ لیکن اس کے بالعکس سر منڈا ہوا تھا۔ سامنے کے دو دانت ندارد، اس لئے آواز ہلکی ہوگئی تھی۔ کمر میں بھی خفیف سا خم آگیا تھا۔ غرض میں نے انھیں جسمانی لحاظ سے بہت کمزور پایا۔ البتہ طبیعت میں وہی پہلی سی چستی اور گفتگو میں شوخی موجود تھی۔

ان دنوں موسم کچھ عجیب طرح کا تھا۔ اگرچہ یوں گرمیوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا لیکن پھر بھی دن کو سخت گرمی پڑتی تھی۔ البتہ رات کو اچھی خاصی سردی ہو جاتی تھی۔ اس لئے وہ حسب معمول دوپہر کے بعد اندر کی کوٹھری میں گذارتے تھے۔

ایک دن کا واقعہ ہے۔ یہی کوئی تین کا عمل ہوگا۔ ہم ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لُطف لے رہے تھے کہ باہر دروازے پر کچھ شور ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کھٹ سے دروازہ کھلا۔ آگے آگے حسین علی خاں اور اس کے پیچھے باقر علی خاں اور ان دونوں کے پیچھے مغلانی۔ حسین علی خاں بھاگا چلا آرہا تھا اور ساتھ ساتھ چیختا بھی جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی لکڑی کا کھلونا تھا۔ معلوم ہوا کہ باقر علی خاں چاہتا ہے کہ حسین علی خاں اسے یہ کھلونا دے دے اور وہ دینا نہیں چاہتا۔ بس اس پر کٹا چھنی ہوگئی۔ بیگم صاحبہ گھر پر نہیں تھیں، اس لیے حسین علی خاں، پناہ مانگنے کو، دادا جان کے پاس دوڑا آیا تھا۔ ہمارے پلنگ کچھ ایسے اونچے نہیں تھے۔ حسین علی خاں دوڑا دوڑا آیا اور میرزا صاحب کے پلنگ پر چڑھ گیا۔ وہ باہر مٹی اور گرد و غبار میں کھیلتا آیا تھا، کمرے میں پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ اس سے اس کے پاؤں گیلے ہوگئے۔ اس کے اوپر چڑھنے سے سپید چادر پر جو گل کاری ہوئی، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میرزا صاحب نے جو ڈانٹا تو بڑا لڑکا باقر علی خاں تو غائب ہوگیا لیکن حسین علی خاں وہیں پلنگ پر بیٹھا مچلنے اور بسورنے لگا۔ چونکہ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ اس لیے میرزا صاحب نے خیال کیا کہ اب خفا ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ انھوں نے بچے کو چمکارا اور پیار کیا۔ پھر مغلانی کو آواز دی اور اسے اس کے حوالے کیا۔ کلّو سے بستر کی چادر بدلوائی، اور دوبارہ لیٹ گئے۔

چند لمحے بعد کہنے لگے تم سے ایک دل کی بات کہوں۔ میں اس خانہ داری سے کبھی خوش نہیں رہا۔ جب میری شادی ہوئی ہے تو مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ شادی کہتے کسے ہیں اور اس کے جھنجٹ اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔ خیر اس کا کیا غم، کیونکہ اگر معلوم بھی ہوتا تو میں کیا کر سکتا تھا۔ ہمارے بزرگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اولاد کا اپنی شادی بیاہ کے بارے میں بولنا پرلے سرے کی بے حیائی ہے۔ میں ٹھہرا قلندرانہ وضع کا آدمی، میری یہ آرزو، کہ ایک شطرنجی اور لوٹا کندھے پر ڈالوں۔ لکڑی ہاتھ میں لوں اور پیادہ پا چل نکلوں، آج یہاں، کل وہاں، ملک خدا تنگ نیست، پائے گدا لنگ

نیست۔ اور یہ قبیلہ داری کے تمام اصولوں کے خلاف۔ خدا نے اولاد دی اور لے لی۔ غم کسے نہیں ہوگا کہ یہ قدرتی امر ہے لیکن دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ میں نے اس پر صبر شکر کیا کہ یوں بھی تنہائی میری آزاد طبیعت کے منافی نہیں تھی۔ غرض لشٹم پشتم گذرتی جا رہی تھی۔ لیکن قدرت بڑی ستم ظریف ہے۔ اس نے کہا، ذرا ٹھہر تو جا، تو کیا سمجھے بیٹھا ہے۔ تین برس ہوئے، پہلے زین العابدین خاں کی بیوی مری اور پھر وہ آپ بھی چل بسا۔ حسین علی خاں کو میری بیوی یہاں لے آئی۔ بڑا بھائی اپنی دادی کے پاس جا رہا۔ چند مہینے ہوئے، وہ نیکسا بخت بھی جنت کو سدھاری اور باقر علی خاں بھی یہاں آگیا۔ اسے کہتے ہیں، غم نداری بز بخر۔ کہو بے مروتی کرکے کس سے کہوں کہ تو ان بچوں کو لے لے میں اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا، حالانکہ بر حقیقت ہے بس چپ چاپ، قضاو قدر کی شعبدہ بازی کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔ غرض اسی طرح دل سوزی کی باتیں کرتے کرتے چپ ہو گئے۔ میں نے غور کرکے سُنا تو زیرِ لب یہ شعر گنگنا رہے تھے ؎

نہ شامِ ما را سحر نویدے، نہ صبحِ ما را دمِ سپیدے
چو حاصلِ ماست نا امیدی، غبارِ دنیا بفرقِ عقبیٰ

اگلے دن صبح کے وقت بریلی سے قاضی عبدالجمیل جنونؔ کے بھیجے ہوئے آموں کے دو ٹوکرے پہنچے۔ میرزا صاحب نے قاضی صاحب کے ملازم کو جو ٹوکرے لایا تھا انعام دیا اور ٹوکرے اپنے سامنے کھلوائے۔ کچھ آم راستے میں خراب ہو گئے تھے وہ پھکوا دیئے، دس دس آم دو جگہ نواب مصطفیٰ خاں اور نواب ضیاء الدین خاں کے ہاں بھجوائے۔ اور باقی کو ٹھنڈے پانی کی ناند میں رکھوا دیا۔ تیسرے پہر، گھر کے سب لوگ آم کھانے کے لیے جمع ہو گئے۔ سب نے خوب سیر ہو کر کھائے میرزا صاحب نے جلد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے کہا حضرت یہ کیا۔ کہنے لگے سچ کہوں نیت نہیں بھری مگر بھائی کیا کروں معدے میں ہضم کی وہ پہلی سی طاقت نہیں رہی۔ ہائے، کیا دن تھے، جوانی کے عالم میں، کہ طبیعت میں جوش تھا اور صحت برقرار تھی۔ عصر کے

قریب آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ اپھر جاتا تھا۔ اور دَم پیٹ میں نہیں سماتا تھا۔ اب آم کھانے کا کیا مزا۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ کھاؤں تو ہضم کیسے کروں۔ جوانی کیا گئی کہ زندگی کا لطف جاتا رہا۔

ایک دن بڑا دل چسپ لطیفہ ہوا۔ جب ہم دونوں دیوان خانے میں جا کے بیٹھے تو میں نے دیکھا کہ ان کے کمر بند میں نو دس گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ میں حیران کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ شاید رات، بے خبری کے عالم میں انھوں نے یہ گرہیں لگائی ہوں، کیونکہ بعض لوگوں کو ایک قسم کی بیماری ہوتی ہے کہ وہ سوتے میں کوئی کام کرتے ہیں اور انھیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں لیکن مجھے مذاق کی سوجھی۔ میں نے ان سے کہا، قبلہ، کیا رات کو تسبیح پھیرتے رہے ہیں؟ کہنے لگے: نہیں تو، لیکن کاغذ قلم لو اور لکھتے جاؤ۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور انھوں نے کمر بند کی پہلی گرہ ٹٹولنا شروع کی۔ پھر فرمایا لکھو مطلع ؎

اے ذوقِ نوا سنجی، بازم بخروش آور
غوغائے شبیخونے، بر بنگہہ ہوش آور

اور اس کے بعد گرہ کھول دی۔ اس طرح انھوں نے مجھے پوری غزل لکھوائی۔ ہر ایک شعر کے بعد وہ ایک گرہ کھول دیتے حتیٰ کہ نو کی نو گرہیں کھُل گئیں اور غزل مکمل ہو گئی۔ خیر غزل تو میں نے لکھ لی لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی کہ یہ کیا طلسم ہے۔ وہ بھی میری کیفیت کو بھانپ گئے۔ پہلے تو ہنستے اور میری بدحواسی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پھر بولے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ رات جب بستر پر جاتا ہوں تو کبھی کبھی طبیعت شعر گوئی پر مائل ہو جاتی ہے۔ اب تو ایک مدت سے یہ شوق ہی چھوٹ گیا ہے، ورنہ ایک زمانہ تھا کہ میں دن میں شعر کہتا ہی نہیں تھا۔ عام طور پر رات کو سرخوشی کے عالم میں فکر کیا کرتا تھا۔ اب بھلا اس وقت کون اُٹھ کر روشنی کا انتظام کرے اور لکھنے کا سامان ڈھونڈے۔ میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب شعر ہو جاتا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتا۔ اس طرح دس دس، بارہ

بارہ گرہیں تک لگا کے سو رہتا۔ صبح کو اُٹھتا اور ٹٹول ٹٹول کر حافظے سے نکال کے شعر قلم بند کر لیتا۔ اب تو مہینوں اور برسوں گذر جاتے ہیں، کوئی تازہ فکر ہوتی ہی نہیں۔ رات یونہی یہ زمین خیال میں آگئی۔ طبیعت نے راہ دی اور میں نے غزل پوری کر لی۔ پرانی عادت کے مطابق کمر بند کا سہارا لیا۔ اگرچہ مجھے اندیشہ تو تھا کہ یہ کہیں نسیان کی نذر نہ ہو جائے، لیکن اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ تاہم تم نے دیکھا کہ پورے نو کے نو شعر یاد آگئے۔ اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ جوانی کے دنوں میں کیا کیفیت تھی۔ اچھا اب قلم دوات اور کاغذ میری طرف بڑھاؤ۔ نواب انوار الدولہ بہادر اور منشی نبی بخش کو خط لکھوں اور یہ غزل ان کی خدمت میں تحفہ بھیجوں۔ آج ان دونوں صاحبوں سے زیادہ کوئی اور، اس کلام کا مستحق نہیں۔

وائے، بر جانِ سخن گر بہ سخن داں نرسد

خاص طور پر منشی نبی بخش کہ سخن فہمی اس بزرگوار کا حق ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ جب تک میں نے انھیں نہیں دیکھا مجھے ٹھیک طور پر یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ شعر گوئی اور شعر فہمی میں کتنا بعید فرق ہے۔ جب تک یہ غزل ان دونوں صاحبوں کے پاس نہیں پہنچ جاتی مجھے چین نہیں آئے گا۔

اس کے بعد اُنھوں نے خط لکھے اور لفافوں پر پتے لکھ کر رکھ دیئے۔ تھوڑی دیر میں کلّو آیا۔ اس نے خط لفافوں میں ڈالے، اُن کو بند کر کے ٹکٹ لگائے اور ڈاکخانہ چلا گیا۔

شیخ ابراہیم ذوقؔ، نومبر ۱۸۵۴ء میں خدا کو پیارے ہوئے، حضرت ظلِ سبحانی ۴۶، ۴۷ برس ان سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ اتنی لمبی مدّت کی دوستی اور محبت، صدمہ ہوا ہی چاہیئے۔ انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ لیکن نبھ نہ سکی۔ شاہی خاندان میں شعر و شاعری اور علم و ادب کا مذاق شروع سے تھا مگر اوّل اوّل یہ ذوق یہ کچھ دبا سا رہا۔ وہ لوگ تلوار کے بھی دھنی تھے۔ نری باتیں ہی بنانا نہیں جانتے تھے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، تلوار کو نیام میں زنگ لگنے لگا اور اس کی جگہ قلم نے

لے لی۔ پھر تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ آخری زمانے میں قلم ہی قلم رہ گیا اور تلوار اُٹھا کے طاق پر رکھ دی گئی۔ ظفرؔ کی بھی یہی حالت تھی۔ شاعری تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ملک ہندوستان کی بادشاہی تو برائے نام رہ گئی تھی لیکن ملک سخن کی تاجوری بے شک ان کے حصّے میں آئی۔ اتنے زمانے کا شوق، ممکن نہ تھا کہ وہ زیادہ دیر تک خاموش رہ سکتے۔ چنانچہ اُنھوں نے پھر شعرگوئی شروع کر دی اور اب کے اصلاح کا فرض میرزا غالبؔ کے سپرد ہوا۔

میرزا صاحب کا دستور یہ تھا کہ قیلولے کے بعد عصر کے وقت، جہاں پناہ کی غزلیں بناتے تھے۔ ایک دن جب کام سے فارغ ہو چکے تو میں نے کہا کہ قبلہ، میں نے آج تک حضرت ظل اللہ کو قریب سے نہیں دیکھا۔ دیکھنے کی بڑی آرزو ہے۔ کہنے لگے یہ کیا مشکل ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیسے۔ فرمایا، آج کل روزانہ شام کو نورگڈھ کے پاس، جمنا کی ریتی میں، پتنگ بازی ہوتی ہے۔ ایک طرف قلعہ معلیٰ کے بادشاہی پتنگ باز ہوتے ہیں اور دوسری طرف ناظر حسین میرزا کے ساتھی۔ آج جہاں پناہ نے حکم دیا تھا کہ تم بھی وہاں آیا کرو۔ اب کہو، حکمِ حاکم، جانا ہی پڑے گا۔ لیکن آج تو نہیں، البتہ کل سے جاؤں گا۔ تم بھی چلنا، میرے ساتھ ساتھ رہنا اور جی بھر کر دیکھ لینا۔

اگلے دن سہ پہر کو میرزا صاحب سو کر اُٹھے۔ مُنھ ہاتھ دھویا اور پالکی میں سوار ہو گئے۔ میں پیدل ساتھ ہو لیا۔ نورگڈھ کچھ دور تو تھا ہی نہیں، جلد ہی ہم وہاں پہنچ گئے۔ دیکھا تو بلا مبالغہ سینکڑوں پتنگ باز جمع ہو رہے ہیں اور ہزاروں تماشائی الّلے تلّلے اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ جہاں مجمع ہو، وہاں بھلا خوانچے، پھیری والے کیسے نہ پہنچیں اور پھر منگتوں کو کون روک سکتا ہے۔ خُسرے اور خُسریاں، چھوٹے چھوٹے بچوں کو اُنگلی سے لگائے، ہر آئندہ و روندہ سے بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ غرض کہ یہاں ایک نئی دُنیا آباد ہو گئی تھی۔ قسم قسم اور رنگ برنگ کے پتنگ اور تکل آسمان میں ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے کوئی بہت بڑا رنگین اور پھولدار قالین ہوا میں

اِدھر سے اُدھر اُڑ رہا ہو۔

اعلیٰ حضرت کو میں نے پہلی بار اتنے نزدیک سے دیکھا۔ لمبوترا چہرہ، پتلی سوتوان ناک، چوڑی پیشانی، چھوٹی چھوٹی بھویں، نہایت تیز اور بڑی بڑی بھوری آنکھیں۔ چوڑا دہانہ۔ نیچے کا ہونٹ نسبتہً نمایاں اور اس پر پان کا لاکھا جما ہوا۔ کلّے صاف اور ٹھوڑی پر دو ڈھائی انگل کی سفید براق ڈاڑھی۔ شرعی خشخاس لبیں۔ قد میانہ اور سینہ چوڑا تھا۔ لیکن شانے تنگ اور ڈھلوان تھے۔ رنگ خاصا سانولا تھا۔ حالانکہ سن مبارک اس وقت اسّی سے اوپر تھا، اس کے باوجود چہرے مہرے سے چستی کا اظہار ہوتا تھا۔ انھیں دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں کسرت کا شوق رہا ہے۔ چنانچہ ان کی جوانی میں مشہور تھا کہ ہندوستان بھر میں ڈھائی شہ سوار ہیں۔ ایک یہ، ایک ان کے چھوٹے بھائی میرزا جہانگیر اور آدھے کوئی اور بزرگوار۔ لباس میں نیچے قبا تھی اور اس کے اوپر چارقب۔ سر پر دستار اور دستار کے اوپر گوشوارہ، جیغہ، سرپیچ اور تاج شاہی۔ اس پر تین طرے۔ گلے میں موتیوں کا کنٹھا اور ایک سو ایک موتی کا مالا۔ بازوؤں پر بھج بند اور نورتن۔ ہاتھ میں موتیوں کی سمرن۔ زرنگار چوکی پر آلتی پالتی مارے تشریف فرما تھے۔ اس وقار اور متانت کی مورت دیکھنے سے مجھ پر جو ہیئت طاری ہوئی تھی، اب میں اس کا بیان نہیں کر سکتا۔

آگے پیچھے شہزادوں اور سلاطینوں اور امیروں وزیروں کا جمگھٹا تھا۔ چند سر برآوردہ حضرات بیٹھے تھے۔ باقی سب مرتبے سے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔ بعض شہزادے بھی پتنگ اڑا رہے تھے اور حضور والا سیر دیکھ رہے تھے۔ میرزا خضر سلطان بھی انہی لوگوں میں سے تھے جو پتنگ اُڑا رہے تھے۔ اتنے میں ان کا پتنگ کسی سے پیچ لڑ گیا۔ وہ گھبرا کر کھینچ کرنے لگے۔ میرزا صاحب نے ان سے کہا، صاحبِ عالم، یہ موقع کھینچ کا نہیں، بلکہ ڈھیل کا ہے۔ اس پر اُنھوں نے ڈھیل چلائی، جب دیکھا کہ ڈبے کے ڈبے پتنگ بہت دور نکل گئے ہیں، تو میرزا صاحب نے ان سے

کہا کہ دو چار ٹھمکیاں دے کر دیکھیے تو کہ مخالف کا کیا ارادہ ہے۔ اُنھوں نے ایک آدھ ہی ٹھمکی دی ہوگی کہ دوسرا پتنگ چکر لانے لگا۔ میرزا صاحب نے شہزادے سے کہا کہ اب اگر آپ پھرتی سے جھٹکا دیں تو مخالف سنبھل نہیں سکے گا۔ چنانچہ یہی ہوا، انھوں نے ایک ہی جھٹکا دیا تھا کہ دوسرا پتنگ کٹ گیا۔

اعلیٰ حضرت اس پر بہت مسرور ہوئے۔ لطف سے فرمایا، اماں میرزا صاحب، ہم نہیں جانتے تھے کہ آپ اس فن میں بھی طاق ہیں۔ یہ ادب سے بولے، پیر و مرشد، خود ستائی ہوتی ہے، ورنہ کہوں کہ یہ خانہ زاد کیا نہیں جانتا۔ مجھے بھی کسی زمانے میں پتنگ اُڑانے کا بہت شوق تھا، بلکہ میں نے نہایت ابتدائی زمانے میں پتنگ کے تلازمے سے مثنوی کے طور پر چند شعر بھی لکھے تھے۔ حضور والا بولے، اچھا، اچھا، ہمیں بھی سنائیے تو۔ میرزا صاحب نے گزارش کی۔ عالم پناہ، جان کی امان پاؤں، صرف چند شعر ہیں اور وہ بھی نہایت ابتدائی مشق، سننے سنانے کے لائق نہیں۔ حضور نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا: کوئی پروا نہیں، ہم سنیں گے۔ اس پر میرزا صاحب کہنے لگے۔ الامر فوق الادب، بہ نظرِ اصلاح ملاحظہ ہوں۔ پھر یہ چند شعر تحت اللفظ سنائے ؂

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی ... لے کے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا ... اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہاں، اے دل، ہوائے دلبراں ... بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں
پیچ میں ان کے نہ آنا، زینہار ... یہ نہیں ہیں گے، کسو کے یارِ غار
گورے پنڈے پر نہ کران کے نظر ... کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائے گی تیری ان سے سانٹھ ... لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے ... قہر ہے، دل ان سے الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے ... بھول مت اس پر اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں ... مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں

دل سے سن کر کانپ کر اٹھا پیچ و تاب ... کر جواب

رشتہ او رگردنم افگندہ دوست

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اعلیٰ حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ پتنگ کے اس شعر کی تضمین بھی کسی کو نہیں سوجھی ہوگی۔ میرزا صاحب نے جھک کر شکریہ ادا کیا۔ چونکہ دیر ہو چلی تھی اور شام کی ہوا میں خنکی ہوتی جا رہی تھی اس لئے حضرت بادشاہ سلامت، واپسی کے لئے مغرب کے قریب تخت رواں پر سوار ہو گئے اور سب کو واپس جانے کی اجازت دی۔ ہم بھی چراغ جلے مکان پر پہنچے۔ میرزا صاحب بہت تھک گئے تھے۔ گھر پہنچتے ہی انھوں نے تین چار شامی کباب، نوش جاں فرمائے، شراب پی اور پڑ رہے۔

اس کے دو دن بعد میں آگرے چلا گیا۔

— ۴ —

اس کے دو برس بعد غدر کا ہنگامہ ہوا۔ کچھ معلوم نہ ہوا کہ دہلی اور دہلی کے احباب پر کیا گذری۔ جب فساد کی آگ فرو ہوئی تو والد صاحب قبلہ نے مجھ سے کہا کہ بیٹا جاؤ اور میرزا صاحب کی خیر و عافیت کی خبر لے آؤ۔ چنانچہ میں دہلی آیا۔ یہ ۱۸۵۸ء کے شروع کا ذکر ہے۔ ابھی تک شہر میں پورا امن نہیں ہوا تھا۔ گرفتاریوں کا سلسلہ جاری تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی ہندوستانی امیر کی گرفتاری یا نظر بندی، ضبطی جائداد یا پھانسی کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ شہر میں باہر سے آنے جانے پر بھی بہت پابندیاں تھیں اور باہر سے آنے والوں کو شہر کے فوجی حکام سے خاص ٹکٹ لینا پڑتا تھا۔ میں نے بھی دو دن ٹھہرنے کا ٹکٹ لیا۔ میں سہ پہر کو دہلی پہنچا اور سیدھا بلی ماروں میں مرزا صاحب کے مکان پر چلا گیا۔

شام کو میرزا یوسف علی خاں عزیز اور منشی ہیرا سنگھ دیند اور پنڈت شیو جی رام آن پہنچے۔ میرزا یوسف علی خاں اپنے والد میرزا نجف علی خاں کی وفات کے بعد مستقل طور پر دہلی آ رہے تھے، وہ ان دنوں اسی محلے میں میرزا صاحب کے مکان کے قریب ہی ایک

ہندو امیر کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ وہیں محلے کے کچھ اور بچے بھی ان سے تعلیم پاتے تھے۔ اس طرح گویا مکتب کا سا طور ہو گیا تھا۔ منشی ہیرا سنگھ دردؔ میرزا صاحب کے پُرانے دوست اور مہربان، رائے چھج مل کے چھوٹے بیٹے تھے۔ حوض قاضی کے پاس گندی گلی میں رہتے تھے۔ یہ اور ان کے بڑے بھائی، منشی جواہر سنگھ جوہرؔ (تحصیلدار صاحب، دونوں، میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔

اسی زمانے میں آگرے سے میرزا حاتم علی مہرؔ نے اپنی مثنوی 'شعاعِ مہر'، میرزا صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی۔ عزیزؔ اسے بلند آواز سے پڑھتے رہے اور ہم سب سُنتے اور لُطف اندوز ہوتے رہے۔ غرض رات گئے تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔

اگلے دن شام کے قریب، ہم دیوان خانے میں بیٹھے تھے کہ ڈاک کا ہرکارہ ایک رجسٹری خط لایا۔ میرزا صاحب نے کھولا تو معلوم ہوا کہ میرزا تفتہؔ نے سو روپے کی ہنڈوی اپنے اُستاد کی خدمت میں بھیجی ہے۔ میرزا صاحب نے ہنڈوی صحیح کرکے کلیان کے حوالے کی اور اسے نیل کے کٹرے میں کسی مہاجن کے ہاں بھیجا۔ جانے آنے کی دیر ہوئی، وہ جا کے روپیہ لے آیا۔ انھوں نے پچاس روپے اندر محل میں بھیج دیئے۔ کلو داروغہ نے پچیس روپے کے لگ بھگ، دست گرداں اُدھار لیا تھا، وہ اُسے دیئے، اور باقی رقم اپنے بکس میں رکھ لی۔ فرمانے لگے۔ رات تم نے دیکھا کہ منشی ہیرا سنگھ اور پنڈت شیو جی رام آئے ہوئے تھے۔ اب جب سے میرزا یوسف علی خاں، یہاں آ گئے ہیں، یہ بھی دن رات کا اکثر حصّہ یہیں گزارتے ہیں، ورنہ یہ دونوں صاحب باقاعدہ آتے رہتے ہیں۔ کتنا کثیر الاحباب شخص تھا، کوئی وقت نہیں جاتا تھا جب دو چار دوست میرے پاس موجود نہ ہوں، بلکہ اکثر میری غیر حاضری میں بھی دیوان خانہ خالی نہیں ہوتا تھا۔ یا اب یہ حال ہو گیا ہے کہ اس ہنگامے میں اگر یہ دو تین صاحب بھی یہاں نہ ہوتے تو میں گویا شہر میں نہیں، کسی ویرانے میں رہتا تھا۔ شہر میرے ملنے والوں سے خالی ہو گیا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا یہاں موجود، نہ میں کسی کے پاس جا سکوں۔ زندہ ہوں مگر زندگی دوبھر

ہوگئی۔ نو دس مہینے سے پنشن بند ہے، کہو یہ سارا زمانہ کیسے گذرا ہوگا۔ خدا جیتا رکھے برخوردار تفتہ کو کہ اس نے یہ سو روپے بھیج کر جِلا لیا ہے۔ ابھی نہیں معلوم، اور کیا کچھ دیکھنا نصیبوں میں لکھا ہے۔ خیر یہ بھی جوں توں کٹ جائے گی ؎

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

اس زمانے میں ان کی سرکاری پنشن بند تھی۔ قلعے کی تنخواہ تو بند ہونا ہی چاہیے تھی۔ اس لیے بہت تنگی ترشی سے گذارا ہو رہا تھا۔ حضرت والد صاحب قبلہ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ موقع دیکھ کے اُنھیں آگرے آنے کی دعوت دینا۔ میں نے سوچا کہ اس سے بہتر موقع نہیں ملنے کا۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ ابھی یہاں کی حالت خطرے سے خالی نہیں۔ آپ چند دن کے لیے آگرے تشریف لے چلیے۔ وہاں خدا کے فضل سے آپ کا اپنا گھر ہے۔ عزیز اقارب، دوست احباب موجود ہیں۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ جب امن و امان ہو گیا تو واپس چلے آیئے۔ فرمانے لگے یہ ٹھیک ہے کہ حالت یہاں کی تشویش ناک ہے لیکن مجھے اپنی بے گناہی پر بھروسہ ہے۔ میں فراری یا روپوش نہیں۔ میرے خلاف کوئی جُرم ثابت نہیں ہوا۔ کسی نے میری مُخبری نہیں کی۔ انگریزی حکام میری شہر میں موجودگی سے واقف ہیں۔ اکتوبر سال گزشتہ میں کرنیل براؤن صاحب کے سامنے حاضر ہوا تھا اور انھیں کی اجازت سے یہاں مقیم ہوں۔ اس لیے اگر کچھ خطرے کی بات ہوتی، تو اب تک معلوم ہو گیا ہوتا۔ بے شک قلعے کے ملازموں پر شدّت ہے لیکن خاص طور پر انہی لوگوں پر جو اس ہنگامے کے دوران میں نئے نئے وابستہ ہوئے تھے۔ میں تو آٹھ دس برس سے تاریخ لکھنے پر مقرر تھا اور چار پانچ برس سے شعروں کی اصلاح کی خدمت بھی بجا لاتا رہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے ان دنوں میں قلعے سے اپنے تعلقات بالکل قطع نہیں کر لیے تھے، لیکن بھائی سوچو تو، یہ کر بھی کیسے سکتا تھا۔ اگر تلنگوں کو میرے بارے میں کسی قسم کا شبہہ بھی ہو جاتا، تو میری اور میرے اہل و عیال کی تکا بوٹی کر ڈالتے

اس لئے وہاں جاتا بھی رہا اور شعروں کی اصلاح کا کام بھی بدستور کرتا رہا۔ لیکن یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی، بلکہ خیال کرو تو یہ مزدوری تھی، پیٹ پالنے کے لئے اور حیلہ تھا جان بچانے کے لئے۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے انگریزکی کوئی خاص خیر خواہی نہیں کی، لیکن میرا مقدور ہی کیا تھا کہ میں کچھ کر سکتا۔ پس خاموش بیٹھا انتظار کر رہا ہوں۔ دیکھئے، غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ نظر اپنی بے گناہی پر، خیال کرتا ہوں کہ اب شاید امن ہونے کے ساتھ ہی پنشن بحال ہو جائے۔ رہا یہاں سے کسی دوسری جگہ جانا، تو یہ کیسے ممکن ہے۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ مجھے بازپرس اور دارو گیر کا خوف ہے اور میں قصوروار ہوں۔ اس صورت میں اگر اس پنشن کے کھلنے کا کوئی امکان ہے تو وہ بھی جاتا رہے گا۔ نا صاحب، اس وقت یہاں سے نکلنا مصلحت کے خلاف ہے۔ بھائی سے کہنا، گھبرائیں نہیں، وہ بھی ہمارے ہی بزرگ تھے جنھوں نے بھوکے پیاسے خدا کی راہ میں جان تک دے دی۔ دن ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ یہ وقت بھی گذر جائے گا۔ اگر حالات موافق ہوئے، تو میں پھر کسی وقت آگرے کا چکر لگاؤں گا۔

— ۵ —

۱۸۶۰ء میں والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ تمھاری تجارت کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ تم مستقل طور پر دہلی میں سکونت اختیار کر لو۔ وہاں یوں بھی کاروبار زیادہ ہے پھر اس پر بڑا شہر اور حکومت کا مرکز ہونے کے باعث وہاں ترقی کی زیادہ گنجائش ہے۔ میں نے بعض مقامی دوستوں سے مشورہ کیا۔ میرزا صاحب سے بھی خط کے ذریعہ پوچھا۔ سب نے اس رائے پر صاد کیا۔ اس پر میں خدا کا نام لے کر ۱۸۶۱ء کے شروع میں یہاں دہلی آگیا۔

میرزا صاحب نے حکیم محمد حسن خاں والا مکان جولائی ۱۸۶۰ء میں چھوڑ دیا تھا اور اب اسی بلی ماروں میں، ایک دوسرے مکان میں رہتے تھے۔ یہ مکان اگرچہ پہلے والے سے وسیع تھا لیکن اس میں، تکلیف یہ تھی کہ محل سرا اور دیوان خانہ

ایک جگہ نہیں تھے۔ یعنی زنانہ حصّہ ایک جگہ تھا اور مردانہ اس سے کچھ فاصلے پر تھا۔ یہ مکان وہ ہے جو بلی ماروں سے گلی قاسم جان میں داخل ہوتے ہوئے سب سے پہلے اُلٹے ہاتھ کو پڑتا ہے اس کے برابر ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اسی مکان سے متعلق میرزا صاحب نے یہ شعر کہا تھا ۔

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنالیا ہے
اک بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

میں نے پوچھا قبلہ وہ پہلا مکان کیوں چھوڑ دیا۔ اچھا خاصا آرام دہ مکان تھا۔ فرمانے لگے۔ اس میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ بہت تنگ تھا۔ بھائی سچ مانو میرا اس میں دم گھٹتا تھا۔ لیکن چونکہ کوئی اور ڈھنگ کا مکان ملتا نہیں تھا۔ اس لئے آٹھ برس تک اس میں پڑا رہا۔ مئی ۱۸۵۷ء تک جب فساد شروع ہوا ہے، برابر چار روپے مہینہ اس کا کرایہ دیتا رہا۔ جب فساد ہوا تو حالات سے مجبور ہو کر میں کرایہ نہ دے سکا۔ تین برس تک پنشن بند رہی۔ کھانے کو روٹی اور پینے کو شراب تک میسّر نہیں تھی۔ چار روپے مہینہ کرایہ کہاں سے دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تین برس کا کرایہ، کم و بیش ڈیڑھ سو روپیہ چڑھ گیا۔ بارے خدا خدا کر کے مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن جاری ہوئی اور پچھلا بقایا بھی وصول ہوا تو میں نے تین سال کا کرایہ یک مشت ادا کر دیا۔ لیکن اب ایک اور مصیبت پیش آئی۔ اگلے ہی مہینے جون کے آخر میں مالک مکان نے اسے حکیم غلام اللہ خاں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے مکان خالی کر دینے کو کہا، وہ اس میں ردوبدل کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس کے بعض حصّوں کو نئے سرے سے بنوانا چاہتے تھے، تم نے اسے دیکھا ہی ہے، تھا بھی بہت پرانا۔ بڑی مشکل سے یہ جگہ ملی۔ اگرچہ اس میں محل سرا اور دیوان خانہ الگ الگ ہونے کی تکلیف تو ہے۔ لیکن اُس سے کہیں کھلا ہے۔ بہرحال اب پایانِ عمر میں ان باتوں کی شکایت کیا۔ اب باقی ہی کتنی رہ گئی ہے کہ ان باتوں کی فکر ہو۔ اھ

زندگی اپنی جو اس رنگ میں گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس زمانے میں روزانہ عصر کے وقت ان کے عزیزوں میں سے بعض لڑکے ان کے دیوان خانے میں جمع ہو کے فارسی پڑھتے تھے۔ باقر علی خاں اور حسین علی خاں تو گھر ہی پر تھے۔ ان کے علاوہ نواب ضیاءالدین احمد خاں کے چھوٹے صاحبزادے سعیدالدین احمد خاں اور عارفؔ کے بھتیجے (یعنی میرزا حیدر حسن خاں کے چھوٹے بیٹے)، محمد حسن خاں (عرف خضر میرزا) زیادہ حاضر باش تھے۔ کبھی کبھی میرزا علی بخش خاں کے صاحبزادے غلام فخرالدین بھی آنکلتے تھے۔ پڑھانے والے معلّم کا بھلا سا نام تھا۔ مجھے ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا۔ میرزا صاحب پاس بیٹھے سُنتے رہتے۔ کبھی کبھی خود بھی تشریح و توضیح کرنے لگتے۔ ساتھ ساتھ لطیفے بھی ہوتے جاتے چلتے وقت بچّوں کو مٹھائی یا کوئی اور چیز کھانے کو ضرور دیتے۔ یوں بچّوں کی تعلیم کی نگرانی کے ساتھ ان کی بھی گھڑی بھر کی دل لگی ہو جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں سب بچے "گلستاں" کا سبق لیتے تھے۔ جب میرزا تفتہؔ کی مثنوی "سنبلستان" چھپ کر آئی تو میرزا صاحب نے باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو تفتہؔ کے بھیجے ہوئے دونوں نسخے دے دیئے، اور معلّم کو ہدایت کی کہ آئندہ انھیں یہ کتاب پڑھائی جائے۔

باقر علی خاں بہت متین اور خاموش طبع تھا اس کے برخلاف حسین علی خاں حد درجہ شوخ اور کھلنڈرا۔ پڑھنے کے نام سے بھاگتا تھا۔ میرزا صاحب بُلاتے "ارے حسین علی، سبق پڑھا" وہ ایک دفعہ تو کہتا، آیا دادا جان۔ اور پھر غائب غلّہ، کسی طرف کِھسک جاتا۔ کھیل کود کا اسے لپکا تھا۔ زبان کا بھی چٹورا تھا۔ میرزا صاحب کہتے تھے۔ لڑکے بادشاہ ہیں، جب اپنے سر پر پڑے گی، تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔

۱۸۶۳ء کے برس انھوں نے بڑی مصیبت دیکھی۔ انھیں تھوڑی بہت چرک

دھانس تو ہمیشہ ہی رہتی تھی اور کچھ نہ ہوا تو سلسل بول اور قبض کے دونوں مرض تو موجود ہی تھے کہ جان کے ساتھ لگے تھے۔ لیکن اس سال مزید یہ ہوا کہ جنوری کے مہینے میں ان کو پھوڑوں کی تکلیف شروع ہوئی۔ اوّل ایک معمولی سی پھنسی داہنے ہاتھ پر نکلی۔ ان کی بے احتیاطی سے یہ بڑھ کر پھوڑا بن گئی اس کے بعد بائیں پاؤں میں ورم ہوا اور ساتھ ہی پاؤں اور ایڑی سے ہوتا ہوا پنڈلی تک آماس ہو گیا۔ پھر دوسرا ہاتھ اور پاؤں پکڑے گئے۔ اور آخر میں تو جسم کا یہ حال ہو گیا جیسے سرو چراغاں ہو۔ سارے بدن پر چھوٹے بڑے درجن بھر پھوڑے اور ہر ایک پھوڑا اچھا خاصا گہرا۔ حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں دونوں صاحبوں نے تشخیص کی کہ احتراق خون کا شدید حملہ ہوا ہے جو عمر بھر کی شراب نوشی اور بے اعتدالیوں کا نتیجہ ہے۔ آخر باہمی مشورے سے یہ ٹھیری کہ سب سے پہلے پاؤں کے پھوڑے کو پکا کر گندا مواد خارج کیا جائے، تاکہ کہیں اس کا زہر سارے جسم میں سرایت نہ کر جائے۔ چنانچہ دو تین دن نیم کے پتوں کا بھرتا بندھا رہا۔ جب ورم خوب پک گیا اور اس کا مُنہ بن گیا تو نشتر سے سوراخ دے کر گندہ مادہ نکالا گیا۔ حکیم صاحب نے پھوڑوں پر لگانے کے لئے ایک مرہم کا نسخہ لکھ دیا۔

ان کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ حکیم محمود خاں ہی کا آدمی روزانہ صبح کے وقت آتا تھا اور زخموں کو صاف کر کے مرہم لگاتا اور پھائے رکھ کر باندھ دیتا تھا۔ جب وہ سلائی سے زخم صاف کرتا اور پیپ نکالتا تو ہم دیکھنے والے کانپ کانپ اُٹھتے تھے لیکن آفرین ہے ان پر، وہ ماتھے پر بل تک نہیں لاتے تھے۔ اور یہ تکلیف چند دن یا چند ہفتے نہیں بلکہ مسلسل کتنے مہینے تک رہی۔ وہ روزانہ نہایت اطمینان اور تحمل سے مرہم پٹی کرواتے رہے بلکہ پاس دیکھنے والوں کو حوصلہ دیتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان کے لئے اُٹھنا بیٹھنا محال تھا۔ چنانچہ دن رات بستر پر پڑے رہتے۔ بھوک پیاس بالکل ضائع ہو گئی تھی، کھانا گھر سے آتا تو وہ لیٹے

لیٹے ہاتھ دھو کر، دو چار لقمے حلق سے اُتار لیتے۔ رات کو نیند کم آتی تھی بلکہ اسے نیند کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ ایک غفلت کی سی کیفیت ہوتی تھی اور اگر کہیں خوش قسمتی سے پل بھر کے لیئے آنکھ لگ گئی تو کسی پھوڑے میں ٹیس اُٹھتی اور وہ بلبلا کے جاگ اُٹھتے۔ اسی طرح سوتے جاگتے رات گذر جاتی۔ اُٹھ نہیں سکتے تھے۔ کھڑے ہونے سے پنڈلیاں لرزنے لگتی تھیں۔ وہیں پلنگ کے پاس اوٹ میں حاجتی دھری تھی۔ ضرورت ہوئی تو کھسک پڑے اور پھر اسی طرح کھسکتے کھسکتے واپس پلنگ پر آکر پڑ گئے۔ مصیبت بالائے مصیبت، اسی دوران میں انھیں فتق کی شکایت بھی ہو گئی۔

اس تکلیف کے باوجود اس زمانے میں بھی، احباب کی فرمائشیں بدستور جاری تھیں۔ شاگرد اصلاح کے لئے کلام بھیجتے۔ دوست اور ملنے والے شوقیہ خطوط لکھتے وہ کسی کی دل شکنی نہ کرتے۔ سب کو لیٹے لیٹے جواب لکھتے۔ ایک دن فرمانے لگے۔ حیران ہوں کہ لوگ مجھے ابھی تک زندہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ میں مُردے سے بدتر ہوں۔ بہر حال یہ دونوں باتیں آدھی سچ ہیں اور آدھی جھوٹ۔ موت کی صورت میں نیم مُردہ ہوں اور زندگی کی حالت میں نیم زندہ۔ ؎

آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

نومبر کے آخر میں تندرستی اتنی عود کر آئی تھی کہ مرہم پٹی موقوف ہو گئی تھی لیکن اس لمبی بیماری کا یہ نشان رہ گیا کہ دونوں پاؤں کی دو دو اُنگلیاں مستقل طور پر اینٹھ کے موٹی اور ٹیڑھی ہو کر رہ گئیں۔ جوتا پہننے میں تکلیف ہوتی تھی اور زیادہ چل پھر بھی نہیں سکتے تھے۔ کمزوری کا تو ذکر ہی کیا! خود کہتے تھے کہ صاحب جسم میں جتنا خون تھا، وہ پیپ ہو کر نکل گیا۔ اب تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے وہ کھا کھا کر جیتا ہوں۔ کبھی اسے کھاتا ہوں، کبھی پیتا ہوں۔

۱۸۶۴ء میں نوروز کے دن سہ پہر کے وقت مزاج پرسی کو گیا۔ اندر صحن میں ایک دالان تھا، جہاں شام تک دھوپ رہتی تھی۔ یہیں پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ اب جاڑوں کے موسم میں ان کا یہ عام معمول تھا کہ کھانا کھاکے دھوپ میں

لیٹ جاتے اور جب تک ہوا میں سردی نہ محسوس ہونے لگتی وہیں پڑے رہتے۔ میں آداب عرض کرکے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

معلوم ہوا کہ ان کے برادر نسبتی میرزا علی بخش خاں فوت ہو گئے ہیں۔ وہ کتنے برس سے سلطان جی کے قریب کی بستی عرب سرائے میں رہتے تھے۔ مدت سے صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ وہیں پچھلی رات کو فجر کی نماز سے تھوڑی دیر پہلے جنت کو سدھارے۔ فرمانے لگے، مرحوم میرا بہت ہمدرد اور دلی یار تھا۔ مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں چلنے پھرنے سے معذور ہوں، ورنہ جنازے کے ساتھ جاتا۔ بھائی ضیاء الدین خاں گئے ہیں۔ کفن دفن کا سارا انتظام وہی کریں گے۔

اسی سلسلے میں ایک اور بات یاد آگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب علاؤ الدین احمد خاں اور میرزا علی بخش خاں میں آپس میں کچھ کشیدگی تھی۔ اگرچہ نواب صاحب نے مرحوم کی وفات پر دو تین مادہ ہائے تاریخ نکالے تھے لیکن نہ خود ہی انھیں نظم میں لکھا نہ کسی دوسرے کو یہ کام کرنے کی اجازت دی۔ بلکہ انھوں نے کسی مجلس میں مرحوم کے خلاف بعض ایسے کلمات کہے جن سے ان کی دلی رنجش کا اظہار ہوتا تھا۔ اس پر میرزا صاحب نے انھیں خط لکھا کہ میت کو نیکی سے یاد کرنا چاہیے۔ اب تمھارا اپنی عداوت کو ظاہر کرنا نامناسب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دوسرے عزیزوں کے دل ملول ہوں گے۔ بتاؤ اس سے بھلا تمھیں کیا حاصل ہوگا۔ پس اب خاموشی بہتر ہے۔

اسی سال (۱۸۴۶ء) عارف کے بڑے صاحبزادے باقر علی خاں کی شادی نواب ضیاء الدین خاں کی اکلوتی صاحبزادی معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم سے ہوئی۔ دولہا ۱۷۔ برس کے تھے اور دلہن ۱۲۔۱۳۔ برس کی۔ دونوں میرزا کے ہاتھوں میں پلے تھے اور انھیں اپنی اولاد کی طرح عزیز تھے۔ ایک دن کا لطیفہ مجھے آج تک یاد ہے۔

میں اس دن کسی کام سے صبح سویرے ہی میرزا صاحب کے پاس گیا تھا۔

وہاں باتوں میں دیر ہو گئی۔ اتنے میں گھر سے عنایت اللہ ملازم نے آکے اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے حکم ہو تو نکالا جائے۔ میرزا صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آؤ کھانا یہیں ہمارے ساتھ کھالو کہاں اب اتنی دور جاؤ گے۔ میں ان کی محبت کے پیش نظر انکار نہ کر سکا۔ چنانچہ انھوں نے عنایت سے کہا کہ بیگم صاحبہ سے کہو کر کھانا نکلوائیں۔ ہم دونوں آرہے ہیں۔ ادھر ملازم گیا ادھر ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ حد درجہ کمزور ہو گئے تھے۔ لکڑی کے سہارے بہت آہستہ آہستہ چلتے تھے۔ حالانکہ محل سرا دور نہ تھی۔ پچاس قدم کا فاصلہ نہیں ہوگا، لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے اُن کی سانس پھول گئی۔ بہر حال جب تھوڑا آرام کر لیا تو دستر خوان پر بیٹھے۔ نوکر نے ان کے سامنے ایک پیالہ گوشت کے شوربے کا رکھا۔ میں نے دیکھا کہ خلاف معمول کسی چیز میں بھی چنے کی دال نہیں۔ میرزا صاحب بھی اس پر بہت حیران ہوئے۔ پوچھا کیوں بھئی، دال گھر میں نہیں تھی تو بازار سے منگوالی ہوتی یا مجھ سے کہا ہوتا میں منگوا دیتا۔ بیگم صاحبہ دوسرے دالان میں بیٹھی تھیں، وہیں سے جواب دیا۔ نہیں دال تو گھر میں موجود ہے لیکن بہو، چنے کی دال نہیں کھاتی اس لیے کسی چیز میں نہیں ڈالی گئی۔ خدا دے ایسا موقع میرزا صاحب کو، جھٹ سے بولے۔ واہ پھر تو بہو خدا سے بھی بڑھ گئی۔ ارے چنا تو وہ چیز ہے کہ اس پر خود اللہ میاں کی رال ٹپک پڑی تھی اب اگر بہو چنے کی دال نہیں کھاتیں تو یہ گویا خدا سے بھی بڑھ گئیں۔ سب ہنسنے لگے۔ بیگم صاحبہ خفگی سے بولیں۔ بس انھیں تو باتیں بنانا آتی ہیں۔ بچاری بچی ہے۔ ہوا کیا اگر وہ ایک چیز پسند نہیں کرتی تو اس کی مرضی۔ ٹھیکہ تھوڑی ہے کہ جی چاہے نہ چاہے، ضرور کھائیے۔

زندگی کے آخری تین چار برس میں اُن کی تندرستی بہت خراب ہو گئی تھی۔ دن دن بھر پڑے رہتے تھے۔ کوئی تکلف کا ملنے والا آجاتا تو اُٹھ کے بیٹھ جاتے ورنہ سارا وقت چارپائی پر لیٹے رہتے۔ گرمیوں میں دن بھر کوٹھری میں گذر جاتی اور رات کو دو آدمی اُٹھا کر صحن میں لے آتے۔ جاڑوں میں دن کے وقت دھوپ میں لیٹے رہتے۔ رات کو سونے کا کمرہ خوب آگ سے گرم کروا لیتے تھے۔ خوراک

نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی صبح کی تبرید بدستور تھی۔ دوپہر کو صرف ایک پیالہ بھر گوشت کا پانی۔ بوٹی، روٹی، چاول، سب کچھ بالکل مفقود۔ سرِ شام تولہ دو تولہ بھر شراب اسی قدر گلاب میں ملا کر پیتے تھے اور بس۔ دوستوں کے خط آتے تھے۔ اُن کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں دن کٹ جاتا۔ خود زیادہ لکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ لکھتے تو انگلیاں اکڑ جاتیں اور درد کرنے لگتی تھیں۔ کوئی دوست آ جاتا تو اس سے خطوط کے جواب لکھوا لیتے تھے۔ آپ بولتے جاتے تھے اور وہ لکھتا جاتا تھا۔

جاننے والے جانتے تھے کہ اب یہ چراغِ سحری ہیں۔ ۱۴ر فروری ۱۸۶۹ء کو وہ حسب معمول لیٹے ہوئے تھے۔ اگرچہ کوئی خاص تکلیف نہیں تھی لیکن ایک نیم غشی کی کیفیت ضرور تھی۔ ہوش میں آئے تو کلّو نے پوچھا کہ حضور کھانا لاؤں۔ بولے آج ہم کھانا میرزا جیون بیگ کے ساتھ کھائیں گے، جاؤ اُسے بلا لاؤ (اس سے اشارہ باقر علی خاں کامل کی سب سے بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگ کی طرف تھا ——— انھیں میرزا پیارے مرزا جیون بیگ یا جنیا بیگم کہا کرتے تھے یہ اسوقت چار برس کی تھیں۔ کلّو انھیں بلانے کو محل سرا میں گیا۔ یہ سو رہی تھیں۔ بگا بیگم، ان کی والدہ نے کہا۔ ابھی کھیلتے کھیلتے سو گئی ہے۔ جونہی جاگتی ہے بھیجتی ہوں۔ کلّو نے آکے کہا کہ حضور وہ آرام کر رہی ہے۔ بیگم صاحبہ جگنے پر بھیج دیں گی۔ یہ سُن کر بولے اچھا تو جب وہ آئے گی، ہم اسی وقت کھانا کھائیں گے۔ اتنا کہہ کے تکیہ پر سر رکھا اور لیٹ گئے۔ لیٹنے کے ساتھ ہی بیہوش ہو گئے۔ فوراً حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں کو اطلاع کی گئی۔ دونوں صاحبوں نے رائے دی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ یہ خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جس جس نے سُنا دوڑا آیا۔ عیادت کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ آٹھ پہر اسی بیہوشی میں گذرے، نہ طبیبوں کی کچھ پیش گئی نہ کسی اور کی۔ نہ دوا کارگر ہوئی نہ دُعا۔ اور ہوتی بھی کیسے، ان کا وقت آن لگا تھا۔ اسی حالت میں اگلے دن ۱۵ر فروری کو دوپہر ڈھلے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی ———

حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

[اس مضمون کی ضمیر واحد متکلّم سے دھوکہ کھا کر نہ کسی کو میرا نسب نامہ طلب کرنے کی ضرورت ہے نہ میری تاریخ ولادت کے کھوج لگانے کی۔ بات یہ ہے کہ ایک مدّت سے میری یہ خواہش تھی کہ ایک ایسا مضمون لکھا جائے، جس سے میرزا کی روزمرّہ کی زندگی کا پہلو نمایاں ہو اور دکھایا جائے کہ وہ گھر کے اندر کیسے رہتے سہتے تھے، ان کی عام دلچسپیاں کیا تھیں، وہ دوستوں سے کیسے ملتے جلتے تھے۔ ان کے ماحول اور گرد و پیش کے بالمقابل ان کی شخصیت کا کیا رنگ تھا۔ ایسی باتیں عام طور پر تاریخ و ترجمہ کی کتابوں کے موضوع سے خارج سمجھی جاتی ہیں۔ اس کے لیے مسالے کی بھی کمی نہیں تھی۔ میرزا کی اپنی تحریروں ہی میں کافی معلومات موجود ہیں۔ لوہارو خاندان کے بعض بڑے بوڑھوں سے بھی مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ یادگار غالب میں بھی بعض اشارے ملتے ہیں۔ الجھن یہ تھی کہ اتنے لمبے عرصے کے حالات کو سمیٹا کیسے جائے۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ "حدیثِ دیگراں" کا بیانیہ انداز زیادہ دل نشیں رہے گا، چنانچہ یہی کیا گیا ہے۔

میں بادہ خوار نہیں، لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ محض اتنی سی بات پر آپ مجھے ولی بھی نہیں مان لیں گے اگر میں کہوں کہ یہ میرے کشوف ہیں تو عین ممکن ہے کہ آپ مجھے کسی ماہر طبیب سے مشورہ کرنے کی صلاح دینے لگیں لیکن ایمان سے کہیے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے، کیا آپ کے خیال میں یہ اتنا ہی مستبعد ہے کہ آپ اسے ماننے سے انکار کر دیں۔ مالک رام]

[نقوش غالب نمبر جنوری ۱۹۵۱ء]

غلام رسول مہر

غالب کی خاندانی پنشن

مرزا غالب کے خاندانی احوال اور ذاتی سوانح کا ہر گوشہ پوری طرح روشنی میں آچکا ہے اور اب ان میں سے کسی چیز کو معرضِ بحث و تحریر میں لانا مفید مشغلہ معلوم نہیں ہوتا لیکن اس سلسلہ میں بعض ایسی چیزیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن کو میرے محدود علم کے مطابق اب تک انتقاد کی میزان میں نہیں تولا گیا، اس لئے ان کی حقیقی حیثیت واضح نہیں ہو سکی۔ ان میں ایک مضمون مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کا ہے جو خواجہ بدر الدین عرف خواجہ امان کے متعلق اپریل ۱۹۳۱ء کے رسالہ "اردو" میں چھپا تھا۔

خواجہ امان مرزا غالب کے عزیزوں میں شمار ہوتے تھے اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کے مطابق ان کا اور مرزا غالب کا رشتہ دو تین پشت اوپر جا کر مل جاتا تھا اس لئے زیرِ غور مضمون میں مرزا کے اب وجد کا ذکر بھی آگیا، نیز خاندانی پنشن کا مسئلہ بالکل نئے رنگ میں پیش ہوا۔ مجھے خیال آیا کہ ان بیانات کی حیثیت کا اندازہ کر لینا چاہیے۔ اگر مرزا فرحت اللہ بیگ کے دعاوی درست ہیں تو مرزا غالب کے سوانح میں مناسب ترمیمات ضروری ہیں۔ اگر درست نہیں ہیں تو پھر ان کی نادرستی کے وجوہ سامنے آجانے چاہئیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ دورِ حاضر کے جلیل القدر اصحابِ تحریر میں سے تھے ان کے رشحاتِ قلم کو عام مضمون نگاروں کے بیانات کی طرح بآسانی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے ارشادات

میں نے مرزا فرحت اللہ بیگ کے

ارشادات کو سہولت بحث کی غرض سے دو حصّوں میں بانٹ لیا ہے۔ ایک حصہ خاندانی حالات کے متعلق اور دوسرا حصہ پنشن کے متعلق۔ خاندانی حالات کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ ذیل میں درج ہے:۔

۱۔ مرزا غالب اور خواجہ امان کے اجداد سمرقند سے بدخشاں آئے۔ اس وقت اس خاندان میں دو بھائی رہ گئے تھے۔ بڑے کا نام ترسم خاں اور چھوٹے کا نام رستم خاں تھا۔

۲۔ ترسم خاں کی شادی بدخشاں ہی کے ایک امیر کے ہاں ہو گئی۔ اُن کے ہاں تین اولادیں ہوئیں: دو لڑکے، نصر اللہ بیگ خاں اور عبداللہ بیگ خاں۔ اور ایک لڑکی۔

۳۔ اس خاندان کو ذرا فراغت نصیب ہو گئی تھی کہ ترسم خاں کا وقت آ لگا اور وہ بدخشاں ہی میں فوت ہو گئے۔ بھائی کے مرنے کا رستم خاں کو کچھ ایسا صدمہ ہوا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ پھرتے پھراتے بخارا پہنچے اور وہیں حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے خاندان میں شادی کر لی۔ اس شادی کی وجہ سے رستم خاں کے خاندان میں بہ لحاظ اعزاز، خواجگی کا خطاب آ گیا۔

۴۔ اس بیوی کے بطن سے صرف ایک لڑکا خواجہ قطب الدین خاں پیدا ہوا۔ رستم خاں کا انتقال ہو گیا۔ ننھیال میں قطب الدین کی پرورش ہوئی۔ جوان ہو کر شادی کی۔ اُن کا لڑکا حاجی خاں تھا۔

۵۔ خواجہ حاجی خاں پوری طرح جوان نہیں ہوا تھا کہ اُس کے والدین بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جب یہ خبر اُن کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کو پہنچی تو وہ اپنے بھائی عبداللہ بیگ خاں کے ساتھ بدخشاں سے بخارا گئے۔ کچھ دنوں بھتیجے کے پاس رہے پھر ہندوستان میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ بدخشاں سے برلاس قوم کے ایک امیر زادے مرزا جیون بیگ سبزپوش بھی ساتھ ہو گئے۔

۶۔ پہلے یہ قافلہ اٹک میں ٹھہرا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک یہ لوگ لاہور میں

رہے۔ پھر دہلی پہنچے۔ اس زمانے میں شاہ عالم ثانی دہلی کا بادشاہ اور ذوالفقار الدولہ نجف خاں سلطنت کا وزیر تھا۔

۷۔ ان سب نے ملازمت کرلی۔ پرگنہ پہاسو مدد خرچ کے لئے ملا۔ پھر کسی بات پر نواب سے ٹھن گئی اور یہ نوکری چھوڑ کر اکبر آباد چلے گئے۔

۸۔ اکبر آباد پہنچ کر مادھوجی سندھیا والی گوالیار کے نوکر ہو گئے۔ نصر اللہ بیگ خاں کمانڈر۔ خواجہ حاجی خاں رسالدار۔ اور مرزا جون بیگ پلٹن کے کپتان۔

۹۔ پھر مرہٹوں نے شکست کھائی۔ نجف خاں سے نصر اللہ بیگ خاں اور اس کے ساتھیوں کی صلح ہو گئی اور اول الذکر کی شادی نواب احمد بخش خاں کی ہمشیر سے ہوئی۔

۱۰۔ عبد اللہ بیگ خاں مذہبی آدمی تھے۔ پھر اچانک گھر بار چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے اور آصف الدولہ کے ہاں ملازم رہے۔ بعد میں حیدر آباد چلے گئے۔ واپس آ کر راجہ بختاور سنگھ والیٔ الور کی ملازمت میں گڑھی کے محاصرے میں کام آئے اور راج گڑھ میں سپرد خاک ہوئے۔

غور طلب امور ظاہر ہے کہ اگر ان ارشادات کو درست سمجھا جائے تو مرزا غالبؔ کے ان بیانات کو غلط ماننا پڑے گا کہ ان کا دادا پہلے پہل ہندوستان آیا یا اُن کے والد دہلی میں پیدا ہوئے یا نصر اللہ بیگ خاں اُن کے چچا نہیں بلکہ تایا تھے۔

ہمیں یہاں مرزا غالبؔ کے پشنگی افراسیابی اور سلجوقی ہونے کے متعلق بحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ مرزا کا عقیدہ یہ تھا، اس میں کلام نہیں۔ انھوں نے اپنے خاندان کے متعلق یہی سنا ہوگا۔ لیکن محققین کے متعلق تو یہ بھی ثابت شدہ بات نہیں کہ سلجوقی سلاطین انہی تورانیوں کی نسل تھے جن کی سطوت و شوکت کا افسانہ فردوسی نے شاہنامہ میں سنایا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ نسب نامہ اس وقت بنایا گیا جب سلطان سنجر سلجوقی نے بغداد کے عباسی خلیفہ کی صاحبزادی سے نکاح کی خواہش

کی تھی اور مقصد یہ تھا کہ سلجوقی خاندان کو قدیم و باجبروت تاجداروں کا خاندان دکھلایا جائے۔

ترسم خاں اور رستم خاں کے حقیقی بھائی ہونے کا مسئلہ طے کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی مستند ذخیرہ معلومات موجود نہیں۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ نصر اللہ بیگ خاں اور عبداللہ بیگ خاں ترسم خاں کے بیٹے تھے اور بدخشاں میں پیدا ہوئے تو کئی ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا۔

لاینحل اُلجھنیں

مثال کے طور پر مندرجہ ذیل باتیں پیشِ نظر لائیے:۔

۱۔ رستم خاں بھائی کی وفات سے اس درجہ متاثر و متالم ہوا کہ بدخشاں کی سکونت ترک کرنے کے سوا اطمینان کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ لیکن اسے یہ خیال نہ آیا کہ کم سن اور یتیم بچوں کا نگراں کون ہوگا؟

۲۔ بخارا پہنچ کر اُس نے شادی کی جس سے ایک بچہ پیدا ہوا اور رستم خاں فوت ہوگیا۔ پھر اس بچے نے جوان ہو کر شادی کی اور اس کے بیٹے خواجہ حاجی نے عالمِ وجود میں قدم رکھا۔ وہ جوانی کے قریب پہنچا تو اس کے باپ رستم خاں کے اکلوتے فرزند کا بھی انتقال ہوگیا۔ اگر یہ ساری مدت تیس برس بھی فرض کی جائے اور سمجھا جائے کہ رستم خاں کی علیحدگی کے وقت نصر اللہ بیگ خاں اور عبداللہ بیگ خاں علی الترتیب چار سال اور دو سال کے تھے۔ تو خواجہ حاجی کے باپ کی وفات کے وقت اُن کی عمریں چونتیس اور بتیس برس کی ہونی چاہئیں۔

۳۔ پھر وہ لوگ بدخشاں سے بخارا گئے۔ خواجہ حاجی کو ساتھ لے کر ہندوستان کا قصد کیا۔ پہلے اٹک بعد ازاں لاہور ٹھہرے۔ اس وقت میر معین الملک عرف میر منّو پنجاب کا گورنر تھا۔ جس نے اخیر ۱۷۵۳ء میں وفات پائی۔ گویا نصر اللہ بیگ اور عبداللہ بیگ کی ولادت ۱۷۱۴ء، ۱۷۱۶ء کے لگ بھگ ہوئی۔

۴۔ ۱۷۷۱ء کے بعد وہ دہلی پہنچ کر نجف خاں سے وابستہ ہوئے۔ جو ۱۷۸۲ء میں فوت ہوا۔ غرض میرزا غالب کی شادی جب اکبر آباد میں ہوئی تو ان کی عمر کم و بیش تیرہ برس

کی ہوگی۔ اور غالبؔ کی ولادت کے وقت انھیں کم ازکم اسّی برس کا ماننا پڑے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون ان بدیہی نتائج کو مستحق قبول اور شایان تسلیم سمجھے گا؟

مرزا غالبؔ کے بیانات

اس کے برعکس مرزا غالبؔ کے بیانات بالکل واضح غیر مشتبہ اور ہر لحاظ سے قابلِ یقین ہیں۔

۱۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا دادا ہندوستان آیا تھا۔ یہ بھی بتلاتے ہیں کہ باپ سے ناراض ہوکر آیا تھا۔ اُن کے الفاظ ہیں: "از پدر خود رنجیدہ آہنگ ہند کرد" اگر اس کا نام ترسم خاں تھا تو وہ مرزا کے دادا کی آمد کے وقت تک زندہ تھا۔

۲۔ خود مرزا کے بیان کے مطابق اُن کے دادا کا نام قوقان بیگ تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ: "دادا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے (نہ کہ بخارا یا بدخشاں سے) دہلی آیا۔ پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے پادشاہ کا نوکر ہوا۔ پہاسو کا پرگنہ جو سمرو بیگم کی سرکار سے ملا ہوا تھا وہ اس کی جایداد مقرر ہوا۔"

۳۔ پھر خواجہ حالی مرحوم کا بیان ہے کہ غالبؔ کے دادا کی زبان ترکی تھی اور ان کی دو نہیں متعدد اولادیں تھیں۔ مرزا غالبؔ کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے والد کے تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔

۴۔ مرزا کا بیان ہے کہ اُن کے والد دہلی میں پیدا ہوئے: "پدرم عبداللہ بیگ خاں بہ شاہجہاں آباد بوجود آمد و من بہ اکبر آباد۔"

یہی بیانات معیارِ صحت پر پورے اُترتے ہیں۔ چونکہ والد کی وفات کے وقت مرزا کی عمر زیادہ سے زیادہ چار برس کی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی دو برس کے تھے اور بہن آٹھ دس برس کی ہوگی۔ اس لئے قیاس یہی ہے کہ عبداللہ بیگ جوانی کے عالم میں فوت ہوئے۔

اب اس امر پر غور کیجیے کہ نصراللہ بیگ، عبداللہ بیگ خاں سے بڑے تھے یا چھوٹے، تو اس بارے میں بھی ابتدا سے کبھی کوئی اختلاف نہیں کیا گیا۔ سب نصراللہ بیگ خاں کو مرزا کا تایا نہیں چچا ہی سمجھتے رہے اور خود مرزا نے بھی لکھا ہے کہ "کما مِش

پنج سال بعد گزشتن برادر، پے، مہیں برادر برداشت و مرا دریں خرابہ تنہا گذاشت "

خواجہ حاجی کا معاملہ اب صرف ایک بات رہ جاتی ہے کہ آیا خواجہ حاجی خاں اور مرزا غالب کا خاندان ایک تھا؟ اگر خواجہ حاجی خاں رستم خاں کا پوتا تھا تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ رستم خاں، ترسم خاں کا بھائی نہ تھا۔ وہ مرزا قوقان بیگ خاں کا بھائی ہوگا۔ اگر ترسم خاں اور رستم خاں ناموں کے ہم صورت ہونے کے باعث بھائی فرض کئے جائیں تو خواجہ حاجی کے سلسلۂ نسب میں کم از کم ایک کڑی کا اضافہ ضروری ہے۔

نیز سمجھ لینا چاہیئے کہ خواجہ حاجی، مرزا غالب کے دادا کے ساتھ ہندوستان نہیں آیا تھا بلکہ کم از کم چالیس برس کی عمر کے بعد آیا۔

ہمیں اوپر کے سلسلۂ نسب کے متعلق یقینی معلومات حاصل نہیں ہے۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ مرزا غالب کی ہمشیر کی شادی مرزا جیون بیگ برلاس کے فرزند، مرزا اکبر بیگ سے ہوئی۔ اور مرزا جیون بیگ کی صاحبزادی امیر النساء بیگم خواجہ حاجی سے بیاہی گئی۔ اس طرح مرزا غالب، مرزا جیون بیگ اور خواجہ حاجی کے خاندانوں میں رشتہ پیدا ہو گیا۔ اس سے پیشتر کے تعلق کا ہمارے سامنے کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں۔ میرا خیال ہے کہ مرزا غالب کی ہمشیر نصراللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد بیاہی گئی۔ جبکہ اس خاندان کا دور ریاست و جاگیرداری ختم ہو چکا تھا اور وہ محض وظیفہ خوار رہ گیا تھا۔

خواجہ حاجی کون تھا؟ مرزا غالب کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ خواجہ حاجی کے ساتھ کوئی قریبی خاندانی تعلق پہلے سے موجود نہ تھا۔

وہ لکھتے ہیں :-

۱۔ خواجہ حاجی پسر باگیر (سائیس)، جدمن و پسرانش از دو پشت خانہ زاد و از سہ پشت نمک خوارمن۔

۲۔ فلاں بیگ (اشارہ ہے مرزا افضل بیگ ابن مرزا جیون بیگ کی طرف

جو شاہ دہلی کی طرف سے کلکتہ میں وکیل تھے اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کے مطابق انھیں مقرب الدولہ، معزز الملک دلاور جنگ کے خطابات حاصل تھے) وشوہر خواہرش (خواجہ حاجی) ہر دو در رسالہ، نصر اللہ بیگ بے چارہ نوکر بودند۔ اینہا از سر پشت نمک پروردۂ آبائے من اند وآں کافر غدار (خواجہ حاجی) پس از مردن عم من پراگندہ، چندراکہ فلاں بیگ از آناں بود با خود گرد کردہ نقد و جنس واسپ وفیل و خیمہ وخرگاہ عم مرا پاک خورد۔

۳۔ حاجی فلاں بہ خاندان نصر اللہ بیگ آں کردہ است کہ یزید بہ آل رسولؐ۔ تنہا من نے گویم۔ عالمے گواہ ایں دعویٰ است۔ از دہلی تا اکبر آباد صد ہزار کس دریں جزو زماں موجود اند کہ می دانند آنچہ کہ من می گویم۔

۴۔ خواجہ حاجی را، خواجہ حاجی "خاں"، مرحوم بہ کدام ہنسک وکدام علاقہ تواں گفت، احمد بخش خاں باآں کہ برائے خواجہ حاجی پدری کرد وادرا از ناکسی بہ کسی رسانید، پیوستہ خواجہ حاجی نبشت وخواجہ حاجی گفت۔

حقیقت کا سراغ ان بیانات میں خاصی تلخی پائی جاتی ہے۔ جو مقدمے کی کشمکش کے باعث پیدا ہوئی۔ لیکن خواجہ حاجی اور مرزا غالبؔ کا نسبی تعلق ثابت ہونے کے بجائے، زیادہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ جوشِ عداوت مسلّم مان لینے کے باوجود یہ بات قیاس میں نہیں آسکتی کہ مرزا نے دانستہ خاندان کے قدیمی رشتے کو یوں بے تکلفی سے نظر انداز کر دیا ہو۔ ان میں سے آخری بیان (۴) اس خط سے ماخوذ ہے جو مرزا احمد بیگ خاں تپاںؔ کو لکھا گیا تھا اور وہ نواب احمد بخش مرحوم کے نسبتی بھائی، یعنی ابین الدولہ احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کے ماموں تھے۔ چونکہ نواب احمد بخش خاں کے ہم خاندان تھے۔ اس لئے مرزا غالبؔ اور خواجہ حاجی کے خاندانی حالات سے پوری طرح واقف ہوں گے۔ یقین نہیں آسکتا کہ مرزا غالبؔ نے ان کی زبان سے اپنے ایک ہم جد کے نام کے ساتھ "خاں"، کا لفظ سن کر بے وجہ تردید کی جرأت کی ہو —— ان حالات میں میرا اندازہ یہی ہے کہ خواجہ حاجی اور

مرزا غالب کا خاندان ایک نہ تھا یا اگر ان میں کوئی تعلق ہوگا تو بعید سا ہوگا۔ البتہ یہ درست ہے کہ جب جھگڑے مٹ گئے، پنشن کے مقدمہ کا فیصلہ مرزا غالب کے خلاف صادر ہوگیا تو خواجہ حاجی کے بیٹے بدرالدین امان کے ساتھ ربط وضبط نئے سرے سے پیدا ہوگیا اور مرزا انھیں اپنا بھتیجا کہنے لگے۔

پنشن کا معاملہ پنشن کے سلسلہ میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ :۔

۱۔ بھرت پور سے صلح کے بعد اپریل ۱۸۰۵ء کو جدید بھرتی کی ہوئی فوج توڑ دی گئی۔ اس میں مرزا نصراللہ بیگ خاں کی فوج بھی موقوف ہوگئی لیکن مرزا اور اُن کے خاندان والوں کو جن میں خواجہ حاجی بھی شامل تھا پانچ ہزار روپیہ سالانہ کے دو پرگنے سونک سونا (کذا فی الاصل) اور پونا ہانہ مضافات ہوڈل تحصیل فیروز پور جھرکہ میں بطور جاگیر عطا ہوئے۔

۲۔ ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں نصراللہ بیگ خاں نے وفات پائی۔ اُن کے بعد خواجہ حاجی نے جو خاندان میں سب سے بڑے تھے جاگیر کا دعویٰ کیا۔ نواب احمد بخش خاں نے شہادت دی۔ اور جاگیر اس شرط پر خواجہ حاجی کے نام بحال ہوئی کہ نصراللہ خاں کے پس ماندوں کی پرورش بھی کی جائے۔

۳۔ نواب احمد بخش خاں نے خواجہ حاجی سے کہا کہ آپ کا علاقہ میرے علاقے سے ملا ہوا ہے اور آپ کو مال گزاری وصول کرنے میں مشکلیں پیش آتی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ علاقہ میرے سپرد کردو، میں اس کی آمدنی پہنچا دیا کروں گا۔

۴۔ قرار پایا ہے کہ اِن پرگنوں کی آمدنی میں سے تین ہزار روپے سالانہ مرزا نصراللہ بیگ کے پس ماندوں کو اور دو ہزار روپے سالانہ خواجہ حاجی خاں کو ملیں۔

۵۔ خواجہ حاجی کا انتقال ۱۸۲۶ء میں ہوا۔ ان کی معاش اُن کے بیٹوں خواجہ جان اور خواجہ امان کو ملی۔ مرزا غالب کو خیال پیدا ہوا کہ سرکار نے جو پرگنے دیئے تھے وہ دس ہزار سالانہ کے تھے اور صرف ان کے چچا نصراللہ بیگ کو دیئے گئے

تھے۔ اُنھوں نے اپنی طرف سے اپنے دونوں بھتیجوں (خواجہ جان اور خواجہ امان) پر دعویٰ دائر کر دیا۔

۶۔ کول بروک ریزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب سکریٹری گورنمنٹ انگریزی نے مرزا غالبؔ کے موافق رپورٹ کی لیکن گورنر جنرل نے یہ تصفیہ کیا کہ یہ سند سرجان میلکم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے جو اس زمانے میں لارڈ لیک کے سکریٹری تھا اور اسکے متعلق نواب احمد بخش خاں کی شہادت ہونی ضرور ہے۔ چنانچہ نواب کی شہادت ہوئی اور فیصلہ مرزا غالبؔ کے خلاف ہوا۔

۷۔ نواب احمد بخش کی وفات پر اُن کے فرزند نواب شمس الدین احمد خاں کو بر سلسلۂ قتل فریزر پھانسی کی سزا ملی۔ اور ریاست ضبط ہوگئی تو خواجہ جان اور خواجہ امان کے نام پچاس پچاس روپیہ ماہانہ اور اُن کی والدہ کے نام بیس روپے ماہانہ کا وظیفہ جاری ہوا۔

اصلیت کیا تھی؟

لیکن یہ پوری داستان معلوم و مسلم واقعات کے سراسر خلاف ہے، مثلاً:۔ ۱۔ نصر اللہ بیگ خاں کو سونکھ (SONEKH) اور سونسا (SONSA) جاگیر میں ملے تھے۔ اور اُن کی آمدنی مرزا غالبؔ کے قول کے مطابق لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی تھی۔ جب انگریزوں نے ۱۸۰۳ء میں ضلع متھرا پر قبضہ کیا تو سونسا جنرل پیرون (PERRON) کی جاگیر میں تھا جو سندھیا کی فوج میں ملازم تھا۔ اس وقت صرف سونسا کی آمدنی کا اندازہ بیس ہزار روپے تھا (ملاحظہ ہو متھرا گزیٹیر مطبوعہ ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۰۶)

۲۔ سونکھ اور سونسا تحصیل متھرا میں بھرت پور کی ریاست سے متصل واقع ہیں متھرا سے ایک سڑک دیگ کو اور دوسری بھرت پور کو جاتی ہے۔ ان دونوں سڑکوں کے درمیان یہ پرگنے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں فیروز پور جھرکہ سے متصل کیوں کر مانا جائے؟۔

۳۔ پونا ہانہ نواب احمد بخش خاں کی جاگیر میں شامل تھا جیسا کہ اس جاگیر کے

کاغذات سے ظاہر ہوتا ہے۔ ضلع گوڑگاؤں کے گزیٹیر (صفحہ ۲۴) میں بھی یہی مرقوم ہے اس کے علاوہ نواب احمد بخش خاں کو سانگرس، پھور اور نگینہ کے پرگنے دیئے گئے تھے۔

۴۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ نواب فیروز پور جھر کہ اور سانگرس کے لئے سالانہ پانچ ہزار، پونا ہانہ، پھور اور نگینہ کے لئے سالانہ بیس ہزار سرکار انگلشیہ کو دیا کریں۔

۵۔ نصراللہ بیگ کے انتقال کے ساتھ ہی سونکھ سونسا کی جاگیر انگریزوں نے سنبھال لی۔ ۴ر مئی ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک نے نواب احمد بخش خاں کے پچیس ہزار روپے اس شرط پر معاف کر دیئے کہ وہ دس ہزار روپے سالانہ نصراللہ بیگ کے پسماندوں کو دیں، مرحوم کے رسالے کے پچاس سواروں کو جن کا افسر خواجہ حاجی تھا اپنے انتظام میں لے لیں اور قیامِ امن کے لئے، حکومت سے کوئی امداد نہ مانگیں۔

۶۔ ایک مہینہ تین دن بعد یعنی ۷ر جون ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے ایک اور حکم حاصل کر لیا جس کا مضمون یہ تھا کہ پانچ ہزار روپے سالانہ نصراللہ بیگ کے پس ماندوں کو دیئے جائیں اور ان میں خواجہ حاجی بھی شامل ہوگا۔

مرزا غالب کا دعویٰ

نصراللہ بیگ خاں کا انتقال یقیناً ۴ر مئی ۱۸۰۶ء سے پہلے ہوا۔ خواجہ حاجی اگر اس مرحوم کی جاگیر کا دعوےٰ کر سکتا تھا تو سونکھ اور سونسا کے لئے کر سکتا تھا جو نواب احمد بخش خاں کی جاگیر سے متصل نہ تھی لیکن ایسا کوئی دعویٰ ہمارے سامنے نہیں۔ ۴ر مئی ۱۸۰۶ء اور ۷ر جون ۱۸۰۶ء کے درمیان اگر کوئی دعویٰ پیش ہوا تو اس کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ ۴ر مئی والے حکم میں نصراللہ بیگ کے پس ماندوں کے لئے دس ہزار روپے مقرر ہوئے تھے۔ اور خواجہ حاجی کے پچاس سواروں کو نواب سے متعلق کر دیا گیا تھا۔ ۷ر جون کے حکم کی رُو سے دس ہزار کی رقم گھٹا کر آدھی کر دی گئی

اور خواجہ حاجی کو نصر اللہ بیگ کے متعلقین میں شامل کر دیا گیا۔

۱۸۲۶ء میں خواجہ حاجی کا انتقال ہوا۔ فیروز پور جھرکہ کی ریاست نواب احمد بخش خاں نے اپنے فرزند شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر دی اور خود قطب صاحب میں اپنے مرشد حضرت مولانا فخر الدین فخرِ عالم کے مزار کے پاس مشغول ذکر و عبادت ہو گئے۔ اس وقت مرزا غالبؔ کو پنشن کے لئے مقدمے کا خیال آیا اور وہ دہلی سے کلکتہ گئے۔ راستے ہی میں تھے کہ نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد مقدمہ کلکتہ میں دائر ہوا اور مدعا علیہ والیٔ فیروز پور تھا۔ خواجہ حاجی کے بیٹوں پر نہ دعویٰ کیا گیا اور نہ ان سے مرزا غالبؔ کو براہِ راست سروکار تھا۔ دعویٰ یہ تھا کہ والیٔ فیروز پور نے پہلے منظور شدہ حکم کے خلاف پنشن کی رقم آدھی کر دی پھر اس آدھی میں خواجہ حاجی کو شامل کر لیا۔ ان دونوں باتوں کا ذمہ دار والیٔ فیروز پور تھا نہ کہ خواجہ حاجی یا اس کے فرزند۔

گواہوں کا معاملہ اس سلسلے میں احمد بخش خاں سے شہادت لینے کا معاملہ ناقابلِ فہم ہے۔ جب تک وہ زندہ تھا مقدمہ پیش ہی نہیں ہوا تھا اور جب مقدمہ پیش ہوا، گواہوں کی ضرورت پڑی اس وقت تک نواب احمد بخش جوارِ رحمت الٰہی میں پہنچ چکے تھے۔

کول بروک نے مرزا غالبؔ کے حق میں رپورٹ کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ بلا کا رشوت خور تھا۔ اور مقدمہ پیش ہونے سے پہلے ہی موقوف ہو گیا۔ اینڈریو اسٹرلنگ مرزا کے حق میں رپورٹ کرنے سے بیشتر فوت ہو گیا۔ سرجان میلکم سے صرف یہ پوچھا گیا تھا کہ، ۷ جون ۱۸۰۶ء والا حکم، جسے مرزا غالبؔ جعلی قرار دے رہے تھے، لارڈ لیک کے مُہر و دستخط سے جاری ہوا یا نہیں؟ میلکم نے گواہی دی کہ اس پر مہر اور دستخط لارڈ لیک کے ہیں۔ گویا حکم جعلی نہیں لیکن مرزا غالبؔ کے دعوے کی بناء محض یہ تھی کہ یہ حکم جعلی ہے بلکہ اصل بناء یہ تھی کہ پہلا حکم (دس ہزار والا) سرکار کی منظوری سے جاری ہوا اور اس کی نقل دفتر میں موجود ہے۔ لیکن ۷ جون والا حکم نہ سرکار کی منظوری

سے جاری ہوا نہ اسکی نقل دفتر میں موجود ہے۔ لہٰذا اسے منسوخ کیا جائے، آئندہ دس ہزار روپے سالانہ ملا کریں اور مئی ۱۸۰۶ء سے لیکر جتنی رقم کم ادا ہوئی وہ یک مشت دی جائے۔

مزید سوالات

پھر اس سلسلہ میں بعض اور باتیں بھی غور طلب ہیں۔ اگر نصر اللہ بیگ کے انتقال کے بعد خواجہ حاجی خاندان میں سب سے بڑا رہ گیا تھا اور مزعوم جاگیر اس کے نام بحال ہوئی تھی۔ تو کیا وجہ ہے کہ پانچ ہزار میں سے اس نے صرف دو ہزار لئے اور تین ہزار نصر اللہ بیگ خاں کے پس ماندوں کو دیئے؟ اگر وہ واقعی خاندان کا سرخیل اور اس وجہ سے جاگیر اپنے نام بحال کرانے کا حقدار تھا تو یا تو پوری رقم خود لے کر سارے خاندان کے افراد و طبقات کے گزارے کا ذمہ اٹھاتا یا بڑا حصہ خود لیتا اور کمتر دوسروں کے حوالے کرتا۔

نیز کیا وجہ ہے کہ اس کی وفات پر دو ہزار روپے اس کے پس ماندوں کو نہ ملے اور صرف ایک سو بیس روپے اس کے دو بیٹوں اور بیوی کو دیئے گئے؟ اگر اصل جاگیر اس کے نام تھی تو محض اُسی کے حصہ میں کیوں ایک دم ایک ہزار آٹھ سو اسّی کی کمی ہو گئی۔ جب کہ نصر اللہ بیگ کے حقیقی متعلقین کی رقم بدستور باقی رہی؟

بہر حال واقعہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ حاجی کو مرزا کے ہم جد ہونے پر بھی نصر اللہ بیگ کے پس ماندوں میں شامل کرنا غلط تھا۔ اسے دو ہزار روپے صرف اس وقت تک ملتے رہے جب تک پچاس سوار نواب احمد بخش خاں کی ملازمت میں تھے۔ جب وہ فوت ہوا، سوار الگ ہوئے، تو تنخواہ بھی جاتی رہی۔ نصر اللہ بیگ کے حقیقی پس ماندوں کا وظیفہ کسی خدمت پر موقوف نہ تھا اس لئے، اس میں کوئی قطع و برید نہ ہوئی۔

مخالفوں کا زور و اثر

بلا شبہہ نواب احمد بخش خاں مرحوم نے مرزا غالب کے خاندانی وظیفہ میں کمی کرائی۔ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کیا کچھ کہہ کر لارڈ لیک سے دوسرا حکم جاری کرایا اور کس بنا پر خواجہ حاجی کو نصر اللہ بیگ کے متعلقین میں شامل کیا؟

یہ بھی حقیقت ہے کہ نواب شمس الدین احمد خاں مرزا غالب کے مقابلے میں بدرجہا
زیادہ ذی وسائل تھے۔ وہ انگریز ریزیڈنٹوں پر اثر ڈال سکتے تھے۔ مرزا افضل بیگ
کلکتہ میں شاہ دہلی کا وکیل تھا۔ اور نواب شمس الدین خاں کے لئے نہیں لیکن اپنے
بھانجوں (ابنا، خواجہ حاجی) کے لئے تمام ممکن تدبیریں کرتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ
ایک مرتبہ مرزا غالب کے خلاف "جام جہاں نما" (کلکتہ) میں کوئی تحریر شائع کرادی۔
چنانچہ مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"امروز تازہ حالے بمشاہدۂ اوراق "جام جہاں نما"
روئے دادہ کہ جز بر آں بے آبروئی نتوانستم کرد۔ غالب کہ
شما ہم در آں اوراق نگرستہ باشید۔ واللہ، باللہ، ثم تاللہ،
آنچہ از حالِ من مسکیں در آں ورق مندراج است ہمہ کذب و
بہتان و گزاف است۔"

صرف طلب حق

مرزا نے مقدمہ اس لئے دائر کیا تھا کہ اپنا حق حاصل کریں
اور وہ ضرورت مند بھی تھے چنانچہ خود لکھتے ہیں:۔

"من مرد حق جوئے حق پرستم۔ راست ے گویم۔ وحق می
جویم۔ نہ عدوئے شمس الدین خاں صاحبم و نہ دشمن خواجہ حاجی
و پسرانش، شمس الدین خاں برادر زن من است و خواجہ
حاجی پسر بارگیر جدِ من و پسرانش از دو پشت خانہ زاد و
از سہ پشت نمک خوار من۔ از احمد بخش خاں کہ برادر زن
عم من (نصر اللہ بیگ) و برادر پدر زن من (الٰہی بخش
خاں معروف) بود، دو شکایت داشتم و دارم: یکے
تقلیل مقدار وجہ پرورش بے وقوع جرم و گناہ، دوم شمول
خواجہ حاجی بے ثبوت وجہ استحقاق۔"

ان امور میں شبہہ کی قطعاً گنجائش نہیں اور مرزا فرحت اللہ بیگ نے

غالب کے خاندانی حالات، پنشن کے معاملات میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ میرے
نزدیک نہ درست ہے اور نہ قابلِ قبول۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[۲۰ر مارچ ۱۹۴۹ء]

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

روئداد مقدمۂ مرزا غالب

[غدر کے بعد دتی میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور کوئی دل بہلانے کا سامان نہ تھا، مرزا نے فارسی لغت کی مشہور کتاب "برہان قاطع" کو دیکھنا شروع کیا، اس کے مؤلف محمد حسین کے اجداد تبریز سے آئے تھے اور اگرچہ وہ خود ہندوستان میں پیدا ہوئے اور ساری عمر دکن میں رہے مگر "تبریزی" کہلاتے تھے۔

مرزا کو اس کتاب میں غلطیاں نظر آئیں، جنھیں انھوں نے ایک مختصر کتاب کی صورت میں مرتب کیا اور اس کا نام "قاطع برہان" رکھا۔ چناں چہ ایک خط میں صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:-

"اس درماندگی کے دنوں میں ......" برہان قاطع" میرے
پاس تھی اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط، ہزارہا
بیان لغو، عبارت پوچ، اشارات پادرہوا۔ میں نے
سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے
اور "قاطع برہان" اس کا نام رکھا ہے۔

یہ کتاب بہ قول مولانا حالی ۱۸۶۰ء (۱۲۷۶ھ) میں پہلی بار، اور ۱۸۶۱ء (۱۲۷۷ھ) میں بہ اضافۂ دیگر مضامین و فوائد "درفش کاویانی" کے نام سے دوبارہ چھپی۔

اس پر مرزا کی بڑی مخالفت ہوئی اور جواب میں "محرق قاطع"، "ساطع برہان"، "قاطع قاطع" اور "مؤید برہان" کتابیں لکھی گئیں۔

"ساطع برہان" کے جواب میں "نامۂ غالب" اور "مؤید برہان" کے جواب

میں "تیغ تیز" خود مرزا نے دو رسالے لکھے، اور "محرق قاطع" کے جواب میں "دافع ہذیان" "لطائف غیبی" اور "سوالات عبد الکریم" تین رسالے مرزا کے دوستوں نے شائع کیے، مگر "قاطع قاطع" کا جواب نہ خود مرزا نے لکھا اور نہ کسی اور نے۔

خواجہ حالی نے اس سے متعلق "یادگار غالب" میں ایک لطیفہ لکھا ہے، فرماتے ہیں :۔

"مولوی امین الدین کی کتاب 'قاطع قاطع' کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا کیونکہ اس میں فحش اور ناشایستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا "حضرت! آپ نے اسکا جواب نہیں لکھا"؟ مرزا نے کہا "اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے؟"

"تیغ تیز" میں بھی مرزا نے لکھا ہے کہ ایسے ادنیٰ درجے کے آدمی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا میری شان کے خلاف ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر وہ اس خیال پر قائم نہ رہے، بلکہ انھوں نے مولوی امین الدین پر "ازالۂ حیثیت عرفی" کی نالش کر دی اور ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کو عرضی دعویٰ داخل عدالت کر دیا۔ خواجہ حالی اس مقدمے کے متعلق "یادگار غالب" میں لکھتے ہیں :۔

"مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مؤلف پر جو "قاطع برہان" کے جواب میں لکھا گیا تھا اور فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی تھی مگر جب کامیابی کی اُمید نہ رہی تو آخر کار انھوں نے راضی نامہ داخل کر دیا اثنائے تحقیقات میں دلی کے بعض اہلِ علم عدالت میں اس بات کے استفسار کیلئے بلائے گئے، تھے کہ جو فقرے مدعی نے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے ہیں آیا فی الواقع فحش و دشنام

مفہوم ہوتا ہے، یا نہیں؟ انھوں نے غریب ملزم کو سزا
سے بچانے کے لیے ان فقروں کے ایسے معنی بیان
کیے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نہ ہو۔ ان مولوی
کا مرزا سے ملنا جلنا تھا، کسی نے پوچھا حضرت! انھوں
نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی؟ مرزا نے اپنا
فارسی کا یہ شعر پڑھا:۔

بہ ہر چہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست
عیار بے کسئ من شرافت نسبی است

اس مقدمے کی پوری مسل کی نقل اب اتفاق سے ہمیں دستیاب ہو گئی ہے
اور ذیل میں تمام و کمال شائع کی جا رہی ہے۔ اس کے مطالعے سے اس مقدمے
کے تمام حالات بہ خوبی واضح ہو جاتے ہیں۔ اس مقدمے کے دوران میں
مولوی ضیاء الدین کی پیشی کے وقت کسی نے حاکم عدالت کے کان میں
کہہ دیا کہ "یہ بڑے معزز آدمی ہیں انھیں کرسی ملنی چاہیے" چناں چہ ایسا ہی
ہوا۔ اس زمانے میں دہلی سے جو انگریزی اخبار "مفصلائٹ" نکلتا تھا
اس میں ۱۲ مارچ ۱۸۶۸ء کو ایک خط چھپا تھا، جس کا مکتوب نگار بڑے
تعجب سے لکھتا ہے:۔

"میں سخت حیران و پریشان ہوں کہ اسسٹنٹ کمشنر
نے مولوی ضیاء الدین کو کس بنا پر کرسی دی اس
رعایت سے غالب کے ساتھ ناانصافی ہوئی۔ وہ
سوسائٹی میں نہایت معزز ہیں، لفٹنٹ گورنر کے
دربار میں انھیں مولوی ضیاء الدین سے اونچے
درجے پر بٹھایا گیا تھا"

یہ پورا انگریزی خط رسالہ "اردو" اکتوبر ۱۹۲۹ء کے پرچے میں ہم شائع

کر چکے ہیں۔ اس علمی مناقشے کا بدترین مرحلہ یہی مقدمہ تھا، اس کی مسل مل جانے سے مقدمے کی پوری کیفیت صحت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

مسودے کی عبارت اکثر جگہ گنجلک ہے، دو چار مقام پر ایک آدھ لفظ پڑھا نہیں گیا، اس کے متعلق فٹ نوٹ میں حسب ضرورت صراحت کردی ہے، اور جہاں شبہہ رہا وہاں قوسین میں سوالیہ (؟) علامت بنادی گئی ہے]

پیش گاہ صاحب اسِسٹنٹ

چونکہ مقدمہ جات فوجداری نمبری مسٹر اسٹاکڈن صاحب پیش ہوتے ہیں یہ مقدمہ انہی صاحب بہادر کے اجلاس میں پیش ہوگا، اور صاحب عزت وغیرہ کو بحال [1] صاحب بخوبی جانتے ہیں، یہ خط بخدمت مسٹر اسٹاکڈن صاحب بہادر پیش ہووے۔

۲ دسمبر ۱۸۶۷ء

صاحب والا مناقب عالی شان سرچشمۂ لطف و احسان جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی دام اقبالہٗ

بعد عرض مدارج تعظیم و تسلیم گذارش کرتا ہوں کہ مجھے ایک شخص پر ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش کرنی منظور ہے، اس واسطے اگرچہ میرے مدارج عزت آپ کو خوب معلوم ہیں لیکن چونکہ اس دعوے کے بیان میں کچھ بیان اپنی عزت کا ضرور ہے لہٰذا عرض کیا جاتا ہے کہ میں قوم کا ترک ہوں، دادا میرا شاہ عالم کے عہد میں ترکستان سے آیا۔ باپ اور چچا بہ سبب ضعف سلطنت مرہٹوں کی نوکری کرتے رہے، باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر سرکاری [2] عملداری سے پہلے ایک

---

[1] یہ لفظ نہیں پڑھا گیا۔

[2] یعنی دہلی میں انگریزی عمل داری سے پہلے

لڑائی میں مارا گیا، حقیقی چچا میرا نصر اللہ بیگ خان بہادر جرنیل لیک بہادر کا رفیق مع چار سو سوار کے سرکشانِ ہند کی لڑائیوں میں شریک رہا، چار سو سوار کا برگیڈیر اور لاکھ روپے کے پرگنے کا جاگیر دار تھا۔ جرنیل صاحب کے سامنے بہ مرگ ناگاہ مرگیا۔ جاگیر موافق قرار داد سرکار میں بازیافت ہوئی اور میرے واسطے بہ عوض جاگیر کچھ نقدی سرکار سے مقرر ہوگئی۔ پس میں رئیس زادہ بہ عوض جاگیر نقدی پانے والا ہوں۔ جاگیر داروں کے بعد میرا نمبر ہے اور باقی آپ کے دفتر سے لے کر دلّی کی کمشنری اور لاہور کی لفٹنٹ گورنری، کلکتے کے گورنر جرنیل بہادر کے دفتر تک میرے مدارج عزّت بہ خوبی ثابت ہیں۔ ایک شخص امین الدین نام دلّی کا رہنے والا کہ اب وہ پٹیالہ میں راجا کے مدرسے کا مدرس ہے، اس نے ایک کتاب لکھی، اگرچہ بنا کتاب کی بحث علمی پر ہے لیکن اس نے اس بحث علمی میں میرے واسطے وہ الفاظ ناشایستہ اور ایسی گالیاں دی ہیں کہ کوئی شخص کسی کولی چمار کو بھی یہ الفاظ نہ لکھے، اور ایسی گالیاں نہ دے گا۔ ناچار میں نے منشی عزیز الدین صاحب کو اس مقدمے میں اپنا وکیل کیا ہے ـــــ امیدوار ہوں کہ بعد تصدیق وکالت نامہ سررشتہ، فوج داری میں یہ مقدمہ پیش ہو اور خاص آپ کی تجویز سے اوّل سے آخر تک یہ مقدمہ فیصل ہو، اور کسی محکمۂ ماتحت میں یہ مقدمہ سپرد نہ ہو۔ فقط۔

راقم اسد اللہ خاں غالب
مرقوم دوم دسمبر ۱۸۶۷ء

اسد اللہ خاں

زیرِ پیش گاہ مسٹر اسٹاکڈن صاحب اسٹنٹ کمشنر بہادر
منشی وزیر علی۔ دیبی پرشاد گواہان حاشیہ نے
جانب مقر سے شہادت سامنے ہو کر بہ اقرار صالح مضمون

مختار نامہ کو تصدیق کرایا، لہٰذا تصدیق مختار نامہ عمل
میں آئی۔ مورخہ ۹ر دسمبر

العبد

جوالا ناتھ شرف جائے دستخط

جو مجھ کو بہ نام امین الدین ساکن دہلی، مدرس مدرسہ پٹیالہ بابت ازالۂ حیثیت
حسب دفعہ ۵۰۰، ۵۰۱ تعزیرات ہند بہ صیغۂ فوجداری نالش کرنی منظور ہے،
لہٰذا میں نے اپنی طرف سے عزیز الدین وکیل سررشتہ کو واسطے گزرانے عرضی
اور پیروی کرنے مقدمے کے وکیل کیا۔ وکیل مذکور جو کچھ سوال و جواب پیروی
مقدمہ ہذا میں کرے جملہ ساختہ پرداختہ اس کا مثل ذات خاص اپنی کے قبول
و منظور ہے، اس واسطے یہ مختار نامہ لکھ دیا گیا۔ فقط

گواہ شد العبد گواہ شد

دیبی پرشاد محمد اسد اللہ خاں منشی وزیر علی

المرقوم چہاردہم[1] دسمبر ۱۸۶۷ء

آج وکیل نے کتاب پیش کی، حکم ہے کہ یہ کاغذات
بروز سوموار کے پیش ہوں، اور وکیل مدعی انگریزی
میں ترجمہ ان الفاظ کا مع اس عبارت کے جہاں یہ الفاظ
واقع ہوئے ہیں، کرا کر پیش کرے اور مقدمہ درج رجسٹر
کیا جائے۔ ۱۲ر دسمبر ۱۸۶۷ء

دستخط حاکم

---

[1] بہ ظاہر یہاں چہاردہم نہیں، بلکہ چہارم ہونا چاہیے، اس لیے کہ ۲ کو چٹھی لکھی ۴ کو مختار نامے پر دستخط کیے، ۹ کو مختار نامہ تصدیق ہوا، ۱۲ کو تاریخ پیشی مقرر ہوئی، یہ امر بداہتہ ناقابلِ قبول ہے کہ ۹ کو مختار نامہ تصدیق ہوا اور ۱۴ کو غالب نے وکالت نامے پر دستخط ثبت کیے۔

حکم ہے کہ
مختارنامہ تصدیق کیا جاوے اور وکیل پہلے کتاب پیش کرے۔
۱۵ر دسمبر ۱۸۶۷ء

جناب عالی

جو حال عزت و اقتدار میرے مؤکل کا گورنمنٹ میں ہے اس کی تصریح دفاتر سرکاری اور آمد خطوط اور چٹھیاں حکام، خصوص سکریٹری گورنمنٹ پنجاب و نواب گورنر جنیل بہادر کشور ہند سے بہ خوبی ہو سکتی ہے۔ مسمی امین الدین ساکن دہلی، حال مدرس پٹیالہ نے ایک کتاب "قاطع القاطع"[1] ...... برہان مصنفۂ موکلم تصنیف کی، اس میں ایسے الفاظ ناشایستہ بلکہ دشنام مغلظہ نسبت موکلم تحریر کیے ہیں اور اس کتاب کو چھپوا کر مشتہر کیا ہے کہ جس سے نیکنامی کو نقصان پہنچنے کا باعث ہوا، اور ازالۂ حیثیت کہ جس کی تعریف دفعہ ۴۹۹ تعزیرات ہند میں درج ہے، وقوع میں آوے۔ پس مدعا علیہ مرتکب اس جرم کا ہوا جس کی سزا تعزیرات ہند کے ۵۰۰ اور ۵۰۱ میں قرار پائی ہے، لہٰذا امیدوار ہوں کہ بعد تحقیقات معروضۂ فدوی کے مدعا علیہ کو سزا مندرجۂ دفعات مذکورہ فرمائی جاوے کہ آئندہ عزت داران سرکار کا کوئی مزیل حیثیت کا نہ ہوئے۔ زیادہ حد ادب۔

تفصیل ان الفاظ مندرجۂ و مشتہرۂ کتاب کہ جس سے ازالۂ حیثیت کا ہوا، وہ مع نمبر صفحہ:

نمبر صفحہ	الفاظ مزیلۂ حیثیت
۱۳	بایں بے چارہ چہ حرکت ناکردنی کردہ است

---

[1] یہاں سے غالباً مندرجہ ذیل الفاظ غائب ہیں:-
"بہ جواب قاطع"

نمبر صفحہ	الفاظ مزیلۂ حیثیت
۱۲	پیش حاکم وقت رفتہ زخم نہانی خویش وانماید
۲۳	ایں خر عیسیٰ ندزین را بر پشت خود نہادہ است
۲۳	بہ دشنام پردازم
۲۸	میان خون حیض غوطہ خورد
۱۷، ۴۲	کلال اکبرآبادی دریں جا تمسخر بہ کار بردہ
۱۸، ۱۹، ۴۲	سیلی و گردنی ہا را برائے او بنیاد نہند
۵۱	فصد باید کشاد تا جنونش فرو گردد
۱۸، ۶۱	ایں خبطی
۲۰، ۶۶	از خرابۂ اکبرآباد بوے بہ دہلی رسیدہ است
۷۰	معترض ازیں عضو صدمتے دیدہ است
۱۱، ۱۲	

علاوہ اس کے اور بہت جگہ ایسے الفاظ ہیں، ملاحظۂ کتاب سے واضح لائے عالی ہوں گے۔

عرضـــــــــــــــــــــ

کمترین عزیزالدین وکیل اسداللہ خان پنشن دار سرکاری
عرف مرزا نوشہ معروضہ ۱۵ دسمبر ۱۸۶۷ء

یہ ممکن نہیں۔ ۲۲ جنوری ۱۸۶۸ء
دستخط

صاحب والا مناقب عالی شان سرچشمۂ لطف و احسان جناب ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی زاد شوکتہ،

بعد تعظیم و تکریم وہ اظہار آرزوئے بمواصلت کثیر الافادت التماس یہ ہے

کہ تخمیناً تیسرا مہینہ ہے کہ میں نے بہ وکالت منشی عز.یزالد.ین صاحب کے عدالت فوج داری میں ازالۂ حیثیت پیش کیا، وکالت نامہ تصدیق ہوگیا، اور میرا خط مع وکیل کے حضور میں گزرا، اور آپ نے وہ مقدمہ تجویز کے واسطے صاحب والاقدر اسٹاکٹن صاحب بہادر کے سپرد کیا۔ میری خوشی تو اس میں تھی کہ وہ مقدمہ آپ تجویز کرتے۔ اب بہ صد گونہ عجز و زاری استدعا کرتا ہوں کہ کاغذات مقدمہ وہاں سے منگائے جائیں اور حضور کے سامنے پیش کیے جائیں تاکہ امین الدین مدعا علیہ کی طلبی کا حکم پٹیلے کو جائے اور بعد اس کے حاضر ہونے کے بہ مواجہ اس کے اور میرے وکیل کے مقدمہ تجویز ہو کر میری دادرسی ہو اور مدعا علیہ کو سزائے سخت ملے، تاکہ پھر کوئی چھوٹا آدمی بڑے آدمی کو ایسے کلمات فحش و ناسزا نہ لکھے، مجھے یقین ہے کہ آپ اس اپنے تابع دار قدیم کی عرض قبول کریں گے اور بہ ذات خود میری داد رسی فرمائیں گے۔ فقط

راقم اسداللہ خاں غالب

۲۳ر جنوری ۱۸۶۸ء

جو کہ ہماری تبدیلی اس ضلع سے ہو گئی۔

حکم ہوتا ہے کہ

میرے بعد بہ حضور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر پیش ہووے

تحریر ۳۰ر جنوری ۱۸۶۸ء

دستخط

از پیش گاہ مسٹر اوبرین صاحب بہادر

حکم ہوا کہ

پرسوں کے واسطے مدعا علیہ بہ اجرائے سمن طلب ہووے۔ فقط

۵ر فروری ۱۸۶۸ء

عرضی مولوی امین الدین مدعا علیہ کی بیچ مقدمہ ازالۂ حیثیت عرفی مرزا اسداللہ خاں غالبؔ مدعی کے معروضہ تاریخ ۸ ماہ فروری ۱۸۶۸ء [اس کی نقل کی چنداں ضرورت نہ تھی، اس واسطے نہیں کی گئی]

اطلاع نامہ بنام مولوی امین الدین [اسکی نقل نہیں کی گئی]

اظہار وکیل مدعی

نام میرا عزیز الدین وکیل مرزا اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ

"قاطع القاطع" میں امین الدین نے صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے کہ " صاحب برہان بایں بیچارہ چہ حرکت ناکردنی کردہ است" بار دیگر صفحۂ مذکور میں ہے" پیش حاکم وقت رفتہ زخم نہانی خویش وانماید، نافریادش کارگر آید" صفحہ ۲۳ کی سطر ۱۴ میں ہے "این خر عیسیٰ نمد زین را بر پشت خود نہادہ است" صفحہ ۲۸ میں ہے " میان خون حیض غوطہ خورد" صفحہ ۴۲ کی سطر ۱۷ میں لکھا ہے" کلال اکبرآبادی درین جا مسخرہا بہ کار بردہ" صفحۂ مذکور کی سطر ۱۸، ۱۹ میں لکھا ہے "سیلی وکردنی ہارا برائے او بنیاد نہند" صفحۂ ۵۱ میں لکھا ہے" فصد باید کشاد تا جنونش فرو کرد" صفحہ ۶۱ کی سطر ۱۸ میں لکھا ہے" این خبطی[۱] ......" صفحہ ۶۶ کی سطر ۲۱ میں لکھا ہے "از خرابۂ اکبرآباد بومے بہ دہلی رسیدہ است" صفحہ ۷۰ کی سطر ۱۱، ۱۲ میں لکھا ہے "معترض از این عضو صدمتے دیدہ است" علاوہ اس کے جو کچھ اور لکھا ہے، ذیل میں گذارش ہے :-

صفحہ	سطر	خلاصہ
۱۲۷	۱۶، ۱۷	اگر این چنین تہمت را حاکم منصف می دید، بینی چہ گویم گوشش می برید

---

[۱] این خبطی در حقیقت ہر دو لغت از فرہنگ دیگر نشان می دہم

۱۴۱	۱۵	بضاعت خوایہ ہمیں ازاراست ہرکس رانشان می دہد
۱۴۲	۱۸	معترض خایہ راچرا گرفت، مگر برائے ترکیب ثان خورش گرفتہ باشد
۱۶۴	۱۰	جستن خرس رایاد کردہ است درقص بوزنہ رابہ اظہار آوردہ است
۱۷۲	۲۰	گوش وبینی چراگویم دست خواہد برید وزبان بہ قفا خواہد کشید
۳۸	۲۱	گوش اواز بناگوش برکنند یابہ سوراخش میخے زنند

ان الفاظ سے اور عبارت سے ازالۂ حیثیت عرفی میرے مؤکل کا ہے۔ میرے مؤکل کے بزرگ باشندے اکبرآباد کے تھے، فہرست گواہان کل داخل کروں گا۔

یہ اظہار ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہو کر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا۔ اقرار کیا، صحیح ہے،
مدعا علیہ نے سوال نہیں کیا۔

حکم ہے کہ مدعی فہرست گواہان داخل کرے۔ سوائے "قاطع القاطع" کے باقی کتابیں واپس ہوں چناں چہ واپس ہوئیں۔

۲۰ر فروری ۱۸۶۸ء

جناب عالی

چوں کہ فدوی کو نقل الفاظ ہائے گزرانیدۂ مدعی واسطے گزارنے معنے کے مطلوب ہیں، لہٰذا بذریعہ گذارش درخواست ہذا امیدوار کہ نقل جملہ الفاظ ہائے گزرانیدہ مدعی فدوی کو عطا ہو جاویں۔ فقط

مولوی امین الدین

مختارنامہ ازجانب مولوی امین الدین اسمی انبہ سہائے وکیل [نقل نہیں

کیے گئے]

فہرست گواہان مولوی امین الدین مدرس پٹیالہ

۳	۲	۱
حکیم حشمت اللہ خانصاحب صاحب سکریٹری اعظم	مولوی سدیدالدین خانصاحب اُستاد میور (؟)	مولوی ضیاء الدین صاحب پروفیسر عربی مدرسہ سرکاری۔
۶	۵	۴
مولوی محمد حسین صاحب	مولوی ابراہیم صاحب	محمد حمیدالدین خانصاحب عرف عبدالحکیم صاحب
		۷
		مولانا قمرالدین صاحب

فہرست گواہان مرزا اسد اللہ خاں غالب

۲	۱
ماسٹر پیارے لال صاحب سکریٹری	مولوی منشی سعادت علی خانصاحب مدرس کالج دہلی
۴	۳
مولوی لطیف حسین صاحب مدرس	مولوی نصیرالدین صاحب مدرس مدرسہ دہلی
	۵
	منشی حکم چند صاحب مدرس کالج دہلی

اطلاع نامہ ہا مسمیٰ (؟) گواہان فریقین کہ جن کی نقل نہیں کی گئی۔

نام میرا امین الدین ولد مولوی زین الدین قوم شیخ ساکن پٹیالہ عمر ۵۹ برس پیشہ مدرسی

بیان ہے کہ

میں نے ایسا نہیں لکھا کہ جس میں ازالۂ حیثیت عرفی مدعی کا ہو یہ کتاب "قاطع القاطع" تصنیف میری ضرور ہے۔

سوال —— فرد قرار داد جرم تم کو سُنائے جاتے ہیں؛ تم مرتکب جرم قرار دادہ کے ہوئے یا نہیں؟ تمھارا کیا جواب ہے؟ کیونکر صفائی کروگے؟

جواب —— فرد جرم میں نے سُنی۔ جواب یہ ہے اس کتاب میں تین قول ہیں؛ ایک تو محمد حسین "برہان قاطع" دوسرا مرزا اسد اللہ خاں مصنف "قاطع برہان" تیسرا قول میرا "قاطع برہان" میں رد کیا ہے "برہان قاطع" کو اور میں نے تردید کری ہے "قاطع برہان" کی۔

صفحہ ۱۳ میں جو لکھا یہ برائے مثل ہے، سوائے معنے تحت لفظی کے اور کچھ معنی میں نے نہیں خیال کئے۔ "زخم نہانی" مراد رنج دلی سے ہے، اور دیگر شاعروں نے بھی یہی معنے لئے ہیں، بہت شعر ہیں جن میں الفاظ "زخم نہانی" کو ڈالا ہے اور معنے اس کے رنج دلی لئے ہیں، سو اب یاد سے شعر پیش کروں گا۔

صفحہ ۲۲ میں جو لکھا ہے: "خرعیسیٰ ......" خر کے معنے نادان کے ہیں؛ لفظ عیسیٰ صرف بہ طور مرکب کے ڈالا گیا ہے۔ یہ عبارت جو درج ہے کہ "بدشنام پردازم" معنے یہ ہیں کہ ساتھ گالی کے مشغول ہوتے ہیں، مگر آگے اس کے جو عبارت ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ میں نے درج کیا ہے کہ زبان ایسی خراب کرلی ہے۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ "میان خون حیض غوطہ خورد" اس کے معنے یہ ہیں کہ کیوں گناہ گار ہوتے ہو، اور کو ...... [1] دیتے ہیں، یہ الفاظ کچھ تحت مثل ہے

---

[1] یہاں اصل عبارت کے کچھ لفظ رہ گئے ہیں۔

"خون حیض" کا لفظ عرفی اور[1] ... [ ] نے تا لکھا ہے، اور یہ بھی معنے دیتا ہے کہ کیوں گناہ گار ہوتے ہو۔

صفحہ ۳۸ میں جو لکھا ہے لفظ "سوراخ" اور لکھا ہے "گوش او راز بنا گوش بر کنند" اس کے معنی یہ ہیں، کان کو اکھیڑو، یا کان کے سوراخ میں میخ مارو، یہ الفاظ ایسے مقام پر آتے ہیں، جب کوئی اعتراض کیا کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ تمھارے کان اکھاڑے جاویں گے اور تمھارے کان بند کرا لئے جائیں گے۔

صفحہ ۴۲ میں جو درج ہے "کلال اکبرآبادی" کلال معنے میں سست کے لئے ہیں دوسری جگہ لکھا ہے "بیلی وگردنی ہارا برائے او بنیاد نہند" اوپر[2] کی عبارت سے اسے شامل کیا جائے تو معنے اس کے یہ ہوتے ہیں کہ شریک خوشی کے ہوئے۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے "قصد بادشاہ تا جونش فرو گردد" یہ الفاظ ایسے مقام پر آتے ہیں کہ جب کوئی اعتراض بے جا کرتا ہے تو کہا جاتا ہے۔ معنے اس کے تحت لفظی ہیں۔

صفحہ ۶۱ میں جو لکھا ہے "خبطی" اس کے معنی بھی یہی ہیں یعنی برگشتگیٔ مزاج۔

صفحہ ۶۶ میں ہے "از خرابۂ اکبرآباد بومے بہ دہلی رسیدہ است۔ بوم کے معنے مدعی نے بھی اپنے قول میں جو اوپر درج ہیں زمین کے لئے ہیں، یعنی لکھا ہے "کاش از بوم دکھن دگرے برخیزد" چناں چہ میں نے بھی معنے زمین، کے لئے ہیں معنے اس کے یہ ہوتے ہیں کہ زمین اکبرآباد سے ایک شخص آئے ہیں۔

---

[1] یہاں اصل عبارت کے کچھ لفظ رہ گئے ہیں۔

[2] اوپر کی عبارت یہ ہے:۔ "مضحکہا برائے خود آوردہ، رقص مبھنی می نماید و شتر غمزہ درکار می فرماید نرم سور و سرور را ساز دہند و بعد خندہ و بازی سیلی و گردنی ہارا برائے او بنیاد نہند"

سوال مدعی ـــ "خرابہ" کا مضاف الیہ کون ہے ؟ جواب اکبر آباد بوم ہے اور "ی" بوم کی واسطے تحسین کلام کے ہے ۔ فقط

صفحہ ۷۰ میں جو لکھا ہے "عضو" میں نے اس کے معنی "خواندن" کے لئے ہیں، انھوں نے اپنے کلام میں جو اوپر درج ہے، "عضو" کے معنے آلہ تناسل کے لئے ہیں میری مُراد یہ ہے کہ مدعی نے لفظ "عضو" سے کچھ صدمہ اُٹھایا، رنج دیکھا ہے، "از بس" کی ضمیر قریب بپ پر آتی ہے، بعید پر نہیں جاتی۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے "بینی چہ گویم گوششش می برید" اوپر کی عبارت سے ملاکر اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اگر حاکم اس تہمت کو دیکھتا سزا دیتا۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے "بضاعت خواجہ ہمیں ازاراست ہر کس رانشان می دہد" یہ لفظ "ازار" مدعی کے قول میں درج ہے مگر معنے اس کے چادر کے ہیں اور یہی میں نے لئے ہیں۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے لفظ "خایہ" اس کے معنے بیضۂ مُرغ کے ہیں، میری مراد یہ ہے (کہ) معترض نے اس ہی لفظ "خایہ" کو بہ معنے خصیہ کیوں لیا، مگر نام واسطے خورش کے بہ معنے بیضۂ مُرغ لیا ہو۔

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے کہ "جستن خرس را یاد کردہ است در رقص بوزنہ را بہ اظہار آوردہ" اس کے معنی تحت لفظی ہیں، مطلب یہ ہے کہ معترض کی ایسی باتیں یاد کریہی ہیں کہ "جستن خرس و رقص بوزنہ" کہ بیکار ہیں یاد کری جاویں۔

صفحہ ۱۷۲ میں "گوش و بینی چرا گویم دست خواہد برید و زبان بہ قفا خواہد کشید" اسکے معنی تحت لفظی ہیں مطلب یہ ہے کہ معترض نے چوری الفاظ کری ہے، اس کی سزا ملنی چاہیے۔

میں نے یہ کتاب صرف بہ بحث علمی چھپوائی ہے، گواہ میرے موجود ہیں۔

یہ جواب میرے مواجہ میں قلم بند کیا گیا، اس میں تمام بیان مشخص باخود مشتہادی صحیح و درست مندرج ہے۔

اظہار گواہ مدعی باقرار صالح بر اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر مرقوم ۲ر مارچ ۱۸۶۹ء

نام میرا پیارے لال ہے ولد رام نرائن ہیڈ ماسٹر اسکول قوم کھتری ساکن دربیہ عمر ۳۰ برس کی پیشہ ماسٹری۔ بیان یہ ہے کہ صفحہ ۱۳ "قاطع القاطع" کی عبارت جس پر نشان سُرخی کا ہے، میں نے پڑھی معنے 'حرکت ناکردنی' کے ہیں "اغلام ضربت ہا کشیدہ" اس مقام پر وہ معنے لئے جاتے ہیں کہ جب بحالت مجامعت ضرب لگتی ہے۔ "زخم نہانی" کے لغوی معنے ہیں "پوشیدہ زخم" مگر یہاں اس زخم سے مراد ہے کہ جو فعل بد سے عائد ہوئے، جو شخص پڑھ سکتے ہیں۔ وہ اس سے یہی مراد رکھیں گے

سوال ازطرف مدعا علیہ — آپ مرزا نوشہ کے شاگرد ہیں؟

جواب — میں شاگرد نہیں ہوں۔

سوال دوسرا — آپ فارسی کما حقہ جانتے ہیں؟

جواب — عربی میں نہیں جانتا، اور عام فارسی بھی اچھا نہیں جانتا، جس قدر جانتا ہوں معنے بیان کردیئے۔

سوال تیسرا — مدعی نے ترجمہ ان الفاظ کا انگریزی میں آپ سے کرایا تھا؟

جواب — ہاں مجھی سے کرایا تھا۔

صفحہ ۲۳ سطر ۱۵ میں لکھا ہے "خرعیسیٰ" اس کے معنی 'عیسیٰ کا گدھا' مگر یہاں مُراد صرف گدھے سے۔ عیسیٰ کے لفظ سے کچھ حاصل نہیں۔ لکھا ہے "بدشنام پردازم" یعنی میں گالیاں دیتا ہوں۔

صفحہ ۲۸ سطر ۱۹ میں لکھا ہے "میان خون حیض غوطہ خورد" اس کے معنے یہ ہیں کہ خون حیض میں غوطہ کھایا اور لفظ نسبت مخالف کے ہیں۔

سوال مدعا علیہ — آپ مضاف مضاف الیہ کو جانتے ہیں؟

جواب — جانتا ہوں۔

صفحہ ۴۲ کی سطر ۱۷-۱۸-۱۹ میں لکھا ہے "کلال اکبر آبادی" یعنی اکبر آباد کا کلال" سوائے اس کے اور کچھ معنے پیدا نہیں ہوتے "رقص میموں" بندر کا ناچ "شتر غمزہ" یہ معنے بدکاری۔

سوال مدعا علیہ — کلال بالفتح لفظ ہندی ہے اور یہ کتاب فارسی ہے، لفظ ہندی فارسی میں آتا ہے؟

جواب — دو طرح لفظ پڑھنے میں آتا ہے "کلال و کلال" کلال کے معنے شراب کش اور کلال کے معنے کمہار۔

صفحہ ۴۳ میں لکھا ہے "دست را بہ سیلی و لب را بدشنام باز کشاید" یعنی ہاتھ کو تھپڑ کے ساتھ اور لب کو گالی سے کھولا۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے "فصد باید کشایدنا جنونش فرو گردد" فصد کے معنے ہیں نشتر سے خون نکالنا "جنونش فرو گردد" یعنی جنون اس کا جاتا رہے۔

صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے "جبلی" معنے اس کے جنونی ہیں۔

سوال مدعا علیہ — دوسرے معنے آپ جانتے ہیں؟

جواب — میں نہیں جانتا۔

صفحہ ۶۶ میں لکھا ہے "آرے از خرابۂ اکبر آباد بوے بہ دہلی رسیدہ"۔ معنے یہ ہیں کہ 'اجاڑ اکبر آباد سے ایک اُلو دہلی میں پہنچا'، سوائے اس کے اور کچھ معنے میرے نزدیک نہیں ہیں۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے "عضو" لغوی معنے اس کے ہیں 'جسم کا کوئی حصہ' مگر یہاں مراد عضو تناسل ہے، بدیں مراد کہ معترض نے اس عضو سے صدمے اُٹھائے ہیں، اور یہ بیان مصنف کا سمجھتا ہوں۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے "بینی چہ گویم گوششں می برید" معنے یہ ہیں کہ ناک کو کیا کہوں کان اس کے اُکھاڑیے، "گوششں" کی ضمیر بہ طرف معترض ہے۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے "بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می دہد" اس کے معنے میں نہیں سمجھتا۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے "خایہ را چرا گرفت" اس مقام پر "خایہ" کے معنے عضو تناسل کے ہیں، اگرچہ معنے اس کے بیضۂ مرغ بھی ہیں۔

صفحہ ۳۸ میں جو لفظ "میخ [1] سوراخ" کا لکھا ہے اس سے مراد مقعد ہے۔

---

[1] "میخ سوراخ ..." [illegible]

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے "جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزنہ را بہ اظہار آوردہ" معنے یہ ہیں کہ خرس کے کودنے کو یاد کیا ہے اور بندر کے ناچنے کو ظاہر کیا ہے۔

یہ اظہار ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہو کر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا، اقرار کیا صحیح ہے۔ مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔

اظہار گواہ مدعی بہ اقرار صالح بہ اجلاس مسٹر اڈ برین صاحب بہادر مرقوم ۲ مارچ ۱۸۶۸ء

نام میر الطیف حسین ولد حکیم محمد حسین خاں، شیخ، مدرس عربی فارسی، ساکن کوچہ حکیم بقاء اللہ عمر ۳۵ برس کی۔

بیان یہ ہے

صفحہ ۱۲ میں لکھا "حرکت ناکردنی" ناشائستہ کے معنے ہیں، خلاف وضع فطری، جو کوئی پڑھے یہ معنے لے گا۔

سوال مدعا علیہ ـــ ان الفاظ کے معنے اور بھی ہو سکتے ہیں؟

جواب ـــ تحت لفظی معنے اور بھی ہو سکتے ہیں مگر اس مقام پر یہی معنے ہیں۔

صفحہ ۱۳ "زخم نہانی" کے معنے اس مقام پر "اندام نہانی" کے ہیں، اور ضرب سے وہی مراد ہے کہ جو اس کام سے ضرب ہوتی ہے۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے "خرِ عیسیٰ" اس کے معنے گدھا ہے، بے وقوف، عیسیٰ کا لفظ کچھ معنے نہیں دیتا، اس صفحے میں لکھا ہے "بدشنام پردازم" معنے اس کے یہ ہیں کہ گالیاں دوں۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے "میان خون حیض غوطہ خورد" خون حیض وہ جو عورتوں کو ماہواری آتا ہے، ناپاک ہے، گالی نہیں ہے، کلمۂ سخت ہے، اور کچھ معنے نہیں ہو سکتے۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے "بہ سوراخش میخے زنند" اس مقام پر سوراخ کے معنے مقعد کے ہیں لفظی معنے چھید کے ہیں، "سوراخش" کے شین کی ضمیر بہ طرف گوش کے ہو سکتی ہے، مگر اس مقام پر میری دانست میں معنی مقعد کے ہیں۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے "کلال اکبر آبادی" اگر ضم سے پڑھا جاوے تو "کمھار" اور اگر فتح سے پڑھا جاوے، تو معنے "مے فروش" دوسری جگہ لکھا ہے "سیلی و گردنی ہارا برائے، او بنیاد نہند" معنے یہ ہیں، ہاتھوں سے گردن پر مارنا۔

صفحہ ۴۳ میں لکھا ہے "دست را بہ سیلی و لب را بہ دشنام باز کشاید" معنے وہ ہیں کہ جو لفظی ہیں، اور کچھ معنے نہیں ہوتے۔

صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے کہ "فصد بایدکشاد تا جونش فرو گردد" یعنی فصد کھولنا چاہیے تو جنون اس کا جاتا رہے۔

صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے "خبطی" اس کے معنے یہ ہیں کہ 'دیوانہ'

صفحہ ۷۰ میں لکھا "معترض ازیں عضو صدمتے دیدہ" "عضو" سے مراد 'عضو تناسل' ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے کہ "بینی چہ گویم گوشش می برید" "گوشش" کی ضمیر بہ طرف معترض ہے۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے "بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می دہد" معنے یہ ہیں کہ یہی پاجامہ ہے جو ہر ایک کو دکھاتا ہے۔

سوال مدعا علیہ — ازار کے معنے اور بھی ہیں؟

جواب — مجھے معلوم نہیں۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے "خایہ را چرا گرفت" معنے لفظی یہ ہیں کہ معترض نے لفظ "خایہ" کو کیوں لیا، اور لفظ کیوں نہیں لیا۔ دوسرے معنے یہ ہیں کہ بیضے کو کس واسطے لیا اور عربی میں "خایہ" بیضے کو بھی کہتے ہیں۔

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے، کہ "جستن خرس رایاد کردہ است و رقص بوزنہ بہ اظہار آوردہ" معنے یہ کہ کودنے ریچھ کو یاد کیا، اور بندر کا ناچ ظاہر کیا ہے یعنی ریچھ کی طرح وہ شخص کودا ہے اور بندر کا ناچ کیا ہے۔ ضعیف معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کودنا ریچھ اور بندر کا یاد کیا ہے۔

صفحہ ۱۷۶ میں لکھا ہے "گوش و بینی چرا گویم دست خواہد برید و زبان بہ قفا خواہد کشید" سوائے معنے لفظی اور کچھ معنے اس کے نہیں ہو سکتے۔ میں ایسی تحریر کو بہت درست سمجھتا ہوں اور ہر ایک شخص کی سمجھ میں ایسا ہی آوے گا، جیسا میں نے بیان کیا ہے اور کوئی کتاب میں نے نہیں دیکھی جس میں ایسی عبارت درج ہو۔

سوال مدعا علیہ ـــــ "قاطع برہان" آپ نے دیکھی ہے؟

جواب ـــــ میں نے دیکھی۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں آیا۔ مظہر کو بزبان اردو، جس کو وہ سمجھتا ہے سُنایا گیا۔ اقرار کیا، صحیح ہے، مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا، فقط

اظہار گواہ مدعی:

نام میر نصیر الدین ولد محمد علیم الدین قوم سید ساکن کوچہ پنڈت عمر ۳۲ سال پیشہ روزگار

بیان یہ ہے کہ

میں فارسی اور عربی خوب جانتا ہوں اور انگریزی بہت کم جانتا ہوں صفحہ ۱۲ میں جو لکھا ہے کہ وہ میں نے اس سے سابق بھی اس عبارت کو دیکھا ہے "حرکت ناکردنی" سے یہ مراد ہے کہ "جو حرکت نہ کرنے کی ہو" زخم نہانی، کے وہ معنی ہیں کہ "زخم پوشیدہ" مگر اس جگہ مراد اس زخم سے ہے کہ جو دکھایا نہیں جاتا۔

سوال مدعا علیہ ـــــ آپ مدعی کے شاگرد ہیں؟

جواب ـــــ میں شاگرد نہیں ہوں۔

صفحہ ۲۲ میں لکھا ہے "بدشنام پردازم" معنے اس کے یہ ہیں کہ گالیاں دوں۔
صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے "میاں خون حیض غوطہ خورد" معنے خون حیض کے وہ ہیں کہ جو عورت کو ماہ بہ ماہ اندام نہانی سے پیدا ہوتا ہے، یہ چیز نہایت نجس ہے اور ناپاک ہے، اور ایسا لفظ آج تک استعمال میں نہیں آیا۔
صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے "گوش اوازہ بناگوش برکنند یا بہ سوراخش میخے زنند" سوراخ سے مراد 'مقعد' ہے اور یہ معنے 'عام جو اس عبارت کو پڑھیں گے سمجھیں گے۔
صفحہ ۴۲ ــــ "کلال اکبرآبادی" ضم سے مراد کمھار سے ہے اور فتحہ سے مراد شراب کش سے ہوتی ہے۔ اس مقام پر دونوں معنے ہو سکتے ہیں، بہ معنے رنج بھی آتا ہے مگر اس جگہ معنے رنج کے نہیں دیتا۔ عربی میں معنے اس کے سستی ہیں۔ وہ بھی اس جگہ موزوں نہیں ہوتے۔ اس صفحے میں "شترغمزہ" لکھا ہے اس کے معنے صرف بیہودگی کے ہیں۔
صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے "فصد باید کشاید تا جنونش فرو گردد" اس کے معنے یہ ہیں کہ 'جنون ہو گیا ہے فصد کھولنی چاہیے'۔
صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے کہ "از خرابہ' اکبرآباد بوے بہ دہلی رسیدہ است" یعنی جنگل اکبرآباد سے ایک اُلو دہلی میں پہنچا ہے۔
صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے "معترض ازیں عضو صدمتے دیدہ است" معنے اس عضو کے 'عضو تناسل سے مراد ہے' ٹکر کھانا۔
صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے "اگر ایں چنیں تہمت را حاکم منصف می دید۔ یعنی چہ گویم گوشش می برید" پس ضمیر شین کی بہ طرف معترض ہے، ضمیر اس شین کی بہ طرف تہمت نہیں ہو سکتی۔
صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے "بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس رانشان می دہد" معنے اس کے یہ ہیں کہ 'اس کے پاس یہی پاجامہ ہے' اور غالب کا کہنا یہ ہے کہ 'ہر کسی کو دکھاتا ہے کہ خریداری کرے'

اس کے بعد صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے، "معترض خایہ راچراگرفت" معنے "خایہ" کے خصیہ، اور انڈے کو بھی کہتے ہیں، یہاں شاید مراد خصیہ لیے ہیں۔ جو کوئی پڑھے گا وہی اس کے معنے خصیے کے سمجھے گا۔

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے "جستن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزینہ را بہ اظہار آوردہ" معنے یہ ہیں کہ ریچھ کے کودنے کو یاد کیا ہے، اور بندر کے ناچنے کو یاد کیا ہے۔

صفحہ ۱۷۲ میں لکھا ہے "گوش و بینی چرا گویم دست خواہد برید زبان بقفا خواہد کشید" معنے اس کے یہ ہیں کہ کان اور ناک کو میں کیا کہوں ہاتھ کاٹے گا اور زبان ساتھ گدی کے کھینچے گا۔

سوال از طرف وکیل مدعی — یہ الفاظ کس کی طرف بیان کیے گئے ہیں؟

جواب — دیباچہ دیکھکر بیان کرتا ہوں کہ نسبت مرزا اسد اللہ کے ہیں۔

یہ الفاظ نوشتہ اظہار گواہ ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم این جانب تحریر ہو کر مظہر کو بزبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے پڑھ کر سنایا۔ اقرار کیا، صحیح ہے، مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔

اظہار گواہ مدعی

نام میرا حکم چند ولد رام دیال قوم اہیر ساکن کھاری کوئی، عمر ۳۶ برس کی بیان یہ ہے کہ

صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے "چہ حرکت ناکردنی کردہ است" اس کے معنے یہ ہیں کہ جو حرکت کرنے کے لائق نہیں ہے وہ کی ہے یعنی اغلام کیا ہے۔

دوسری جگہ لکھا ہے "زخم نہانی، خویش را نماید" زخم نہانی جائے مخصوص سے مراد ہے۔ میری رائے میں یہی معنے آتے ہیں، عام لوگوں کو میں نہیں کہہ سکتا ہوں مگر یقین ہے یہی معنے بیان کریں گے، اور یہ عبارت سابق بھی میں نے دیکھی ہے۔

سوال مدعا علیہ — تمہاری تصنیف پر مرزا نے تصدیق لکھی ؟
جواب — ہاں لکھی ہے اور دیگر حکام نے بھی لکھی ہے۔
صفحہ ۲۲ میں لکھا ہے "خر عیسیٰ" اس جگہ مراد خاص گدھے سے ہے۔ دوسری جگہ لکھا ہے "بدشنام پر دازم" اس کے معنے یہ ہیں کہ گالیاں دوں میں۔
صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ "میان خون حیض غوطہ خورد" اس کے معنے وہی ہیں جو معنے لفظی ہیں۔
صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے "بہ سوراخش میخ زنند" سوراخ کے معنے اس جگہ مقعد کے ہیں۔ شین کی ضمیر بہ طرف معترض ہے، بہ طرف گوش نہیں۔
صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے "کلال اکبرآبادی" اگر لفظ عربی ہو تو بہ معنے سستی اور اگر بہ ضم ہو تو بہ معنے کمہار، اور اگر بہ فتح ہے تو بہ معنے کشش۔ دوسری جگہ لکھا ہے "سیلی وگردنی ہا را برائے او بنیاد نہند" اس کے معنے یہ ہیں کہ تھپڑ ماریں۔
صفحہ ۵۱ میں لکھا ہے "مگر فصد باید کشاد تا جنونش فرد گردد" سوائے لفظی معنے کے اور کچھ معنے نہیں۔
صفحہ ۶۱ میں لکھا ہے "خبطی" اس کے معنے "دیوانہ"
صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے لفظ "عضو" کا اس عضو سے مراد آلہ تناسل ہے۔
صفحہ ۱۲۷ میں لکھا ہے "یعنی چہ گویم گوششش می برید" سوائے معنے تحت لفظی کے دوسرا مطلب نہیں ہے "گوششش" کے شین کی ضمیر بہ طرف معترض ہے۔
صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے "بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می دہد تا خریداری نماید" حاصل اس کا یہ ہے کہ اس کے پاس یہ پاجامہ ہے اور ہر ایک کو دکھاتا ہے۔
سوال مدعا علیہ — ہمیں کی ضمیر کس طرف جاتی ہے اور لفظ ازار کس کا لیا ہوا ہے ؟
اس سوال کا جواب ضرور نہیں ہے۔
صفحہ ۱۴۲ میں لفظ "خایہ" کا لکھا ہے اس کے معنے خصیہ ہیں۔

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے "جستن خرس را یاد کردہ است ورقص بوزنہ را بہ اظہار آوردہ" سوائے لفظی معنی کے اور کچھ بات پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔
صفحہ ۱۷۲ میں لکھا ہے "گوش و بینی چرا گویم دست خواہد برید و زبان قفا بہ خواہد شید" معنے اس کے تحت لفظی کے اور کچھ پیدا نہیں ہوتے ہیں۔
یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم این جانب تحریر ہو کر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا۔ اقرار کیا صحیح ہے۔ مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔ فقط

اظہار گواہ مدعا علیہ بہ اقرار صالح بہ اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر، ۳ مارچ ۱۸۶۸ء
نام میرا ضیاء الدین ولد محمد بخش ساکن دہلی، پروفیسر عربی، دہلی کالج
بیان یہ ہے کہ
میں نے سابق اس کتاب کو دیکھا ہے۔ صفحہ ۱۳ میں جو عبارت لکھی ہے وہ "حرکت ناکردنی" بہ ہمہ الفاظ کسو خاص حرکت پر خصوصیت نہیں دیکھی۔ اس کے معنے وہ ہیں 'جو حرکت لائق کرنے کے نہ ہو' لفظ "ضربت ہا" جو لکھا ہے اس کے معنے مارنے کے ہیں، خصوصیت کسی دوسرے معنی پر نہیں رکھتا۔
"زخم نہانی" کے معنے یہ ہیں "زخم اندرونی" یا صدمۂ دل۔ استعمال معنے اس کے لوطیان میں چاہے جو کچھ لے لے، طرز عبارت سے جو کوئی دیکھے گا وہ معنے اس لفظ کے اور معنے کر کے خیال نہیں کر سکتا ہے۔ یہ عبارت نہ فحش ہے نہ ناسزا گوئی ہے۔ "زخم" موصوف اور "نہاں" اس کی صفت ہے۔ نہاں کے معنے کسی نے مقعد کے نہیں لیے۔
صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے "خر عیسیٰ" "خر" کے معنے بے وقوف ہیں اور لفظ "عیسیٰ" سے عظمت اور بزرگی ہوتی ہے۔ جیسے کہ فریزر[1] صاحب کمشنر دہلی یہاں

---

[1] لفظ صاف نہیں لکھا گیا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ولیم فریزر کی طرف اشارہ ہے۔

مارے گئے ہیں ان کی تاریخ وفات میں ایک قطعہ یہ ہے:

چوں فریزر کمشنر دہلی گشت مقتول از تفنگ بلا
از فلک چارمیں ندا آمد خرِ عیسیٰ نمود واویلا[۵]

"خرِ عیسیٰ" ایسا ہے جیسا کلب حسین اور کلب علی" چناں چہ والیِ رام پور کا نام کلب علی خاں ہے، معنے "کتے علی کے"۔

سوال وکیل مدعی ـــ اس عبارت سے کیا مراد ہے؟

جواب ـــ میرے نزدیک کوئی امر تضحیک کا نہیں ہے۔

صفحہ ۲۸ میں جو لکھا ہے کہ "میاں خون حیض غوطہ خورد" یہ صنعت ایہام ہے، بلحاظ حقیقی معنے کے کسی طرح مذمت نہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں کام نہایت بے وقوفی سے کرنا، اور وہ کام جو نہیں کرنا ہے، معنے خون حیض کا پینا نہایت بے وقوفی ہے۔ دوسرے معنی یہ کہ خون حیض کو بہ لحاظ رنگ ناپاک مشابہت شراب سے ہے گویا کثرت شراب۔

سوال وکیل مدعی ـــ اگر آپ کتاب کو دیکھیں تو کیا کہیں گے؟

جواب ـــ لطیف عبارت اس واسطے ہم ہنسیں گے مگر تضحیک کسی طرح کی اس میں نہیں ہے۔ غنی کا قول ہے ؎

خون حیض دختر رز جو شد از لب ہائے من

خون حیض عورتوں کو آیا کرتا ہے۔ اگر مرد کی نسبت کہا جاوے تو معنی بے وقوفی ہیں، جیسا کہ حیض الرجال مردمحل نہیں ہے حیض کے واسطے، اس کے معنے عیب اور بدگوئی کے ہیں۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے کہ "گوش او از بناگوش برکنند" یا بہ سوراخش میخ زنند"

---

[۵] فریزر کمشنر دہلی ۱۸۳۵ء مطابق ۱۲۵۱ھ میں مارا گیا لیکن قطعہ مذکور کے آخری مصرع سے یہ تاریخ نہیں نکلتی۔

سوراخش کے شین کی ضمیر بموجب قاعدے کے قریب کی طرف ہوتی ہے یعنی بطرف کان، مطلب یہ ہے کہ کان کھولے جاویں، مگر صرف لواطت والے اور معنے بھی سمجھ سکتے ہیں۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے "کلال اکبرآبادی" بہ معنے مے فروش، مگر اس شخص کے واسطے جو دائم الخمر ہو عیب نہیں ہے بلکہ مرزا نوشہ کا شاگرد تخلص[1] مے کش ہے۔ جو شراب نہ پیوے اس کے نزدیک عیب ہے مگر مدعی دائم الخمر ہے اس واسطے اس کی نسبت کچھ تضحیک نہیں ہے، دوسری جگہ لکھتا ہے "بیلی و گردنی ہارا برائے او بنیاد نہند" یعنی ہنسیں ان کے اوپر اور اصل یہ ہی ہے۔

صفحہ ۱۵۱ میں لکھا ہے کہ "فصد باید کشاد" یہ محاورہ روز مرّہ کا ہے کچھ سختی کلام نہیں ہے۔

صفحہ ۶۱ میں ہے "خبطی[2]" لغوی معنے اس کے یہ ہیں لڑ چلنا۔

صفحہ ۶۶ میں لکھا ہے "از خرابۂ اکبرآباد بوسے بہ دہلی رسیدہ است" یہ صنعت ایہام ہے مگر اس جگہ معنے زمین کے ہی اچھی طرح ہو سکتے ہیں۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے لفظ "ازیں عضو" اس ازیں عضو کی ضمیر بطرف قریب پھرتی ہے عضو تناسل کی طرف مگر کوئی اکانی نہیں ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں جو لکھا ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ خوب اس کو سزا دینا۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے لفظ "ازار" اس کے معنی عربی میں چادر کے ہیں مگر ہندی میں پاجامے کو کہتے ہیں۔ بہ کتاب فارسی اگر دیکھا جاوے تو بہ معنی چادر سمجھا جاوے گا۔

صفحہ ۱۴۲ میں لفظ "خایہ" کا لکھا ہے، یہ بھی صنعت ایہام ہے مگر اس مقلم

---

[1] میر احمد حسین مے کش بے چارہ غدر میں بے گناہ پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔

[2] خبط بہ معنے دست و پا زدن۔

پر معنے بیضۂ مرغ کے ہیں۔
صفحہ ۱۶۴ میں جو لکھا ہے اس کے معنے یہ ہیں اور ایسے مقام پر یہ عبارت لکھی جاتی ہے کہ جو حرکت بے جا ظہور میں آئی ہو جیسا کہ رقص .....
صفحہ ۱۷۲ میں جو عبارت لکھی ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ حاکم خوب سزا دے گا۔
عبارت متنازعہ کو ہم لطافت اور خوبی بیان کرتے ہیں اور ایسی تحریریں دشنام یا ہتک نہیں سمجھتے۔
یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم این جانب تحریر ہو کر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا؛ اقرار کیا صحیح ہے۔
مدعا علیہ نے سوال نہیں کیا۔ فقط

اظہار گواہ مدعا علیہ بہ اقرار صالح بہ اجلاس مسٹر اوبرین صاحب بہادر، واقع ۱۲ مارچ ۱۸۶۸ء
نام سدید الدین والد کا نام رشید الدین قوم شیخ ساکن گلی امام عمر تخمیناً ۶۰ برس کی
بیان ہے کہ
میں نے ان دنوں میں اس کتاب کو دیکھا ہے صفحہ ۱۲ میں لکھا ہے کہ "حرکت ناکردنی کردہ است" اس کے معنے یہ ہیں کہ "حرکت" بمعنی ہلنا اور "ناکردنی" بمعنے بے جا سوائے اس کے اور کچھ معنے میرے خیال میں نہیں آتے لفظ "زخم نہانی" کے معنے زخم پوشیدہ ہیں یعنی زخم اندرونی، اگر بہ سبیل لطیفہ کوئی اور معنے ہوں تو مجھ کو معلوم نہیں "ضربت ہا کشیدہ" کے معنے ہیں کہ کچھ مارا گیا ہے۔
صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے کہ "خر عیسیٰ" اس کے معنے بے وقوف کے ہیں۔
صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے کہ "میان خون حیض غوطہ خوردہ" اس کے معنے یہ ہیں کہ جیسے کہ دوسرا فریق لکھتا ہے کہ میں پھنس گیا، مصنف اس کا لکھتا ہے کہ ناپاک چیز میں پھنس گیا۔

سوال از طرف مدعا علیہ ـــــ حیض الرجال کے معنے کیا ہیں؟
جواب ـــــ بدگوئی کے۔

صفحہ ۶۸ میں لکھا ہے کہ "گوش اواز بناگوش برکنند یا بہ سوراخش میخے زنند" سوراخش کے شین کی ضمیر بطرف گوش ہے، معنے اس کے تحت لفظی ہیں۔
سوال کسل دیل مدعی ـــــ اگر سوراخش کے شین کی ضمیر بطرف گوش ہو تو بھی ایسے الفاظ سخت ہوتے ہیں یا نہیں؟
جواب ـــــ کچھ سخت الفاظ نہیں ہیں۔

صفحہ ۲ ۴ میں لکھا ہے "کلال اکبر آبادی" اردو میں کلال مے فروش کو کہتے ہیں، مگر یہ کتاب فارسی میں ہے، اس واسطے بمعنی مے نوش "رقص میمونی دشتر غمزہ" کے معنے بیہودہ کلام ہے۔
سوال کسل دیل مدعی ـــــ تحت لفظی معنے کیا ہیں؟
جواب ـــــ صاف ہیں۔

صفحہ ۶۸ میں لکھا ہے کہ "دستش بستہ بہ لائے شراب انداز ند" اوپر[1] کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنے شراب کے نہیں ہیں، اگر پیدا کرے جاویں تو معترض کے ہاتھ باندھ کر "بہ لائے شراب" ڈالیں۔

صفحہ ۷۰ میں "معترض ازیں عضو صدمتے دیدہ است" معنے یہ ہیں کہ مصنف "قاطع برہان" یعنی اس جگہ معنے عضو کے عضو تناسل لکھا ہے، اور جگہ اس عضو کو دیکھا ہے مصنف اس کتاب کا یہ قول ہے، کہ معترض نے اس عضو سے کیا

---

[1] اوپر کی عبارت یہ ہے:۔

"می فرماید آویزہ بہ زائے ہوز ہرگز نیست؛ ورنہ اسم شراب است من می گویم؛ کہ اگر در فرہنگ ہائے دیگر آویزہ بہ زائے ہوز بہ معنے شراب باشد سزائے منکر چیست؟ می باید کہ دستش بستہ بہ لائے شراب انداز ند"

صدمہ دیکھا ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں جو عبارت لکھی ہے "ایں چنیں تہمت را حاکم منصف می دید بینی چہ گویم گوشش می برید" اس کے معنے صاف ہیں اور معنے اس کے تحت لفظی ہیں دوسرے معنے یہ کہ 'حاکم سزا دیتا' اور معنے نہیں۔

صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے "بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می دہد" "ازار" معنے تہمد کے ہیں، امور نجسیہ کے نہیں، صرف علمی بحث ہے۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے لفظ "خایہ" کا، اس کے دو معنے ہیں، ایک بیضۂ مرغ دوسرے خصیہ مگر چوں کہ اس مقام پر لفظ "نان خورش" اس واسطے معنے اس کے اس مقام پر بیضۂ مرغ کے ہیں۔

صفحہ ۱۶۳ میں لکھا ہے "جشن خرس را یاد کردہ است و رقص بوزنہ بہ اظہار آوردہ" اس کے معنے حرکت لغو، اور کام بیہودہ کے ہیں۔

صفحہ ۱۷۲ میں جو لکھا ہے اس کے معنے تحت لفظی صاف ہیں۔

سوال عدالت — جو فقرے آپ نے پڑھے ہیں آپ ان کو کیا سمجھتے ہیں؟

جواب — میں فقروں کو لطائف سمجھتا ہوں، بحث میں ایسے بھی فقرے ہوتے ہیں، فحش یا بدنامی کسو کی نہیں ہے؛ نہ کسی کو برا معلوم ہوگا۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہو کر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے، پڑھ کر سنایا گیا، اقرار کیا صحیح ہے، وکیل مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔ فقط

اظہار گواہ مدعا علیہ بہ اقرار صالح، بہ اجلاس مسٹر ادبرین صاحب بہادر ۱۳ مارچ ۱۸۶۸ء

نام میر احشمت اللہ خاں و[illegible]ام نقش بند خاں قوم مغل ساکن مٹیا محل عمر ۴۲ سال پیشہ حکمت

بیان یہ ہے کہ

اس چار پانچ رو[illegible]ز ہے میں مظہر نے اس کتاب کو دیکھا ہے۔ صفحہ ۱۲ میں

لکھا ہے "حرکت ناکردنی، زخم نہانی وضربت ہا" حرکت ناکردنی خصوص کسی حرکت کے واسطے نہیں ہے: "ضربت ہا" کے تین معنے ہیں اوّل (لہ........) دوم پیدا کرنا سوم اپنا ہاتھ سر میں مارنا چہارم سَستے نقصان کے بھی ہیں، اور زخم نہانی معنے دردِ دل کے ہیں، اور اکثر کتابوں میں لکھا ہے کہ "زخم نہانی" معنے رنج دوری حاصل کرنے کے ہیں۔

صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے "خر عیسیٰ" اس کے معنے بے وقوف کے ہیں، اور "خر" کے معنے نادان ہیں، اور لفظ عیسیٰ بہت بزرگ ہے۔ اگر ہم کو خرِ عیسیٰ کہا جاوے تو ہم اپنی عزّت سمجھیں۔

صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے "میان خونِ حیض غوطہ خورد" اس کی مراد بے وقوف اور گندی بات سے ہے۔ اصل مراد اس کی مصنّف سے پوچھی جاوے۔

صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے "بہ سوراخش میخ زنند" سوراخش کے شین کی ضمیر بہ طرف گوش کے ہے۔

سوال وکیل مدعی ــــ اس مضمون سے کوئی شخص بُرا مانتا ہے؟

جواب ــــ شعرا کے نزدیک قابل بُرا ماننے کے نہیں ہے، اگر کوئی جھوٹ ہم سے کہے تو بُرا مانیں، مگر بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں ہے۔

صفحہ ۴۲ میں لکھا ہے "کلال" کے معنے ہندی میں مے فروش کے ہیں، اور عربی میں سُست کو کہتے ہیں۔ یہ کتاب فارسی ہے، ہندی کے معنے نہیں ہو سکتے۔

سوال وکیل مدعی ــــ فارسی میں کیا معنے ہیں؟

جواب ــــ اس کا حال نہیں معلوم

صفحہ ۶۶ میں لکھا ہے "از اکبر آباد بومے بہ دہلی رسیدہ" اس کے معنے یہ ہیں اور ترکیب مقلوب ہے، یعنی از بوم اکبر آباد معنے ہیں، اس جگہ معنے الّو کے نہیں ہیں

لہ عبارت مسل میں درج نہیں،

وانکہ اوپر معترض نے لکھا ہے کہ بوم مصنف نے لکھا ہے کہ اکبر اباد بوم۔

صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے "معترض از بن عضو صد منے دیدہ است" اس کی ضمیر بطرف آلۂ تناسل ہوتی ہے اور "ازین" کی ضمیر بہ طرف قریب ہے۔

صفحہ ۱۲۷ میں جو لکھا ہے اسکے معنی تحت لفظی یہ ہیں کہ اگر حاکم اسکی تہمت کو دیکھتا تو کان کاٹتا صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے کہ "بضاعت خواجہ ہمیں ازار است ہر کس را نشان می دہد تا خریداری نماید" معنے ازار کے چادر کے ہیں، "خریداری" کے معنے قبول کرنے کے ہیں۔

صفحہ ۱۴۲ میں لکھا ہے کہ "خایہ" اس کے معنی بیضہ مُرغ کے ہیں، اور مرزا نے بھی اسی قول میں معنے اس کے بیضہ مُرغ اوپر لکھے ہیں۔

صفحہ ۱۶۲ میں "جستن خرس را باد کردہ است در قص یوزنہ یاد آوردہ" معنے اس کے یہ ہیں، کہ بے جا باتوں کو یاد کیا جیساکہ "جستن خرس در قص یوزنہ" حرکت بے جا ہے۔

صفحہ ۱۷۲ میں لکھا ہے "گوش و بینی چرا گویم دشنش خواہد برید" معنے اس کے اوپر کی عبارت سے یہ ہیں کہ حاکم سزا دیتا۔ میرے نزدیک سخت کلامی اس میں نہیں ہے، شعرا ایسی عبارت لطافت طوالت کے ساتھ خیال کرتے ہیں۔

یہ اظہار گواہ کا ہمارے اہتمام سماعت میں بہ رعایت حکم ایں جانب تحریر ہو کر مظہر کو بہ زبان اردو جس کو وہ سمجھتا ہے؛ پڑھ کر سُنایا گیا، اقرار کیا صحیح ہے، مدعا علیہ کے سوال کا جواب لکھا گیا۔ فقط

اظہار گواہ مدعا علیہ

نام میر احمید اللہ عرف عبد الحکیم ولد محمد عبد اللہ قوم سید عمر ۳۹ برس ساکن کلاں محل پیشہ روزگار

بیان یہ ہے کہ

میں نے اب یہ کتاب دیکھی صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے "ناکردنی، ضربت ہا و زخم نہانی" "حرکت ناکردنی" کے معنی لفظی یہ ہیں خصوصیت کسی حرکت پر نہیں، "ضربت ہا" کے

معنے رنج وصدمے کے ہیں اور" زخم نہانی" کے معنے رنج کے ہیں اور اکثر شعرا نے
بھی یہی معنے باندھے ہیں۔
صفحہ ۲۲ میں لکھا ہے" خر عیسیٰ" اس کے معنے یہ ہیں کہ" خر" بمعنی نادان، اور
" عیسیٰ" نام پیمبر کا لفظ جس سے فخر ہو گیا۔
صفحہ ۲۸ میں لکھا ہے" میان خون حیض غوطہ خورد" اس کے معنے یہ ہیں کہ
گناہ گار ہووے،" گر در[1] لفظ ہیں اگر دوسری دفعہ کوئی غلطی کرے گا تو اس عبارت
کو باندھ جاوے گا۔ دیوان حافظ میں کئی جگہ خون حیض درج کیا گیا ہے، اس وقت
کوئی شعر یاد نہیں۔ یقین ہے؛ کہ مولانا شاہ عبدالعزیز نے تحفۂ اثنا عشریہ میں
ان الفاظ کو لکھا ہے۔
صفحہ ۳۸ میں لکھا ہے کہ" سزاوار بناگوش برکنند یا میخے بہ سوراخش زنند"
معنے اس کے لفظی ہیں:" سوراخش" کے شین کی ضمیر بہ طرف گوش ہے۔
صفحہ ۴۲ میں لکھا؛ کہ" کلال اکبرآبادی" یہ کتاب فارسی ہے، فارسی میں کلال
بہ معنے شست کے ہیں اور اردو میں بہ معنے مے فروش۔
صفحہ ۶۶ میں لکھا ہے کہ" آرے از خرابۂ اکبر آباد بومے بہ دہلی رسیدہ" معنے
یہ ہیں کہ بوم اکبر آباد سے یعنی زمین اکبر آباد سے کوئی دہلی میں پہنچا۔
صفحہ ۷۰ میں لکھا ہے کہ" ازیں عضو صدمتے دیدہ است" معترض کے
دل میں ہے کہ" از ہمیں عضو" اس ہمیں کی اضافت بہ طرف عضو تناسل ہے اور ازیں
عضو کی اضافت بہ طرف اس عضو کے ہے۔
صفحہ ۱۲۷ میں جو لکھا ہے، اس کے معنے یہ ہیں کہ حاکم سزا دیوے۔
صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے کہ" بضاعت خواجہ ہمیں ازار است" ہر کس را نشان
می دہد" اور یہ قول ہے معترض کا جس میں لکھا ہے کہ" کلاہ را ازار نام نہادہ" مصنّف
نے لکھا ہے کہ یہ دہی ازار ہے معنے چادر کے ہیں۔
صفحہ ۱۴۲ میں لفظ" خایہ" لکھا ہے، اس کے معنے بیضۂ مرغ کے ہیں۔

---

[1] عبارت مشکوک ہے۔

صفحہ ۱۶۴ میں لکھا ہے کہ "جستن خرس رایاد کردہ است" اور "رقص .بوز نہ بہ اظہار آوردہ" اس کے معنے نظر کرنے کے جہاں نے فاسد[1] باندھ لئے ہیں۔
صفحہ ۱۷۲ میں لکھا ہے، اس کے معنے تحت لفظی ہیں، اگر اس چوری کو میں کہوں تو کان ناک کیا کہوں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں۔
ایسی عبارت کو بُرا نہیں سمجھتا ہوں، جہاں مناظرۂ علمی ہوتا ہے وہاں ایسی عبارت ہمیشہ ہوتی ہے بلکہ اوروں نے زیادہ اس سے لکھا ہے۔
اظہار گواہ ہمارے اہتمام سماعت میں یہ عبارت معمولی۔

جنابِ عالی!
جو کہ مجھ مدعی کا مقدمہ بنام مولوی امین الدین بابت ازالۂ حیثیت عرفی حسب منشائے دفعہ ۴۹۹ تعزیرات ہند عدالت ہے، چناں چہ بہ فہمائش چند گرامی روسائے شہر باہم رضامندی ہوئی اب مجھ کو کچھ دعویٰ بابت مقدمہ باقی نہیں، مقدمہ داخل دفتر ہو جاوے۔

عرضی

عزیز الدین وکیل مدعی ۲۲ مارچ ۱۸۶۹ء

از پیش گاہ اوبرین صاحب بہادر
مقدمہ خارج اور کاغذات داخل دفتر۔ فقط

--- ... ---

---

[1] عبارت مشکوک ہے۔

عبدالسّتار صدّیقی

دہلی سوسایٹی اور مرزا غالب

(۱)

سُنا تھا دلّی میں کبھی کوئی ادبی انجمن "دہلی سوسائٹی" بھی تھی۔ اس انجمن کی مُہر بھی بعض کتابوں پر دیکھی تھی جو، امید ہے، اب بھی دلّی کے دو ایک کتاب خانوں میں محفوظ ہوں گی۔ انجمن کے حال کی تفصیل معلوم نہ تھی۔ اُردو ادبیات کی تاریخ مُدوّن نہیں۔ پُرانے جریدے (اخبار یا رسالے)، جن سے ادب یا ادبی اداروں کا حال پورا پورا اور ٹھیک ٹھیک معلوم ہوتا، بیشتر محفوظ نہیں۔ ہاں ہندستانی ادبیات کے فرانسیسی سوانح نگار گارساں دَتاسی نے، اُسے آفریں کہیے، اپنی تالیفوں میں ۱۸۷۷ع تک کے حالات، جہاں تک اور جیسے کچھ اُسے مل سکے، اِکجا کر دیے ہیں اور انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اس کے خطبوں اور تبصروں کو "خطبات گارساں دَتاسی" اور "مقالات گارساں دَتاسی" کے نام سے اُردو میں منتقل بھی کر لیا ہے[۱] جو ماخذ آج نایاب ہیں، سب نہیں تو اُن میں سے بہت سے، دتاسی کے سامنے تھے۔ پھر بھی ہزاروں کوس دور بیٹھ کے کسی ملک کی زبان اور اُس کے بڑھتے ہوئے ادب پر تبصرہ کرنا بہت کڑی منزل ہے۔ "دہلی سوسائٹی" کا حال دَتاسی کی تالیفوں میں کئی جگہ آیا ہے مگر ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا نہیں۔ اُن بہت سی علمی یا ادبی انجمنوں کے ساتھ ساتھ، جو ۵۷ء کے غدر کے تین ہی چار برس بعد سے قائم ہونی شروع ہو گئی تھیں، "دہلی سوسائٹی" کا بھی کہیں کہیں نام آگیا ہے۔ بس اِتنا معلوم ہوا

---

[۱] افسوس اُس کی "ہندستانی ادب کی تاریخ" ابھی ترجمہ نہیں ہوئی۔

کہ یہ انجمن، جو ۱۸۶۵ء سے قائم تھی[1] اپنے اجلاسوں کی کارروائی اُردو زبان میں ایک رسالے کی شکل میں شائع کرتی رہتی تھی اور وہ رسالہ سوسائٹی کے سکریٹری منشی پیارے لال کے اہتمام سے نکلتا[2] اور دلّی کے اُس زمانے کے مشہور چھاپے خانے "اکمل المطابع" میں چھپتا تھا[3]۔ مغل سلطنت کی پرانی راج دھانی کے اکثر سربرآوردہ باشندے اُس سوسائٹی کے ممبر تھے۔ اُس کے جلسوں میں بیشتر عام منفعت کے مطالب پر مقالے پڑھے جایا کرتے تھے، اُن پر دلچسپ مباحثے بھی ہوتے تھے اور پھر اُس کا خلاصہ انجمن کے ماہانہ رسالے میں درج کیا جاتا تھا[4]۔

دتاسی کو ہندستان کے ادبی اور علمی حالات معلوم کرنے کی فکر ہر وقت رہتی تھی اور کسی ممکن موقع کو وہ کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ بعض اداروں سے اُسے براہِ راست اطلاع ملتی رہتی تھی گو اِن کی تعداد بہت کم تھی۔ "دہلی سوسائٹی" نے ظاہرا ایسا نہیں کیا۔ سرکاری رپورٹیں جو شائع ہوتیں، اُسے آسانی سے ملتی رہتیں۔ کئی انگریزی اور ہندستانی اخبار بھی سلسلہ وار اُس کے پڑھنے میں آیا کرتے۔ پھر بھی بہت سے اخبار اور وقتی مطبوعات وغیرہ ایسی چیزیں تھیں جو کبھی کبھار اُسے مل جاتی تھیں اور اُن کو غنیمت جان کے وہ اُنھیں سے کام نکال لیا کرتا تھا۔ اِنھیں میں "دہلی سوسائٹی" کا رسالہ بھی ہے جس کا اُسے غالباً ایک سے زیادہ شمارہ دیکھنے کو نہیں ملا۔ جو کچھ حال اُس نے اِس سوسائٹی کا لکھا ہے اُس سے یقین ہوتا ہے کہ رسالے کا پہلا شمارہ، جس میں اِس انجمن کے آغاز کی ساری روداد لکھی ہوئی ہے، اُسے نہیں ملا، اور دوسروں کی روایت سے جو کچھ معلوم ہو گیا اُسی پر قناعت کرنی پڑی۔ خاص کر "دہلی سوسائٹی" کے متعلق اُس کی معلومات بیشتر

---

[1] گارساں دتاسی، تبصرہ بابت ۱۸۶۴ء، ص ۸۷ (اردو ترجمہ: "مقالات" ج ۲، ص ۸۹) [2] ایضاً خطبات ص ۴۰۸ (اردو ترجمہ، ص ۴۷۷) [3] تبصرہ بابت ۱۸۷۰ء ص ۵ (مقالات، حصہ ۱، ص ۴) اور تبصرہ بابت ۱۸۶۴ء، ص ۸۷ (مقالات، حصہ ۲، ص ۸۹) [4] تبصرہ بابت ۱۸۶۴ء، ص ۸۷۔ دتاسی نے یہ اطلاع "اخبار انجمن پنجاب" (۱۸ اپریل ۱۸۶۴ء) سے اخذ کی ہے۔ نہیں معلوم "ماہانہ" کا لفظ اِس اخبار ہی نے لکھ دیا تھا یا دتاسی کا اضافہ ہے۔

تشنہ ہے اور کہیں کہیں غلط، جیسے یہ کہ سوسائٹی کا رسالہ "ماہانہ" تھا۔ بعض اطلاعیں آپس میں متناقص بھی ہیں؛ مثلاً ۱۸۶۹ء کے خطبے اور پھر ۱۸۷۰ء کے تبصرے میں سوسائٹی کے رسالے کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کر چکا ہے، مگر اپنے پہلے لکھے کو بھول کر ۱۸۷۲ء کے تبصرے میں کہتا ہے:

> دہلی کی ادبی انجمن کا اب تک کوئی رسالہ شائع نہیں ہوتا، لیکن اب، اس نے اپنا رسالہ نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس کے پہلے شمارے کی "اتالیقِ پنجاب" کے ایڈیٹر نے بہت تعریف کی ہے۔"[1]

سوسائٹی کے رسالے کو جو وہ "ماہانہ رسالہ" (JOURNAL MENSUEL) کہتا ہے، صحیح نہیں۔ صورت یہ تھی کہ کم و بیش سال بھر کے اجلاسوں کی کارروائی مع اُن مقالوں کے جو اُن اجلاسوں میں پڑھے گئے تھے، سب یکجائی طور پر ایک شمارے میں جمع کر کے شائع کیے جاتے تھے۔ اِس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

ماخذوں کی نایابی سراسر مایوس کرنے والی تھی اور اسی پر صبر شکر کر لیا تھا کہ دتاسی کی تحریروں سے کچھ تو حال معلوم ہو گیا یہی کیا کم تھا کہ انھیں ادھوری اطلاعوں سے اِتنا پتا لگ گیا کہ سوسائٹی کا رسالہ نکلتا تھا۔[2]

(۲)

بہت تلاش تھی کہ "دہلی سوسائٹی" کے رسالے کا کہیں سے ایک ہی شمارہ ہاتھ آ جائے۔ نہ آیا۔ بارے مخدومی پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کی نوازش سے ایک ہی نہیں،

---

[1] تبصرہ بابت ۱۸۷۲ء، ص ۴۴ (مقالات، حصہ ۱، ص ۲۱۶) [2] ادبیات کا شوق رکھنے والوں سے درخواست کرنا بے جا نہ ہوگا کہ جہاں کہیں پرانی یا قلمی مطبوعہ کتابیں، اخبار، رسالے یا متفرق چیزیں ملیں اُن کو محفوظ کرنے اور عام منظر پر لانے کو لازم جانیں تاکہ ادبی تاریخ کی تصحیح اور تدوین کسی حد تک تو ہو سکے۔

چار شمارے دیکھنے کو مل گئے، اور، کئی برس ہوئے، اُن میں سے ضروری یادداشتیں لکھ لیں۔ یہ چار اِس طرح پر ہیں کہ پہلا موجود، دوسرا ندارد، تیسرا، چوتھا، پانچواں مسلسل موجود۔ پہلا بہت اہم ہے، اس واسطے کہ اُس سے ادارے کی بنا اور اُس کے سارے ابتدائی مرحلوں کی کیفیت پوری پوری معلوم ہوتی ہے۔

پہلے شمارے کی صورت یہ ہے: سرورق کا عنوان یہ شعر:

"صاحبا عمر عزیز است غنیمت دانش
گوے خیرے کہ توانی ببر از میدانش"

اِس شعر کے نیچے "نمبر ۱" اور اُس کے نیچے، صفحے کے بیچ میں، ایک دائرہ، اُس دائرے میں "رسالہ دہلی سوسائٹی"۔ دائرے کے نیچے "۱۸۶۶ء" یہ رسالے کے چھپنے کا سال ہے۔ اِس سے نیچے دو سطریں، جو گویا عنوان کے دو مصرعوں کا جواب ہیں، مگر نثر میں۔ عبارت یہ: "صاحبان دہلی سوسائٹی کے ارشاد سے مطبع سراجی میں میرزا ولایت حسین کے اہتمام سے چھپا"۔ رسالے کی تقطیع بڑی اٹھ ورقی، مسطر ۲۰ سطری ہے۔ اِس شمارے کا حجم ۴۸ صفحے ہے اور اخیر صفحے پر دو قطعۂ تاریخ راجہ دیبی سنگھ صاحب طرب کے کہے ہوئے، درج ہیں۔

تیسرے اور اُس کے بعد کے شماروں پر اُس فارسی شعر کے بدلے، جو پہلے کے سرورق پر تھا، یہ اُردو شعر ہے:

"سوسائٹی کی بزم معلیٰ کا ذکر ہے
یعنی علوم حکمت و انشا کا ذکر ہے"[1]

---

[1] دتاسی نے ۱۸۷۰ء کے تبصرے (ص ۵) میں اس شعر کا صرف ترجمہ (فرانسیسی نثر میں) دیا ہے۔ اِس سے یقین ہوتا ہے کہ پہلا شمارہ، جس پر فارسی شعر چھپا تھا، اُسے نہیں ملا۔ ۲۔ ۷۰ء اور ۷۱ء کے تبصروں میں اُس نے سوسائٹی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے "علی گڑھ اخبار" اور "اخبار انجمن پنجاب" وغیرہ کے حوالے سے لکھا ہے۔

چھاپے خانہ بھی بدل گیا ہے۔ ان تینوں شماروں پر یہ ہے: "مطبع اکمل المطابع دہلی میں میر فخرالدین کے اہتمام سے چھپا۔"[1] تیسرا شمارہ، جو ۱۸۶۷ء میں نکلا تھا، ۵۴ ہی صفحے کا ہے۔ ۱۸۶۸ء میں رسالہ نہیں چھپا۔ چوتھا شمارہ ۱۸۶۹ء میں چھپا اور اُس کا حجم ۱۵۰ صفحے کا ہے۔ پانچویں شمارے کے سرورق پر یہ صراحت کردی گئی ہے: "نمبر ۵ من ابتداے ۱۰ر مئی ۱۸۶۹ء لغایت ۲ر فروری ۱۸۷۰ء" کُل صفحے اِس کے بھی ڈیڑھ سو ہیں جس میں سے آخری سولہ صفحوں میں ایک ہندی مضمون، دیوناگری حرفوں میں ہے۔

اِس تفصیل سے کھل گیا کہ "دہلی سوسائٹی" کا رسالہ نہ "ماہانہ" تھا نہ "سالانہ" بلکہ خاص طور سے کسی متعین وقت پر اُسے شائع کرنا مدنظر ہی نہ تھا۔[2]

(۳)

رسالے کی ترتیب عموماً یہ تھی کہ پہلے سوسائٹی کے اجلاسوں کی رودادیں ہوتیں، پھر وہ مقالے جو اُن اجلاسوں میں سُنائے گئے تھے۔ کسی مقالے پر جو تبصرہ یا مباحثہ جلسے میں ہوا تھا اُس کا ذکر جلسے کی روداد میں آجاتا اور مقالے رودادوں کے بعد ہوتے۔

پہلے اجلاس کی روداد سے، جو پہلے شمارے (ص ۱–۲) میں درج ہے سوسائٹی کے قائم ہونے کی کیفیت، اُس کے مقاصد اور اساسی دستور کی تفصیل معلوم ہوتی ہے اس لیے اس روداد کے بعض حصے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

ا۔ کیفیت جلسہ اوّل ... ۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء ... صبح کے وقت کرنیل

---

[1] اِس چھاپے خانے کے مالک منشی بہاری لال "مشتاق" تھے جو ایک "اکمل الاخبار" بھی نکالتے تھے "مشتاق" بھی غالب کے عزیز شاگردوں میں سے تھے (دیکھو "اردوے معلی" حصہ ا کا اخیر خط)

[2] مختارالدین آرزو صاحب کو یہ دو شمارے دیکھنے کو ملے ہیں: ۱۸۷۴ء، ۱۸۷۷ء، ۱۸۸۲ء جن کا حال اُنھوں نے اخبار "جمہور"، علی گڑھ (۶ مارچ ۱۹۵۰ء) میں شائع کیا۔ جو رسالہ "قومی زبان" کراچی میں بھی نقل ہوا۔

ہملٹن صاحب بہادر کمشنر دہلی کی کوٹھی پر بہت سے معزز اور رؤسائے شہر اور چند صاحبان انگریز اس شہر میں ایک مجلس علمی کے تقرر کے واسطے مشورہ کرنے کو جمع ہوئے۔ اوّل کمشنر صاحب بہادر نے حاضرین جلسہ سے باعث اجتماع بیان کیا اور فرمایا کہ یہاں کے لوگ اپنے حسن سعی سے اس قسم کی انجمن کو خوب رونق دے سکتے ہیں۔ پھر لاہور کی انجمن مطالب مفیدہ اور علی گڑھ کی سائنٹی فک سوسائٹی اور اور شہروں کی مجالس علمی کی رونق و ترقی کا حال بیان کیا اور اُن مضامین کا بھی ذکر فرمایا جن کی طرف اس کمیٹی[1] کو توجہ کرنی چاہیے ...... اس کمیٹی میں .... مضامین علمی مثل تواریخ[2] اور پُرانے سکے اور قدیم عمارتوں اور زبانوں کی طرف بھی توجہ ہوگی اور ترقی تجارت و صنائع و فنون مد نظر رہے گی۔

۲۔ اور کمیٹی سے یہ کام متعلق ہوں گے: اوّل ہر مہینے میں ایک بار یا دو بار جلسۂ کمیٹی منعقد کرنا، دوم تقرر کتب خانہ و مکان مطالعہ، سوم منتخب تجویزوں کا چھاپنا۔

۳۔ جب یہ تقریر ختم ہو چکی تو تجاویز ذیل قرار پائیں اور یہ بات ٹھیری کہ اِن تجویزوں پر نظر ثانی کرنے کو ایک اور جلسہ یکم اگست کو حسن انعقاد پاوے۔

اوّل اس سوسائٹی کا نام دہلی سوسائٹی باعث ترقی علوم و رفاہِ عام رکھا جاوے۔

دوم صاحبان مفصلہ ذیل عہدہ دار سوسائٹی مقرر ہوں، جناب کرنیل ہملٹن صاحب بہادر کمشنر و بی پٹیرن جناب کپتان بیکمن صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر دہلی و مرزا الٰہی بخش صاحب[3] بہادر پریسیڈنٹ اور لالہ صاحب سنگھ صاحب

---

[1] اِس سے غالباً سوسائٹی کی انتظامی کمیٹی مراد ہے جو اس جلسے میں قیام پائی! اسکا پورا نام "کمیٹی کارکن" تھا۔

[2] اصل: "نری" جو چھاپے کی غلطی ہے۔

[3] یہ مرزا الٰہی بخش دلی کے شاہی خاندان سے تھے۔ مشہور ہے کہ انھیں نے بہادر شاہ کو گرفتار کروایا۔ انگریز انھیں خوب جانتے تھے مگر ان کی آؤ بھگت کو "اُمورِ مصلحت" میں شمار کرتے ہوں گے۔ دیکھو "غالب" از غلام رسول مہر، تیسری اشاعت لاہور ۱۹۴۶ء، ص ۲۹۰۔

وائس پریسیڈنٹ۔ ڈبلیو کولڈ سٹریم صاحب بہادر جج عدالت خفیفہ آونریری سکریٹری۔

سوم صاحبان ذیل کمیٹی کا رکن کے ممبر مقرر ہوئے؛ ڈاکٹر پینی صاحب بہادر، پادری سمتھ صاحب بہادر، مسٹر فٹز پیٹرک صاحب[1] بہادر اسسٹنٹ کمشنر دہلی، لفٹننٹ ہارکورٹ صاحب بہادر اسسٹنٹ کمشنر دہلی، نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب، پادری وڈلی صاحب بہادر، صاحب پرنسپل بہادر دہلی کالج، رائے بنسی لال صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بہادر دہلی، نواب شہاب الدین احمد خاں صاحب آونریری مجسٹریٹ دہلی، ڈپٹی ولایت حسین خاں صاحب مینوسپل کمشنر دہلی، لالہ مہیش داس صاحب آونریری مجسٹریٹ دہلی، لالہ رام کشن صاحب خلف لالہ چھنامل صاحب آونریری مجسٹریٹ دہلی، شیخ محبوب بخش صاحب آونریری مجسٹریٹ دہلی، پنڈت بشیشر ناتھ صاحب، منشی جیون لال صاحب آونریری مجسٹریٹ دہلی، مولوی ضیاء الدین صاحب اسسٹنٹ پروفیسر کالج دہلی، مولوی جعفر علی صاحب، حکیم محمود خاں صاحب، پنڈت گوپال سہائے صاحب بابو بنک دہلی، لالہ وزیر سنگھ صاحب، نواب نجف خاں صاحب تحصیلدار ضلع دہلی۔

چہارم چندہ جو ممبرانِ کمیٹی سے لیا جائے گا آٹھ آنہ ماہوار سے زائد نہ ہو۔
پنجم گورنمنٹ سے اس امر کی درخواست کی جاوے کہ وہ سوسائٹی کو عمارت عجائب خانہ سے دو کمرے ایک واسطے کمیٹی کے اور ایک واسطے کتب خانہ اور ریڈنگ روم کے عنایت کرے۔

بعد ازاں جلسہ برخاست ہوا۔"

---

[1] دیکھو "حیاتِ جاوید" حصہ ۱، ص ۱۳۳، حصہ ۲، ص ۳۰۰۔

(۴)

اِس پہلے جلسے کی کارروائی سے پایا جاتا ہے کہ دِلّی کے اُس وقت کے کمشنر کرنل ہملٹن کی تحریک اور ترغیب سے سوسائٹی کی بنا پڑی۔ اُس دَور کے اکثر اعلیٰ انگریز حکام کی طرح ہیملٹن کو بھی ہندستان کی زبان اور ادب سے دلچسپی تھی، چنانچہ برٹش میوزیم میں ایک ذخیرہ ہیملٹن کے قلمی نسخوں کا بھی محفوظ ہے۔ دلّی کی عدالت خفیفہ کے جج، کولڈ اسٹریم[1] سوسائٹی کے اِعزازی سکریٹری مقرر ہوئے، جو غالباً لاہور کی "انجمن مطالب مفیدہ" کے بھی رُکن تھے۔ اور انگریز بھی پیش پیش ہیں۔ پریسیڈنٹ دو ہیں، ایک مرزا الٰہی بخش، دوسرے دلّی کے ڈپٹی کمشنر کپتان میک ماہن۔ ماسٹر پیارے لال اِس جلسے میں نہیں، پھر بھی وہ غالباً شروع ہی سے سوسائٹی کے کارکنوں میں تھے اور سکریٹری کی خدمت کئی برس انجام دیتے رہے۔ بہت ممکن ہے اُن کے تقرر کا ذکر رسالے کے دوسرے شمارے میں آیا ہو جو موجود نہیں۔ دِلّی کے بہت سے ممتاز لوگ کارکن کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے شریک ہیں مگر مفتی صدرالدین خاں "آزردہ" اور مرزا اسد اللہ خاں "غالب" کا نام ابھی نہیں آیا۔ مفتی صاحب ایک تو بہت بوڑھے تھے اور بیمار، دوسرے حکومت کے سخت معتوب[2]۔ مرزا صاحب ہاتھ پانو مار کے معتوبوں کے دائرے سے نکل آئے تھے، دربار بھی کھل گیا تھا[3]، پر بڑھاپا اُن کا بھی تھا۔ اِس جلسے میں، جو مشورے کے لیے اور انتظامی کمیٹی بنانے کی غرض سے کیا گیا تھا، مرزا صاحب کو شریک ہونے کی تکلیف نہ دی گئی ہوگی۔ اگلے جلسے

---

[1] دتاسی نے اِن کا نام C (ک) کی جگہ G (گ) سے لکھا ہے اور انھیں کو سوسائٹی کا بانی خیال کیا ہے۔ (خطبات، ص ۲۳۹۔ اردو ترجمہ، ص ۵۶۴، یہاں ترمیم چاہتا ہے۔)

[2] "غالب" از غلام رسول مہر، تیسری اشاعت، ص ۲۷۹۔ ۲۸۲، ۲۸۵۔

[3] ایضاً، ص ۳۱۸۔

میں تشریف لاتے ہیں۔

(۵)

غدر سے پہلے بھی کچھ ادبی یا علمی انجمنیں جا بہ جا قائم تھیں، مگر وہ یا تو زیادہ دن چلیں ہی نہیں یا اُس شورش کے زمانے میں درہم برہم ہو گئیں۔ اِن میں سب سے ممتاز دہلی کالج کی "ایجوکیشن کمیٹی" تھی جو ۱۸۳۵ء میں قائم ہوئی تھی اور بعد کو "دہلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی" اور مختصراً "ورنیکلر سوسائٹی" یا "ٹرانسلیشن سوسائٹی" کہلانے لگی۔ اِسی کو "اُردو سوسائٹی" بھی کہتے تھے[۵۱] ظاہراً اِس لیے کہ اِس نے مختلف زبانوں سے نہایت اہم کتابوں کی ایک بڑی تعداد اُردو میں منتقل کر لی تھی اور ۱۸۵۷ء تک اُن میں سے سوا سو سے زیادہ چھپ کر شائع ہو چکی تھیں۔ غدر کے بعد یہ کمیٹی یا سوسائٹی نہ پنپ سکی، گو کہ دہلی کالج بُری بھلی طرح ۱۸۷۷ء تک چلتا رہا۔ جب امن ہو گیا تو نئی نئی انجمنیں کھُلنے لگیں اور بڑے ہی شہروں میں نہیں، چھوٹے چھوٹے شہروں یا قصبوں تک میں بہت سے ادبی، علمی، معاشرتی، اِدارے کھُل گئے، جن میں مقامی حکام بھی بظاہر شوق سے شریک تھے چنانچہ "دہلی سوسائٹی" کے پہلے جلسے میں کرنل ہیملٹن نے اپنی افتتاحی تقریر میں زیادہ سر برآوردہ اور اچھا کام کرنے والے اداروں کا نام لے کر دلی والوں کو شوق دلایا ہے۔ اِن میں سے دو کا خاص طور پر ذکر کیا، لاہور کی، ڈاکٹر لائٹنر کی قائم کی ہوئی "انجمن مطالب مفیدہ" کا اور علی گڑھ کی "سائنٹیفک سوسائٹی" کا۔ لاہور کی انجمن کا افتتاحی جلسہ ۲۱ر جنوری ۱۸۶۵ء کو ہوا[۵۲] لیکن قرینہ کہتا ہے کہ اِس انجمن کا کام اِس سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا؛ جیسے علی گڑھ کی سوسائٹی کے افتتاح کی رسم ۱۴ر فروری ۱۸۶۴ء کو ادا ہوئی، گو کہ سر سید احمد خاں نے اُس کا کام

---

[۵۱] "مرحوم دہلی کالج" از عبدالحق (رسالۂ اُردو ۱۹۳۳ء، ص ۲۶۱)۔

[۵۲] دتاسی "خطبات" ص ۲۹۳ (اردو ترجمہ، ص ۴۹۶)

کم سے کم تین برس پہلے شروع کر دیا تھا[۵۱] اور جب سوسائٹی کچھ کام دکھا کر مشہور ہو چکی اور مناسب موقع ہاتھ آیا تو اِفتتاح کی رسم ادا کی گئی۔ جس زمانے میں "دہلی سوسائٹی" کی بنا پڑی اُسی کے قریب قریب سیال کوٹ اور حصار میں بھی ادبی انجمنیں قائم ہوئیں[۵۲]۔

لکھنؤ میں "مجلس تہذیب" یا "انجمن تہذیب" (جسے عام طور پر "جلسۂ تہذیب" کہتے تھے) ۱۸۶۸ء میں قائم ہوئی تھی جس کے پہلے سکریٹری منشی شیو نرائن تھے۔ وہ بھی ایک رسالے کی شکل میں اپنے جلسوں کی کارروائی کو شائع کرتی رہتی تھی[۵۳]۔ رسالے کے سرِورق پر ایک دوبیت کا "قطعۂ تاریخ بنائے انجمن تہذیب" چھپا کرتا تھا جس کا یہ مصرع مادۂ تاریخ تھا:

"انجمن افروزِ عقل جلسۂ تہذیب ہے"[۵۴]

"جلسۂ تہذیب" کم سے کم بیس برس بڑی سرگرمی سے اور بڑی کامیابی کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اُس کے بعد وہ رونق نہ رہی۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے آخر یا بیسویں کے شروع میں، جب یہ انجمن مُردہ ہو چکی تھی، کچھ صاحبوں نے اسے جِلانے کی فکر کی اور اُس کا نتیجہ بس اتنا ہوا کہ ۱۹۰۲ء میں اس کی حیثیت ایک خاموش سے کلب کی تھی اور اُس کے کمروں میں، جو گونگے نواب کی بارہ دری (محلہ امین آباد) میں تھے، چند تعلیم یافتہ اصحاب شام کو جمع ہو جایا کرتے تھے۔ بعد میں "جلسۂ تہذیب" اور

---

[۵۱] "حیاتِ جاوید" حصّہ ۱، ص ۱۰۹؛ حصّہ ۲، ص ۲۷ - ۳۹۔

[۵۲] دتاسی "خطبات" ص ۲۳۹ (اردو ترجمہ ص ۴۶۵)۔

[۵۳] دتاسی "خطبات" ص ۴۰۸ و ۴۷۴ (اردو ترجمہ، ص ۶۷۷ و ۷۹۰) اور تبصرہ جلد ۱، ص ۱۵ اور ۱۴ وغیرہ جن کا حوالہ اوپر آ چکا ہے۔

[۵۴] اِس مصرعے سے ۱۸۶۸ نکلتے ہیں۔ دتاسی نے اپنے ۱۸۶۹ء کے خطبے ("خطبات" ص ۴۷۴) کے حاشیہ ۳ میں اِس مصرع کے لفظوں کو لاطینی حرفوں میں لکھا ہے۔ نہیں معلوم مترجم صاحب اِس اہم حاشیے کو چھوڑ کیوں گئے (اردو ترجمہ، ص ۷۹۱)

اُس کا کتاب خانہ انجمن "رفاہِ عام" کی عمارت میں اُٹھ گیا اور اب تک وہیں ہے۔ منشی وصی احمد انگر، ایڈوکیٹ لکھنؤ نے، جو اِدھر کئی برس "جلسۂ تہذیب" کے سکریٹری رہ چکے ہیں، مجھے بتایا کہ جلسے کے کتاب خانے میں کتابیں تو پانچ ہزار جلد سے کچھ اوپر ہیں مگر خود انجمن کے مطبوعات میں سے کسی چیز کا وہاں ایک نسخہ بھی نہیں۔

(۶)

"دہلی سوسائٹی" کا دوسرا جلسہ دو ہفتے بعد ۱۱ اگست ۱۸۶۵ع کو ہوا۔ باوجود بڑھاپے کے ضعف اور بیماریوں کی تکلیف کے مرزا غالب بھی شریک ہوئے۔ ممبروں کی فہرست میں اپنا نام لکھا، ایک مضمون بھی پڑھا۔ مضمون میں بڑے لطیف پیرائے میں بڑھاپے کا عذر کر کے گویا آئندہ جلسوں میں حاضر آنے سے معافی بھی چاہ لی۔ مگر تحریری مراسلات کا جواب دینے کا وعدہ اِن لفظوں میں کیا:

"اگر کسی امر میں بذریعۂ خط مجھ سے کچھ پوچھا جائے، تو وہ لکھ سکتا ہوں جو میری رائے میں آئے۔"

اس وعدے کو پورا بھی کیا، جیسا کہ رسالے کے ایک اگلے شمارے میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک اور وعدہ یہ بھی تھا:

"اگر تحریر نظم و نثر فارسی و اردو کا حکم آوے تو لکھ کر بھیج سکتا ہوں۔"

حکم کوئی ایسا، جہاں تک معلوم ہوتا ہے، بھیجا نہیں گیا۔ یہ قصور انجمن کا تھا۔

اس جلسے میں سب سے پہلے سوسائٹی کے وائس پریسیڈنٹ، لالہ صاحب سنگھ نے اپنے مضمون "طریقۂ مہاجنی ہندوستان" کا ایک حصہ پڑھا اور یہ پہلا مقالہ تھا جو انجمن کے سامنے پڑھا گیا۔ "پاو گھنٹے تک نوٹ کے فوائد کے باب میں مباحثہ ہوتا رہا اور اثنائے گفتگو میں پادری اسمتھ صاحب اور جناب کرنل ہیملٹن صاحب نے نوٹ کے بہت سے فوائد بیان کیے۔" دوسرا مضمون منشی جیون لال صاحب نے "فوایدِ مطالعۂ علم تاریخ" پر پڑھا۔

"پھر صاحب کمشنر بہادر نے نواب اسد اللہ خاں غالب سے فرمایا کہ میرزا صاحب آپ نے بھی کوئی مضمون ہماری سوسائٹی کے لیے لکھا ہے۔ نواب صاحب نے بیان کیا کہ میں نے کچھ لکھا ہے مگر مجھ میں یہ طاقت نہیں کہ کھڑا رہ کر سناؤں اگر اجازت ہو بیٹھے بیٹھے پڑھوں صاحب موصوف نے فرمایا بہت اچھا۔ نواب صاحب نے اُسی وقت اپنی جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر پڑھنا شروع کیا اُس میں کچھ حال تباہی شہر دہلی اور کمی بارش کا تھا سب حاضرین جلسہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور نواب صاحب کی بہت تعریف کی اس کے بعد سکریٹری نے مضمون اشتہار سوسائٹی کا پڑھا وہ سب نے پسند کیا اور کہا کہ یہ اشتہار چھاپ ہو کر مشتہر کیا جاوے۔ پھر فہرست چندہ یکمشت پیش ہوئی اور جو جو صاحب اُس وقت جلسے میں موجود تھے ممبر سوسائٹی مقرر ہوئے اور سب نے ایک کاغذ پر اپنے نام لکھ دیے۔" (ص ۵)

اِس کے بعد صفحہ ۱۶ تک اور جلسوں کی روداد یں ہیں، جن میں کوئی خاص دلچسپی کی بات نہیں، سوا اِس کے کہ ۱۷ نومبر کے جلسے میں جو پانچ نئے ممبر ہوئے اُن میں "مولوی عبد اللطیف خاں صاحب بہادر" اور "سید احمد خاں صاحب بہادر" بھی ہیں۔ صفحہ ۱۶ سے ۱۸ تک ایک فہرست سوسائٹی کے ممبروں کے ناموں کی ہے، جس میں "صاحبان انگریز" کے تحت ۱۷ نام ہیں اور "صاحبان ہندوستانی" کے تحت ۷۶ نام اور ان میں "۳۰۔ نواب اسد اللہ خاں صاحب غالبؔ" اور "۶۰۔ منشی ذکا اللہ صاحب" ہیں، پھر "۶۶۔ سید احمد خاں صاحب بہادر"۔

(۷)

غالبؔ نے جو مضمون ۱۱ اگست ۱۸۶۵ء کے جلسے میں پڑھا تھا اور جو پہلے شمارے کے صفحہ ۲۲ پر شروع ہو کر صفحہ ۲۴ پر ختم ہوتا ہے، یہاں نقل کیا جاتا ہے[۱]:

"مضمون نواب اسد اللہ خاں صاحب المتخلص بہ غالبؔ"

---

[۱] مالک رام صاحب نے ستمبر ۱۹۳۹ء کے "ادبی دنیا" لاہور میں اِس مضمون کو شائع کیا تو تعارف

"حکامِ معدلت فرجام اور صاحبانِ والا مقام کی جناب میں اور حاضرانِ انجمن اور
دانندگانِ ہر علم و فن کی خدمت میں بلکہ جو شخص خدا پرست و حق شناس ہے اوس سے[1]
میرا التماس ہے کہ یاد کرو ۱۸۵۷ء میں دہلی کے رہنے والوں نے حاکموں پر شہر کا
دروازہ بند کر دیا اور ایسے فرمانروایانِ دادگر سے لڑائی کا قصد کیا، میگزین کا دروازہ
کھلوایا اور اونھیں کی گولی بارود سے ان پر آگ کا مینہ برسایا۔ چار مہینے چار دن
ظلم کی آنچ کی تیزی رہی، قلعہ اور شہر اور باہر خونریزی رہی۔ ناگاہ قہرِ الٰہی اس
شدت سے نازل ہوا کہ ہر جاندار کو جینا مشکل ہوا۔ قومِ انگریز کو خدا نے
فتح عنایت کی، انھوں نے سیاست کے بعد رعیت کی رعایت کی۔ ہر چند حکام کو
عفوِ جرائم منظور رہا، مگر قہرِ حاکمِ حقیقی بدستور رہا، نہ مکین کا پتہ نہ مکان کے آثار،
نہ وہ گلی کوچے نہ وہ بازار۔ مانا کہ شہر کی صورت اب اوس سے بہتر ہے، مگر وہ عمارت
جس پر خدا کے قہر کی آندھی چلی تھی وہ کدھر ہے۔ شعر

سپس ہر آئینہ شہرے جدید خواہد بود
نہ آن کہ شاہجہان ساخت در زمانِ قدیم

رفعِ فتنہ و فساد، ظہورِ امن و دادِ مسلم، لیکن قہرِ الٰہی سے کچھ پیش نہیں جاتی،
خلافِ تقدیر تدبیر بن نہیں آتی۔ تین برس برابر کال رہا، ہر شخص خستہ و بدحال
رہا۔ آب و ہوا کی ناسازگاری طرح طرح کی مصیبت، رنگ رنگ کی بیماری، کلیجوں
کا تپ کی حرارت سے سلگنا، گھروں میں جا بجا آگ کا لگنا، ہوا شرارہ ریز، خاک
شعلہ انگیز، دریا اور کوئے کا پانی زہر آب، مینہ کے پانی کی بوند گوہرِ نایاب۔

کے طور پر لکھا: "مرزا کی یہ تحریر ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ ...." "ادبی دنیا"
کے دفتر والوں نے "تحریر" کے لفظ کو "خط" کا ہم معنی جان کر مضمون کا عنوان "غالب کا ایک غیر
معروف خط" قرار دیا۔ کچھ کتابت کی غلطیاں متن میں بھی در آئیں۔

[1] اصل میں یوں ہی ملا کر لکھا گیا ہے۔ مقصود ہے: "اوس سے"

اساڑھ اور ساون، برسات کے دو مہینے، تمام ہوئے۔ ساون کے آخر اور بھادوں کے اوّل دو چار مینہ ہوئے، جس میں پانی اسی قدر برسا کہ زمینداروں نے حاصلِ فصل ربیع سے ہاتھ دھولیے۔ پایانِ کار کا حال خدا جانے، خلق اُدس کے اسرار کو کیا جانے۔ گرانی اور ارزانی ایک امرِ عام ہے، مجھے خاص اپنے عرضِ مُدّعا سے کام ہے۔ بوڑھا ہوں ناتوان ہوں۔ سچ اگر پوچھیے، تو نیم جان ہوں ؎

ضعف نے غالبؔ نکمّا کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میں کہاں، اور بزم نشینی کہاں، نظم و نثر میں وہ رنگینی کہاں۔ سرکار کی خدمت گذاری کا شائق ہوں، مگر اب صرف دو کام کے لائق ہوں۔ اگر کسی امر میں بذریعۂ خط مجھ سے کچھ پوچھا جائے، تو وہ لکھ سکتا ہوں جو میری رائے میں آئے۔ یا اگر تحریرِ نظم و نثرِ فارسی و اُردو کا حکم آوے، تو لکھ کر بھیج سکتا ہوں۔ آیندہ حکام کے پسند نہ ہو یا مقبول ہو جاوے۔ ۱۸۰۶ء عیسوی سے جس کو آج ساٹھ برس ہوئے سرکارِ انگریزی کا نمک خوار ہوں اور ۱۸۵۵ء یعنی دس برس سے شہنشاہِ بحرو برحضرتِ فلک رفعت ملکۂ معظمہ کا مدحت نگار ہوں۔ دو قصیدے میرے ولایت پہنچ گئے۔ اُن میں سے ایک کی رسید کی اطلاع مجھ کو آگئی۔ تیسرا قصیدہ میرے مسودات میں موجود اور مطلع اوس کا یہ ہے ؎

نامہ زِ وکٹوریا چو نامور آمد
از اُفقِ نامہ آفتاب برآمد

یہ قصیدہ اوس[1] کے سزاوار ہے کہ ایران بھیجا جائے اور وہاں کے شعرا سے داد مانگی جائے۔

اب میں جناب صاحب کمشنر بہادر اور مجموعِ صاحبانِ عالی شان کو سلام کرتا ہوں اور نگارش کو تمام کرتا ہوں۔

---

[1] اصل میں "اوس" ہی ہے۔

راقم اسد اللہ خاں شاعر غالب تخلص۔
برادر زادۂ نصر اللہ بیگ خاں بہادر رئیس سونگ[1] سونسا۔
"مرقومہ ۱۱ ماہ اگست ۱۸۶۵ء"

(۸)

دل چسپی سے خالی نہ ہوگا اگر یہاں اور مضمونوں کا بھی ذکر کر دیا جائے جو بعض اور صاحبوں نے پڑھے۔

پہلے شمارے میں (۱) رائے بنسی لال "فواید ہر ایک قسم کی حروف شناسی کے بیان میں"؛ (۲) نواب شہاب الدین احمد خاں "علم اخلاق" پر جو یوں شروع ہوتا ہے: "خدا کو سجود اور انبیا کو درود، حکام کو اکرام اور احباب کو سلام، بعد اس کے ہیچمدان شہاب الدین احمد خاں ابن نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر گذارش کرتا ہے کہ علمِ اخلاق، ایسا بڑا علم، جس کو ہم کہہ سکتے ہیں انتہائے علوم ہے۔ علم طب کی بزرگی میں کچھ کلام نہیں مگر وہ معالجۂ جسمانی اور یہ حکمتِ روحانی۔ جتنا شرف روح کو جسم پر، اسی قدر فضیلت علم اخلاق کو علم طب پر۔ پھر علم اخلاق کو دو قسم پر منقسم جاننا چاہیے۔ ایک موہبتی وہ خاص انبیا کے واسطے ہے"؛ (۳) لالہ چندو لال مدرس مشن اسکول "ان مختلف زبانوں اور حرفوں کی بابت جو ہندوستان میں اب جاری ہیں اور من جملہ اُن کے کون سے حروف اس قابل ہیں کہ بہ ترجیح اوروں کے تمام ملک میں جاری ہوں اور اُن سے کیا فائدے حاصل ہوں گے" (دیوناگری حرفوں کی حمایت میں)۔ (۴) شیخ محبوب بخش "واسطے ترقی تجارت اور دفع مضرات تجارت کے کون سی تدبیریں قریب القیاس اور ممکن الوقوع ہیں ان کو بیان کرد" [کذا]۔ (۵) منشی جیون لال "احوال نوشیروانِ عادل بادشاہ ایران کا جس کا لقب کسریٰ بھی تھا اور ابو الخیر"

---

[1] اصل میں یوں ہی ہے۔

تیسرے شمارے میں ـــــ پندرہ روزہ جلسوں کی روودادوں کے بعد دو سپاس نامے ہیں، ایک سر ڈانلڈ میکلوڈ، لفٹننٹ گورنر پنجاب[۱] کی، دوسرا ہیملٹن کمشنر دہلی کی خدمت میں، اور ہیملٹن کا جواب ہے۔ پھر صفحہ ۲۸-۲۹ پر اُن مضمونوں کی فہرست ہے جو سوسائٹی میں پڑھے گئے تھے۔ بخلاف اور شماروں کے اِس میں جتنے مضمون شامل ہیں، اُن میں ہر ایک کے صفحوں میں گنتی کے ہندسوں کا سلسلہ الگ ہے۔ غالب کے مضمون کا ذکر فہرست میں اِن لفظوں میں ہے :

"نواب اسد اللہ خاں غالب در باب تباہی شہر دہلی" (ص ۲۹)

ایک مضمون "در باب راہ و رسم صاحبان انگریز و ہندوستانی مصنفہ سکرٹیری" ماسٹر پیارے لال کا ہے۔ اُس میں وہ ایک جگہ کہتے ہیں :

"اس ملک کے آدمی احسان فراموش نہیں ہیں۔ جو شخص ان سے ذرہ سی محبت کرتا ہے یہ اوس سے سہ چند بلکہ چو چند محبت کرنے کو تیار ہیں بقول جناب اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب ؎

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے
جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور
جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے
اخلاص کا ہوا ہے اسی ملک سے ظہور
ہے اصل تخم ہند سے اور اس زمین سے
پھیلا ہے سب جہان میں یہ میوہ دور دور"

چوتھے شمارے میں ـــــ ستمبر ۱۸۶۷ء سے اپریل ۱۸۶۹ء تک کے جلسوں کی کارروائی درج ہے۔

پانچویں شمارے کا جو ذکر اوپر (فقرۂ ۲ میں) آچکا ہے کافی ہے۔

---

[۱] دیکھو "حیات جاوید" حصۂ ۲، ص ۳۰۰۔

(۹)

یہ وہ زمانہ ہے کہ غالب کے بڑھاپے کا آخری وقت ہے، ضعف کی شدت ہے، امراض کا ہجوم ہے۔ ہاتھ پانو قابو میں نہیں۔ ۲۲ اکتوبر ۱۸۶۷ء کے جلسے کی روداد میں ہے:

"دو جلد گلزار ہندی، بابو کنھیا لال[1] نے لاہور سے اور دو جلد قصہ بہمن، منشی حکم چند[2] نے اور چھ جلد سبد چین، نواب اسد اللہ خاں صاحب غالب نے سوسائٹی کو عنایت کی۔ ممبران سوسائٹی نے اُن کا شکر ادا کیا بعدہٗ جلسہ برخاست، اور چیرمین کا شکریہ ادا کیا گیا۔" (ص ۴)

---

[1] یہ ایکزیکوٹیو انجینیر اور مختلف مباحث پر متعدد کتابوں کے مؤلف یا مترجم تھے جو ۱۸۵۴ سے ۱۸۶۹ء تک شائع ہوئیں۔ ان کی "گلزارِ ہندی"، اخلاقی مطالب کی کئی مثنویوں پر مشتمل ہے اور ۱۸۶۷ء میں لاہور میں چھپی (دتاسی، تاریخ ادب، ج ۲، ص ۱۵۹ - ۱۶۱۔)

[2] انھوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی اور کلکتہ یونی ورسٹی سے بی۔ اے اور ایم۔ اے میں امتیاز حاصل کیا۔ دہلی کالج میں درس بھی دیتے تھے۔ "قاطع القاطع" کے مصنف پر غالب نے نالش کی تو یہ بھی مرزا صاحب کے گواہوں میں سے تھے اور ۲۳ مارچ ۱۸۶۸ء کو ان کی گواہی ہوئی۔ جرح میں سوال ہوا: "تمھاری تصنیف پر مرزا صاحب نے تصدیق لکھی؟" جواب ان کا تھا: "ہاں، لکھی ہے اور دیگر حکام نے بھی لکھی ہے۔" (رسالہ "اردو" ۱۹۲۳ء، ص ۶۹؛ ۱۹۲۳ء، ص ۱۵۱ اور ص ۱۶۰) عجب نہیں وہ تصنیف یہی "قصہ بہمن" ہو۔ حکم چند ۱۸۷۰ء سے پہلے امرت سر میں تحصیل دار اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ قانونی کتابوں کی تالیف ۱۸۵۹ء میں یا کچھ پہلے شروع کر دی تھی۔ (دتاسی، تاریخ ادب، جلد ا، ص ۶۱۴)۔ تقریباً دس بارہ برس بعد حیدرآباد چلے گئے اور وہاں معزز خدمتوں پر کام کرتے رہے۔ آخر میں مجلس وضع قانون کے نائب معتمد تھے کہ ۱۹۰۱ء میں (کوئی ۶۸ برس کی عمر میں) انتقال کیا۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران میں بڑے پائے کی قانونی تصنیفیں شائع کرتے رہے جو خاص کر ان کی شہرت کا باعث ہوئیں۔

اس جلسے سے پہلے ستمبر ۱۸۶۷ء کو جلسہ ہوا تھا۔ مرزا صاحب نے "سبد چین" کے نسخے ۱۰ ستمبر اور ۲۲ اکتوبر کے درمیان کسی تاریخ بھیجے ہوں گے۔ سبد چین مُنتصفِ ربیع الثانی ۱۲۸۴ ہجری (یعنی اگست ۱۸۶۷ء) میں دِلّی کے "مطبع محمدی" میں چھپی تھی۔ نسخے اس کے آخر یا شروع ستمبر میں چھاپے خانے سے تیار ہو کر نکلے ہونگے۔ غالب نے سوسائٹی کو بِلا تاخیر یاد کیا۔

کوئی برس بھر بعد، ۲۱ جولائی ۱۸۶۸ء کے جلسے میں:

"سکریٹری نے روبکار محکمۂ ڈائرکٹری مورخہ ۷ اپریل درباب رائے کتاب "مفزعۃ العملہ"[1] اور کیفیت[2] جناب مرزا نوشہ صاحب[3] و نواب علاء الدین احمد خاں صاحب پڑھ کر سنائی۔ جناب مرزا صاحب کی رائے کو سب نے پسند کیا اور جملہ ممبروں کی رائے سے طے ہوا کہ ممبران سوسائٹی میں سے جو صاحب اور اپنی رائے اس باب میں لکھیں وہ اور نیز یہ جواب پڑھی گئی ہیں ڈائرکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں بعد ترمیم مرسل ہوں۔" (ص ۲۲)۔

---

[1] "مفزع" یا "مفزعۃ" یعنی پناہ کی جگہ۔ یہ کتاب یا رسالہ اُسی بحث سے متعلق ہوگا جو ایک ماہانہ رسالے "معلم العملہ" کا تھا۔ دتاسی ۱۸۶۲ء کے خطبے میں کہتا ہے "ایک موقّت مجموعہ، کا نام "معلّم العملہ" ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ سرکاری عملے یا اہل کاروں کے لیے ضروری معلومات بہم پہنچائی جائے" (خطبات ص ۱۸۸، اردو ترجمہ ۳۲۲)۔ پھر اپنی تاریخ ادب (مطبوعہ ۱۸۷۰ء، ج ۲، ص ۱۲) میں بتاتا ہے کہ اِس رسالے کو سدا سکھ ترتیب دیتے ہیں اور ڈائرکٹر تعلیمات شمال مغربی کی نگرانی میں شائع ہوتا ہے۔ "معلّم العملہ" کا ایک شمارہ (ج ۱، نمبر ۱ بابت اکتوبر ۱۸۵۵ء) مختار الدین احمد صاحب آرزو نے حاصل کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "باہتمام منشی سدا سکھ لال کے مطبع انوار الابصار میں چھپا" تھا۔ مضمون کچھ عام دل چسپی کے ہیں اور زیادہ تر قوانین و ضوابط کے متعلق اطلاعیں ہیں۔

[2] یعنی کیفیت لکھی ہوئی اِن اوراِن صاحب کی۔ "رپورٹ" کیلئے "کیفیت" بولتے تھے۔ [3] غالب کو۔ "رسالہ دہلی

۲۱ر جولائی سے پہلے ایک جلسہ ۱۴ر جولائی کو ہوا تھا، مگر اُس میں کچھ کارروائی (شاید نصاب کے نہ ہونے کے سبب) نہیں ہوئی اور اُس سے پہلے ۲۷ر اپریل کو جلسہ ہوا تھا۔ "مفرعۃ العملہ" کے متعلق جو روبکار ڈائرکٹر کے دفتر سے جاری ہوا تھا وہ ۶ر اپریل کا تھا مگر کتاب کے گشت میں کچھ دیر ضرور لگی ہوگی اور ۲۷ر اپریل کے جلسے میں رائیں پیش نہیں ہوئیں۔ بہر تقدیر کتاب غالب کے پاس اپریل کے آخر یا مئی کے شروع میں پہنچی ہوگی اور اُنھوں نے، یوں سمجھنا چاہیے، مئی کے وسط اور جولائی کے اوائل کے درمیان کسی تاریخ رائے لکھی ہوگی۔ کیا خوب ہوتا کہ جو رائیں آئی تھیں وہ روداد میں پوری پوری درج کردی گئی ہوتیں۔

سوسائٹی کے سکریٹری منشی پیارے لال "آشوب"[۱] جو زیادہ تر "ماسٹر" کر کے مشہور تھے، غالب کو بہت عزیز تھے۔ جب وہ لاہور میں کیوریٹر مقرر ہوئے اور دلّی سے لاہور جانے والے تھے، تو سوسائٹی کے سکریٹری کی خدمت سے بھی استعفا دیا۔ ۹ر دسمبر ۱۸۶۸ء کے جلسے میں اُن کا استعفا پیش ہو کر منظور ہوا" اور ماسٹر چندو لال سکریٹری کیے گئے۔" اُسی جلسے میں "جملہ ممبران کی طرف سے سکریٹری پیارے لال کو ایک سپاس نامہ دیا گیا۔" (ص ۳۰)

یہ سپاس نامہ رسالے کے شمارہ (۴) کے صفحہ ۳۹ پر شروع ہو کر صفحہ ۴۲ پر ختم ہوتا ہے۔ اخیر دو صفحوں پر ممبروں کے (یعنی سپاس نامہ دینے والوں کے) نام ہیں۔ غالبؔ کے نام کے آگے کچھ عبارت بھی ہے جو اُنھوں نے سپاس نامے پر دستخط کرنے کے وقت لکھ دی ہوگی۔ رسالے میں یہ نام مع القاب کے لکھے

سوسائٹی" کا یہ شمارہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کے بعد شائع ہوا، نہیں تو "جناب صاحب کمشنر بہادر کی "دہلی سوسائٹی" کے رسالے میں اپنا عرف دیکھ کے غالب پر جانے کیا گذرتی۔

[۱] یہ اُس مقدمے میں غالب کے گواہوں میں تھے ("اردو" ۱۹۴۲ء، ص ۱۵۴) نیز دیکھو "ادبی خطوط غالبؔ" مرتبہ مرزا محمد عسکری، ص ۱۸۴۔

گئے ہیں اور غالب کا نام اور وہ عبارت اس صورت سے چھپی ہے کہ سپاس نامے پر دستخط کرنے والوں کے ناموں کی فہرست ترتیب دینے والے نے "مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب" لکھ کر ایک کمان کھینچ دی اور اُس کے بعد غالب کی لکھی ہوئی عبارت نقل کی ہے، اِس طرح :

"مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب (فقیر اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے کہ بابو پیارے لال کی مفارقت کا جو غم و اندوہ ہوا ہے میرا جی جانتا ہے بس اب میں نے جانا کہ میرا دلّی میں کوئی نہیں ہے۔" (ص ۴۱)

(۱۰)

مرزا غالب دُنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ دو شنبے کا دن ہے، دوسری ذیقعد بارہ سَو پچاسی ہجری اور پندرھویں فروری اٹھارہ سَو اُنھتّر عیسوی[1] "دہلی سوسائٹی" کی طرف سے کسی ماتمی جلسے کا ہونا یا اُس کے کسی جلسے میں کوئی تعزیت کی تحریک یا تجویز ہونا اُس کی رودادوں سے پایا نہیں جاتا۔ تعجب ہے۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ ارکانِ انجمن نے یوں سوچا ہو :

"ہمارے ہی گھر تو موت ہوئی ہے۔ ہم پُرسا دینے کہاں جائیں؟"

اور خاموش ماتم کو بین و بُکا سے بہتر جانا ہو۔ باہر سے ایک تعزیت نامہ آتا ہے اور جلسے میں پڑھا جاتا ہے۔ اِس کی روداد یہ ہے :

۱۲ / مارچ ۱۸۶۹ء، جمعے کے دن، ایک معمولی عام جلسہ سوسائٹی کا منعقد

---

[1] تقویم کی رُو سے دوشنبہ، ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ہے تیسری ذیقعد ۱۲۸۵ ہجری کے مگر جتنے لوگ جو اُس وقت دلّی میں موجود تھے یک زبان ہیں کہ اُس دوشنبے کو ذیقعد کی دوسری تھی، تو معلوم ہوا کہ دلّی میں ذی قعد کا چاند ۱۳ / فروری کو دیکھا گیا تھا۔ ایسی صورت میں تقویم کا لحاظ نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ ایک چیز جب آنکھ سے دیکھ لی تو تخمین کا کیا دخل ہے؟

ہوتا ہے۔ حاضرین کی فہرست میں حکیم غلام رضا خاں کا نام آتا ہے اور اسی کے بعد "مرزا حسین علی خاں صاحب فرزند متبنّیٰ مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب مرحوم" کا نام۔ صدر نشیں "کرنیل مکنیل صاحب بہادر سٹار آف انڈیا" ہیں۔ روداد کا فقرہ ۳ ہے:

"سکریٹری نے خط آمدہ انجمن تہذیب لکھنؤ جو درباب تعزیت مرزا نوشہ صاحب مرحوم آیا تھا مرزا حسین علی خاں صاحب کے روبرو جلسۂ عام میں پڑھا" [1]

(۱۴ فروری ۱۹۶۹ء)

---

[1] نہایت افسوس ہے کہ خط جو جلسے میں پڑھا گیا تھا سوسائٹی کی مطبوعہ روداد میں نقل نہیں ہوا۔

خواجہ احمد فاروقی

معرکۂ غالب و حامیانِ قتیل

ایرانی ہندی نزاع کی روشنی میں

علاؤالدین خلجی کا زمانہ تاریخ ہند کا ایک درخشاں باب ہے۔ منگولوں کی سفاکی و بے رحمی اور خلجیوں کی قدردانی و علم پروری کی وجہ سے ہندوستان علم و فضل کا مرکز بن گیا تھا اور ایشیا کی منفرد ہستیاں یہیں آکر جمع ہوگئی تھیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے علاؤالدین خلجی کے دربار کے فقرا، علما، فضلا اور شعرا کی طویل فہرست دی ہے شبلی نے ان میں سے صرف ۶۰ اکابر کا ذکر کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے:۔

"لیکن امیر خسرو کے آفتاب کمال نے ان تمام ستاروں کو بے نور کر دیا تھا ...... اس وسیع مرقع میں صرف امیر موصوف کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے[1]"

ادبیات میں ملکی اور غیر ملکی سوال کی ابتدا اور ایرانی ہندی نزاع کا آغاز بھی تقریباً اسی زمانے سے ہوتا ہے۔ خسرو کی جامعیت اور اس کی شاعری اور زبان دانی کا اعتراف تقریباً تمام ناقدین نے کیا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے:

"در حق او مرتبہ سخن گزاری ختم تمام است[2]"

خسرو کو تمام اکابر نے "طوطیٔ ہند" مانا ہے:

عرفی ؎ بہ روح خسرو ازیں پارسی شکر دارم
کہ کام طوطیٔ ہندوستاں شود شیریں

---

[1] شعر العجم ج ۲ ص ۹۶ [2] تذکرۃ الشعرا (لاہور) ص ۱۵۸

تاہم بعض شعرا قومی تعصب کو نہیں چھپا سکے۔ عبید جو خسرو کا معاصر ہے لکھتا ہے:

غلط افتاد خسرو راز خامی
کہ سکبا پخت در دیگ نظامی

اس تعصب کی ایک وجہ یہ ہے کہ امیر خسرو نے بعض محاورے ایسے باندھے ہیں جو اہلِ زبان کے یہاں نہیں ملتے۔ بعد میں یہ مسئلہ "استعمال ہند" بہت بڑا نزاعی سوال بن گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کبھی بھی مقامی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ متاخرین میں خانِ آرزو نے بھی اس استعمالِ ہند کو جائز سمجھا۔

فیضی اور عرفی کے اختلافات اور نوک جھونک کی بھی ایک وجہ یہی ایرانی ہندی نزاع تھی۔ خافی خان نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ فیضی کو کتوں کا بڑا شوق تھا سگ بچوں کے سونے کے پٹے پڑے ہوئے تھے۔ عرفی نے فیضی سے پوچھا:

"مخدوم زادہا بہ چہ اسم موسوم اند؟"

فیضی نے کہا: "بہ اسم عرفی"

عرفی نے برجستہ کہا "مبارک باشد"[1]

ابوالفضل بھی عرفی سے جلتا تھا۔ اکبر نامے میں لکھتا ہے:

"دے از سخن سرائی بر و کشودہ بودند۔ در خورنہ گریست و بر پاستانیاں زبانِ طعن کشود۔ غنچہ، استعداد نشگفتہ پژمرد"

اکبر کے زمانے سے شاید ہی کوئی ایرانی شاعر ایسا ہو جس کا کلام اعتراضات کا ہدف نہ بنا ہو۔ عرفی، ظہوری، قدسی، زلالی سب ہی اس تیغ ہندی کے زخم خوردہ ہیں۔ یہی حال ایرانیوں کا تھا۔ حیدری تبریزی اکبر کا معاصر ہے اور اس نے ہندوستان کی داد و دہش سے بڑا فیض اٹھایا تھا لیکن جب وہ ہندوستان اور

---

[1] لیکن فیضی نے اپنے مکاتیب میں عرفی کی بڑی تعریف کی ہے۔

ہندوستانیوں کے بارے میں لکھتا ہے تو اس انداز سے:

در کشور ہند شادی و غم معلوم   آں جا دل شاد و جان خرم معلوم
جائے کہ بیک روپیہ آدم نخرند   آدم معلوم و قدر آدم معلوم

واکہ ہروی لکھتا ہے:

در ہند کہ زادگانش تارک ادب اند
لبریز جہالت اند و فاضل لقب اند

حزیں کا بھی یہی خیال ہے کہ ہندوستان فضل و کمال کے لئے "زمین شور" کا حکم رکھتا ہے اُسی تمام دارالخلافہ میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو رتبۂ فضیلت رکھتا ہو۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ یہ نزاع صرف چند الفاظ کے استعمال کی نہیں تھی بلکہ اس ضمن میں اسالیب و افکار بھی معرض بحث میں آگئے تھے۔ عہد حاضر کے ایک ایرانی محقق نے اِس ہندی اسکول کی تعریف مندرجۂ ذیل الفاظ میں کی ہے:۔

"افکار و احساسات اہالیٔ ایں سرزمین بہ تاثیر عوامل سیاسی وطبیعی بر سیر در عوالم توہم و تخیئل و مجسم انگاشتن معانیٔ باریک و لطیف کہ از عالم مادہ و جسم دُور می باشد متمایل است و در ادائے ایں تخیلات و توہمات وسائل مزبورہ کہ بمنزلہ اصل و انچہ جز ادست از فروع آں می باشد تشبیہ معقولات است بہ محسوسات و بالعکس ولے رعایت تناسب تام بین مشبّہ و مشبّہ بہ و بیان ایں قبیل تشبیہات است بطریق استعارہ کہ نوعے از مبالغہ در تشبیہ می باشد نتیجہ را ایں سبک[۱] بیان پیدائشِ معانی و مضامینے است بسیار غریب و دور از ذہن کسانے کہ با افکار ہندی آشنا نیستند و بہترین نامے کہ بہ دیں طرز بیاں می تواں داد "خیال بندی"

---

[۱] سبک بمعنی روشِ خاص۔

است کہ منتخب و مستعمل خود ہندی ہا است ۔ نمونہ "خیال ہندی" ایں است کہ از مژۂ دل داریک مشتِ سوزن بہ سازند واں را در خیاط خانہ، دل بہ ریزند و خیاط گریہ را بہ گویند تا از تکہ ہا و پارہائے دل برائے چشم پیراہن بہ دوزند واں گاہ ایں معنی را در قالب الفاظ فارسی بہ ریزند و بہ گویند :۔

عرفیؔ ؎ مشت سوزن بہ دلم زاں مژہ تارہ بختہ اند
گریہ از پارۂ دل دوختہ پیراہنِ چشم

و بہ آں کہ بر سرِ مژگاں بے نم خود خاک بہ ریزند واں گاہ دست دل خود را بگیرند و بہ اتّفاق او بہ گدائی روند تا قدرے غم بہ دست آورند و در ادائے ایں معنی گویند :۔

خاک دیگر بر سرِ مژگان بے نم می کنم
دست دل می گیرم و دریوزۂ غم می کنم [1] (نظیری)

علی اکبر شہابی خراسانی نے "روابط ادبی ایرانی و ہند" میں لکھا ہے کہ اس ہندی طرز نے بعض ایرانیوں کو بھی متاثر کیا لیکن ایران کے بلند طبع اور صاحبِ ذوق لوگوں نے اس تقلید کو کبھی پسند نہیں کیا [2]

شہابی نے "سبک ہندی" کی خصوصیات میں :
خیال بافی، مضامین باریک، افکار پیچ در پیچ ۔ خیالات دور از طبیعت و استعارات و تشبیہات غیر لطیف و مخصوص بہ ذوق و طبع ہندیاں" اور "مبالغہ و اغراق و بے ہودہ کاری و تکلفاتِ غیر مستحسن [3] پر زیادہ زور دیا ہے ۔

---

[1] بہ حوالہ "روابط ادبی ایران و ہند" [2] روابط ادبی ایران و ہند (طہران) ص ۹۱
[3] مخدومی قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ تکلفات غیر مستحسن سبک ہندی کے وجود میں آنے سے بہت پہلے فارسی شاعری میں موجود تھے ۔

ہمایوں، اکبر اور جہاں گیر کے زمانے میں ایرانی اثرات نمایاں ہو گئے تھے[1]۔
مغلوں کے آخری زمانے میں تو سیاسی عنانِ اختیار بالکل ایرانیوں کے ہاتھوں میں آگئی تھی۔ سر جادو ناتھ سرکار نے زوال سلطنتِ مغلیہ میں لکھا ہے کہ ۱۷۴۴ء میں ایرانی اثر تمام دربار پر چھا گیا اور تورانی پارٹی کو شکست فاش ہو گئی۔ میر آتش کا عہدہ ایک تورانی سے لے کر صفدر جنگ ایرانی کو دے دیا گیا (۱۱ر مارچ ۱۷۴۴ء) بعد ۱۷۴۵ء میں بادشاہ کے ایما سے صفدر جنگ کے لڑکے (نواب) شجاع الدولہ کی شادی، نواب اسحاق خاں دوم نجم الدولہ کی بہن سے کر دی گئی۔ یہی خاتون وارن ہسٹنگز کے مظالم کا ہدف بنیں، اور تاریخ میں نواب بہو بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ اس رشتے نے ایرانی اثرات کو اور زیادہ مستحکم کر دیا[2]۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۷۳۶ء سے مغلوں کی تاریخ، ایرانی اور تورانی جماعتوں کی باہمی آویزش کی داستان ہے۔ سیاست کے علاوہ ادب کے میدان میں بھی یہ آویزش نظر آتی ہے۔

محمد علی حزیں ۱۱۴۶ھ میں ہندوستان آیا ہے۔ اور اس نے ۳۴ برس عمر عزیز کے اس سرزمین پر بسر کیے لیکن وہ یہ کبھی نہ بھول سکا کہ "میں ایرانی ہوں" اور یہ لوگ "ہندوستانی"۔ وہ ابوالفضل اور فیضی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

"در زاغانِ ہند از یں دو برادر بہتر ترے نہ خاستہ"

سودا کے متعلق حزیں کا یہ جملہ عام طور پر مشہور ہے :-

در پوچ گویانِ ہند خوب می گوئی[3]

---

[1] "مغلوں کے تعلقات ایران سے" از لے رحیم اسلامک کلچر حیدرآباد دکن ۱۹۳۴ء
[2] سرکار: زوال سلطنت مغلیہ ص ۳۵ و ۳۶۔ نیز خاندانِ شیواجی (سرکار) باب اوّل ص ۲۔۱
[3] سودا ص ۹۹

اس زمانے میں ناصر علی اور بے دل کا ڈنکا بج رہا تھا لیکن حزیں دونوں کو مہمل سمجھتا تھا۔

"نظم ناصر علی و نثر بے دل بہ فہم نمی آید۔ اگر مراجعتِ ایران دست دہد برائے رشیخند بزمِ احباب رہ آورد وے بہتر ازیں نیست" [۱]

حزیں کے ان اعتراضات کے خلاف خان آرزو نے آواز بلند کی اور اس سلسلے میں دو اہم کتابیں تصنیف کیں۔ (۱) تنبیہ الغافلین (۲) احقاق الحق۔ لیکن صہبائی کو اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہے۔

تنبیہ الغافلین [۲] میں خان آرزو نے حزیں کے دیوان چہارم پر اعتراضات کیے ہیں اور اس کے تقریباً چار سو اشعار کو غلط ٹھہرایا ہے۔ آرزو کی چند غلطیاں مطلع السعدین میں سیال کوٹی مل وارستہ نے بھی بیان کی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حزیں کی ایرانیت سے بہت مرعوب ہے۔

یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ حزیں نے "تنبیہ الغافلین" کا جواب لکھا اور اس کا نام "رجم الشیاطین" رکھا۔ (نگارستان ۲۱۳) لیکن یہ کتاب ناپید ہے اور جناب منوہر سہائے انور تو اس کے وجود ہی کے منکر ہیں۔

۱۲۶۷ھ میں مولوی امام بخش صہبائی نے 'قولِ فیصل' کے نام سے بظاہر ایک غیر جانب دارانہ کتاب لکھی لیکن اس کی بھی طرز و روش سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی، حزیں کی طرف داری پر تُلے ہوئے ہیں۔

صہبائی نے آرزو کے اعتراضات رد کیے ہیں اور حزیں کی حمایت میں ایرانی شعرا سے استناد کیا ہے [۳] لیکن بعض جگہ وہ بھی سپر ڈالنے پر مجبور ہو گئے ہیں:۔

---

[۱] نگارستانِ فارس، ص ۲۱۲
[۲] ۱۱۵۶ھ میں لکھی گئی۔
[۳] ملاحظہ ہو، غواصِ سخن، (صہبائی) ص ۶۸۳ و ۷۳۱

"نظارگیاں ایں نسخہ دریافتہ باشند کہ صہبائی، ہیچ مداں کمر ہمت راچست بستہ درہر مقام قصدِ آں دارد کہ توجیہے برائے کلام شیخ بہم رساند اما چہ کند درامثال ایں مقامات سپہر می افگند"[1]

اس مباحثے میں اس زمانے کے تمام اہلِ علم نے حصّہ لیا ہے۔ 'مردم' 'دیدہ' کے مؤلف نے آرزو کے بیش تر اعتراضات غلط قرار دیئے ہیں۔ مرزا علی لطف نے بھی ان کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ چناں چہ 'گلشنِ ہند' میں لکھتے ہیں:۔

"۱۱۴۷ھ میں کہ شیخ محمد علی حزیں علیہ الرحمۃ ایران سے شاہ جہاں آباد میں تشریف لائے، تو اس یگانہ، روزگار کی ملاقات کو شاہ و گدا سب آئے، سراج الدین علی خاں سے جس قدر اخلاق کہ مناسب ان کے حال کے پایا شیخ نے ادا فرمایا۔ لیکن اس بزرگ زادے نے نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی اور ناحق اپنی طبیعت اُن سے محجوب کی، آزردہ خاطر وہاں سے گھر آئے۔ اور دیوان شیخ کا دیکھ کر بہت سے شعر سقیم ٹھیرائے۔ چنانچہ وہ سب اعتراض جمع کرکے ایک رسالہ لکھا ہے۔ اور نام اس کا تنبیہ الغافلین رکھا ہے۔ عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے۔ یہیں تو صاف نزاع معلوم ہوتی ہے۔ جب باریک بینوں کی نگاہ اس سے جا لڑتی ہے"[2]

خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی نے ایک مضمون حزیں پر جولائی ۱۹۰۹ء کے 'مخزن' میں لکھا تھا۔ اور اس میں بھی یہ ثابت کیا تھا کہ آرزو کے بعض اعتراضات کسی طرح بھی وقیع نہیں ہو سکتے۔ خان آرزو نے بھی حد کر دی ہے۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے، اس نے خاقانی کو بھی اپنے اعتراضات کی تیغ سے زخمی کیا ہے اور یہ محض اس لئے، کہ حزیں نے خاقانی کو سند کے طور پر پیش کیا تھا۔

---

[1] قول فیصل، لکھنؤ، ایڈیشن ص ۱۳۵

[2] گلشن ہند، (مطبوعہ علی گڑھ)، ص ۲۱

غالباً خان آرزو نے "تنبیہ الغافلین" کے بعد ایک اور چھوٹا سا رسالہ حزیں کی مخالفت میں "احقاق الحق" کے نام سے لکھا ہے۔ مولانا صہبائی نے اس کا جواب اعلاء الحق کے نام سے دیا لیکن تمام اعتراضات کا احاطہ نہیں کیا ہے۔

اعلاء الحق کا لب و لہجہ نہایت درشت اور تلخ ہے۔ خان آرزو کے متعلق لکھا ہے :-

"معرکہ سازِ عرصہ لاف، عناں گستہ نفس سوزی ہائے گزاف، تہمت زدہ امتیاز باطل و حق، صاحبِ نسخہ، احقاق الحق [۱]

ہم نے ادھر جو مرزا علی لطف کا بیان نقل کیا ہے اس سے یہ خیال نہ پیدا ہونا چاہیے کہ حزیں اور خان آرزو کی رنجش صرف ذاتی اغراض کا نتیجہ تھی حقیقت یہ ہے کہ حزیں کی کم نگاہی اور آرزو کی ناگواری کی سطح کے نیچے ایرانی ہندی کش مکش کارفرما تھی۔ تذکرۂ حسینی میں صاف لکھا ہے کہ خان آرزو کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ حزیں فارسی دانانِ ہند کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

آرزو اور حزیں کی ملاقات کا لطیفہ تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے۔ اور سب اس پر متفق ہیں کہ آرزو وہاں سے دل شکستہ لوٹے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ میر محمد افضل ثابت اور آرزو نے حزیں کے اس شعر پر اعتراض کیا ؎

ہر گہہ کہ بہ یادِ دہنت غنچہ نشستم
اندیشہ مرا سر بہ گریبانِ عدم داد

حزیں ان "جاہلانِ ہند" کے اعتراض پر یہ کہہ کر چپ ہو گیا کہ ان کو فارسی سے کیا واسطہ۔

حزیں کے اخلاق و عادات میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ اس کی

---

[۱] اعلاء الحق، نظامی پریس ص ۲۰،۷۔ صاحب نسخہ احقاق الحق سے شبہہ ہوتا ہے کہ صہبائی آرزو کو احقاق الحق کا مصنف نہیں سمجھتے۔

آزاد منشی اور خود پسندی ہے۔ وہ خود کہتا ہے ؎

لائقِ مدح در زمانہ چو نیست
خویشتن را ہمی سپاس کنم

شاہ عالم اور شجاع الدولہ خود اس کے گھر آتے تھے اور ادب اور تعظیم بجا لاتے تھے لیکن وہ ہندوستانی امیروں کو اس لائق نہیں سمجھتا تھا کہ ان کی ملازمت اختیار کرے ؎

یکے از عقل زند لاف کہ بایست گرفت دامن عاطفت شاہ عطا بخش و وزیر
آں یکے می دہم پند کہ در ہند مجوئے کام بے تربیت قدر شناسانِ امیر

محمد شاہ کے زمانے میں ایرانیوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا بادشاہ نے کئی مرتبہ حزیں کو قلم دانِ وزارت پیش کیا لیکن اس نے انکار کر دیا[1]

ایسا آدمی خان آرزو کی قابلیت کا کب معترف ہو سکتا تھا۔ آزاد نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ کسی شخص نے آرزو کی یہ غزل بڑے فخر کے ساتھ حزیں کے سامنے پڑھی ؎

خجل از روئے حبابم کہ بایں تنگیِ ظرف
انچہ در کیسہ، خود داشت بہ دریا بخشید

حزیں نے فوراً اصلاح کی ؎

خجل از چشم حبابم کہ بہ یک ظرف تنک
آں چہ در کاسہ، خود داشت بہ دریا بخشید

اور کہا "ایں بابا از کیسہ تا کاسہ واز تنگی و تنگی فرق نمی کند و باز خود را شاعر گوید"

آزاد ہی نے ایک اور واقعہ نقل کیا ہے۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں آرزو

---

[1] سیر المتاخرین کے مصنف کو حزیں سے بڑا غلو تھا اسی لئے، مخدومی قاضی عبدالودود صاحب اس روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔

کے ایک عقیدتمند (یعنی شاہ لطف اللہ) حزیںؔ کے پاس پہنچے اور اپنا تعارف کرائے بغیر اس شعر کی اصلاح کی درخواست کی ؎

بُتے دارم کہ باشد از حیا مشاطگی ننگش
حنا گر پائے او بوسد ز شوخی می پرد رنگش

حزیںؔ نے کہا "معلوم می شود کہ از کاسہ لیساں حرام زادۂ اکبر آباد است"

آزاد کے اکثر بیانات غلط ہیں چنانچہ یہ روایت بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی، اس لیے کہ شاہ لطف اللہ کا انتقال حزیںؔ کے ہندوستان آنے سے قبل ہو چکا تھا۔ لیکن ان قصّوں سے حزیںؔ اور آرزوؔ کے تعلقات کی نوعیت عوام کی نظروں میں ضرور معلوم ہو جاتی ہے۔

تذکرۃ الاحوال کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حزیںؔ کو اپنی قابلیت اور ایرانی النسل ہونے کا غیر معمولی احساس تھا اور ان کی بد دماغی کبھی دوسرے کے محاسن کا اعتراف نہیں کر سکتی تھی[1]

اس کے بعد ایرانی ہندی نزاع، معرکۂ حامیانِ قتیلؔ و غالبؔ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مرزا غالبؔ اپنا رشتہ، ادبی دودۂ جم سے جوڑتے تھے اور اس پر انھیں غیر معمولی فخر و ناز تھا۔ اس قسم کے اشعار ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں ؎

غالبؔ بہ گہر ز دودۂ زادشمم
زاں رو بصفائے دم تیغ ست دمم

---

[1] نیز ملاحظہ ہو پروفیسر سید حسن عسکری (پٹنہ) کا مقالہ "شیخ علی حزیں پر کچھ نئی روشنی" جو انھوں نے ۱۹۳۵ء میں انڈین ہسٹری کانگریس الٰہ آباد میں پڑھا تھا اور جناب سرفراز خاں صاحب کا مقالہ شیخ محمد علی حزیںؔ پر۔

گہر از رایت شاہان عجم بر چیدند — بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند
افسر از تارک ترکان پشنگی بردند — بہ سخن ناصیۂ فرکیانم دادند

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم — دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است
میراث جم کہ مے بود اکنوں بمن سپار — زاں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

مرزا غالبؔ، سراج الدین احمدؔ کو لکھتے ہیں :

"ترک نژادم و نسب من بہ افراسیاب و پشنگ می پیوندد"

جو شخص دودۂ جم سے تعلق رکھتا ہو، وہ فارسی نویسانِ ہند کو کب خاطر میں لا سکتا تھا۔

غالبؔ نے قاطع برہان میں اپنے آپ کو اہلِ زبان میں شامل نہیں کیا۔ "حاشا کہ خود را از اہلِ زباں گیرم" لیکن انھوں نے اپنی زبان دانی کی سلامتی اور راستی پر اتنا زور دیا ہے کہ وہ صرف اہلِ زبان ہی کو سزاوار ہو سکتا ہے یا اُس شخص کو جس کے عجز میں ہزار غرور پوشیدہ ہوں۔

غالبؔ کا دعویٰ یہ ہے کہ زبان فارسی سے ان کو "پیوند ازلی" ہے اور ایک "جاماسپ عہد" اور "بزرجمہر عصر" کے سامنے انھوں نے زانوئے ادب بھی تہ کیا تھا۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

"ملا عبد الصمد (ہرمزد۔ اُستاد غالبؔ) غیر معمولی علم و استعداد کا شخص تھا بلا شبہہ مرزا غالبؔ کی غیر معمولی فارسی مناسبت و رسوخ میں اس کی تعلیم کو بڑا دخل ہو گا........ عبد الصمد پر سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی رشتے کا راز کھل چکا تھا۔ دونوں زبانوں کے مرادفات کی صحیح مثالیں اسے معلوم تھیں۔ سر ولیم جونس وغیرہ کے ابتدائی مباحث میں انھیں سے کام لیا گیا ہے"[۱]

---

[۱] "غالبؔ" از غلام رسول مہر، ۲۷

ملّا عبدالصمد کا وجود تھا یا نہیں۔ یہ مسئلہ بڑا مباحثہ انگیز ہے[1] لیکن خود غالب کا بیان یہ ہے کہ اس کی مدد سے فارسی زبان کی حقیقت "دل نشیں" اور "خاطر نشان" ہو گئی۔

لیکن اس معاملے میں انھوں نے اتنا غلو کیا کہ وہ اپنے آپ کو فارسی کا تنہا وارث سمجھتے تھے اور ابتدا ہی سے ہندوستان کے متقدمین و متاخرین فارسی دانوں میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے[2] ان کے غرور کی شاید اس سے بہتر مثال نہ مل سکے ؎

هر چند زمانہ مجمع جہال است | وز جہل نہ حال شاں بہ یک منوال ست
کودن ہمہ لیک از یکے دگر سے | فرق خرِ عیسیٰ و خرِ دجال ست

معرکۂ حامیانِ قتیل و غالب اسی ایرانی ہندی نزاع کی ایک کڑی ہے۔ غالب کی قتیل دشمنی کو اگر اس پسِ منظر کے ساتھ دیکھا جائے، تو ان کے افکار و امیال اور موافقت و مخالفت کی بہت سی گتھیاں سلجھائی جا سکتی ہیں۔

اس ادبی ہنگامے کے برپا ہونے کا فوری سبب یہ ہوا کہ مرزا غالب اپنی پنشن کے سلسلے میں ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے۔ وہاں ایک مشاعرہ میں غالب نے "گماں برخیزد" "میاں برخیزد" غزل پڑھی۔ اس غزل کا ایک شعر ہے ؎

جزو از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہم چو موئے کہ بتاں راز میاں برخیزد

اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ عالم مفرد ہے، ہمہ کے ساتھ اس کا ربط بہ اجتہاد قتیل درست نہیں ہے۔ کفایت خاں۔ رئیس ہرات بھی مشاعرہ میں موجود تھے انھوں نے

---

[1] دیکھیے "غالب کا ایک فرضی استاد" علی گڑھ میگزین "غالب نمبر" : ۶۵

[2] ملاحظہ ہو، غالب نامہ ص ۳۲

"ہمعالم" کی سند سعدی و حافظ کے کلام سے پیش کی لیکن اس سے مخالفین کا اطمینان نہیں ہوا۔

دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ "زمیاں برخیزد" صحیح نہیں ہے۔

تیسرا اعتراض "کدہ" کے استعمال پر تھا۔[1]

غالبؔ نے ان اعتراضات پر جل کر کہا کہ "میں فرید آباد کے کھتری بچے کا قول نہیں مانتا"۔

کلکتہ میں غالبؔ کے معترضین کی تعداد کافی تھی اور ان کی مخالفت کی ایک وجہ عبدالغفور نساخ نے یہ لکھی ہے کہ کلکتہ کے قیام میں غالبؔ کا ملنا جلنا زیادہ تر ایرانیوں سے تھا۔ ان لوگوں نے ان کے کلام کی خاطر خواہ تعریف و توصیف کی۔ بلکہ کفایت خاں نے کلکتہ کے شاعروں کو چھوڑ کر صرف غالبؔ ہی کی قدر افزائی کی۔ حاجی عبدالکریم اصفہانی، کلکتہ کے بہت بڑے تاجر تھے ان کے یہاں ایک ایرانی فاضل مرزا کوچک نام مقیم تھے انھوں نے مجلس عام میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا: اس درجہ کا شاعر آج سرزمین ایران میں بھی کوئی نہیں[2]۔ یہ باتیں مخالفین برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

غالبؔ نے اس واقعہ کی محمد علی خاں صدر امین باندہ کو اس طرح اطلاع دی ہے:۔

"از لوادر حالات ایں کہ سخن دران و نکتہ رسان ایں بقعہ پس ار ورود خاکسار بزم سخنے آراستہ بودند۔ در ہر ماہ شمسی انگریزی روز یک شنبہ نخستین سخن گویاں در مدرسہ سرکار کمپنی فراہم شدندے، و غزل ہائے ہندی و فارسی خواندندے ناگاہ گراں مایہ مردے کہ از ہرات بہ سفارت رسیدہ است در آں انجمن می رسد

---

[1] ملاحظہ ہو غالبؔ نامہ، ص ۳۲

[2] غالبؔ از مہر، اشاعت سوم: ۱۲۳ بروایت ابوالکلام آزاد

واشعار مرا شنودہ بہ بانگِ بلند نامی ستاںد۔ و بر کلام نادرہ گویانِ ایں قلم رو تبسم ہائے زیر لبی می فرماید چوں طبائع بالذات مفتونِ خود نمائی است ہم گناں حسد می برند کلانانِ انجمن و فرزانگانِ فن ہر دو بیت من اعتراضِ نادر ست بر آوردہ اک را شہرت می دہند۔[1]"

مرزا غالب نے اعتراض سے تنگ آکر ایک مثنوی "بادِ مخالف"[2] لکھی جسمیں سخن پروران کلکتہ سے معذرت کی لیکن اس مصالحت میں بھی کئی تیز نشتر چھپے ہوئے تھے لکھتے ہیں: نہ میں نے قتیل کی صحبت سے فیض حاصل کیا نہ اسکی شہرت پر رشک ہے نہ اُسے بُرا کہتا ہوں لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ؎

دامن از کف کنم چگونہ رہا — طالب و عرفی و نظیری را
خامہ روح روانِ معنیٰ را — آں ظہوری جہانِ معنیٰ را
آں کہ طے کردہ ایں مواقف را — چہ شناسد قتیل و واقف را
می شوم خویش را بہ صلح دلیل — می سرائم نوائے مدح قتیل
تا نہ ماند زمن دگر گلہ — رسد از پیروانِ وے صلہ
گرچہ ایرانیش نہ خواہم گفت — سعدی ثانیش نہ خواہم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است — از من و ہم چو من ہزار بہ است
من کفِ خاک و او سپہر بلند — خاک راکے رسد بہ چرخ بلند

---

[1] کلیات نثر غالب، ۱۷۰ (نول کشور ۱۲۸۷ھ)۔ خطوط بنام عبدالغفور سرور اور عبدالرزاق شاکر بھی دیکھے جائیں؛ عود ہندی صفحات: ۱۷۰، ۱۷۶ (طبع علی گڈھ ۱۹۲۷ء)

[2] نیز ملاحظہ ہو "بادِ مخالف کی اوّلین روایت" از قاضی عبدالودود صاحب۔ بڑے تماشے کی بات یہ ہے کہ قتیل کی بڑی تعریف کرتے ہیں، ہجو ملیح ہی سہی، مگر اس کی سند اس بنا پر کہ وہ ہندی ہے قبول نہیں کرتے۔ مگر بیدل کی سند خود پیش کرتے ہیں "شعر بیدل بجز تفنن نیست"۔ اوّلین روایت میں نہیں، بعد کو بڑھایا ہے۔

وصف او حد چو مے نہ بود — بہر در خورد و روز نے نہ بود
مرحبا ساز خوش بیانیٔ او — حبذا شورِ نکتہ دانیٔ او
نظمش آبِ حیات را ماند — در روانی فرات را ماند
نثر او نقش بال طاؤس است — انتخابِ صراح و قاموس است
بادشاہے کہ در قلمرو حرف — کردہ ایجاد نکتہ ہائے شگرف
خامہ ہندوے پارسی دانش — ہندیاں سر بہ خط فرمانش
ایں رقم ہا کہ ریخت کلک خیال — بود سطرے ز نامۂ اعمال
از منِ نارسائے، ہیچ مداں — معذرت نامہ ایست اے یاراں
بو کہ آید ز عذر خواہی ما — رحم بر ما و بے گناہی ما
آشتی نامہ و وداد پیام — ختم شد والسّلام والاکرام

غالبؔ کی پریشانیوں میں پنشن کے مقدمہ کو بڑا دخل حاصل ہے جس میں وہ ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۴ء تک اُلجھے رہے۔ اور روپیہ ملنے کی اُمید میں قرض لیتے رہے۔ ۱۸۴۷ء میں وہ "غمِ رسوائی جاوید" یعنی قیدِ فرنگ میں مبتلا ہو گئے۔ غرض غدر کے زمانے تک ان کو اتنا اطمینان نہ مل سکا کہ ہم نوایانِ قتیل کے خلاف کوئی مؤثر قدم اُٹھا سکیں۔

غدر کے زمانے میں مرزا غالبؔ نے ایک روزنامچہ "دستنبو" کے نام سے لکھا اس میں انھوں نے خالص فارسی میں "جہاں دارانِ داد آموز، دانش اندوز، نکوخو، نکو نام،" (انگریزوں) کی تباہی اور بربادی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور یکم اگست ۱۸۵۸ء تک کے حالات جمع کیے ہیں۔ غدر کی خانہ نشینی ہی کے زمانے انھوں نے "برہانِ قاطع" دیکھنا شروع کی اور اس کے اغلاط نوٹ کرتے رہے غالبؔ نے ان کو ایک علاحدہ رسالے کی صورت میں ۱۸۶۰ء میں مرتب کیا اور ۱۸۶۲ء میں چھپوایا۔[1] "قاطع برہان" کی اشاعت نے ۱۸۲۹ء کے کلکتہ والے ہنگامے کو پھر تازہ

---

[1] "قاطع برہان" کا دوسرا ایڈیشن "درفش کاویانی" کے نام سے مع اضافہ مطالب و فوائد ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔

کر دیا بہ قول غالبؔ "باسی کڑھی میں اُبال آگیا"، اور ان کو آخر وقت تک اس محنِ لعنت سے نجات نہیں ملی۔

قاطع برہان، ایسی ہنگامہ خیز کتاب تھی کہ کچھ عرصے کے لئے ساری فضا مکدر ہوگئی اور مخالفانہ لٹریچر کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا ــــــ اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(۱) 'محرقِ قاطع' (مولوی سعادت علی خاں)
(۲) 'ساطع برہان (مرزا رحیم بیگ میرٹھی)
(۳) 'قاطع القاطع (امین الدین پٹیالوی)
(۴) 'موٗیدِ برہان' (آغا احمد علی)
(۵) 'تیغِ تیز تر'
(۶) 'شمشیر تیز تر' (آغا احمد علی)

اس مخالفانہ لٹریچر کا جواب غالبؔ کے دوستوں اور موٗیدوں کی طرف سے ان کتابوں کے ذریعہ دیا گیا۔

(۱) دافعِ ہذیان' (مولوی نجف علی)
(۲) لطائفِ غیبی (سیف الحق سیاح)، مہر کا قیاس ہے کہ یہ کتاب غالبؔ کی لکھی ہوئی ہے[۱]
(۳) سوالاتِ عبد الکریم'
(۴) نامۂ غالب' از مرزا غالبؔ۔
(۵) تیغِ تیز' موٗلفہ غالبؔ۔
(۶) ہنگامۂ دل آشوب' وغیرہ

اس ہنگامے میں تلخی کا پیدا نہ ہونا حیرت انگیز تھا۔ چنانچہ موافق ومخالف

---

[۱] 'غالبؔ': ۳۱۴ اشاعتِ سوم، نیز ملاحظہ ہوں ذکرِ غالبؔ از مالک رام، علی گڑھ میگزین غالبؔ نمبر: لطائفِ غیبی اور غالبؔ از عبد المجید سالک: ۱۲۴

دونوں جماعتیں نا ملائم الفاظ پر اُتر آئیں۔ اور طنز اور دشنام کے ترکش کا کوئی تیر ایسا نہیں تھا۔ جو انھوں نے صرف نہ کیا ہو۔

اس تمام لٹریچر کو اس نظر سے جانچنا اور پرکھنا کہ غالب کے اعتراضات کہاں تک درست تھے۔ تحقیق کا ایک دل چسپ موضوع ہے۔ اور اس کے لئے ایک علاحدہ فرصت درکار ہے۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے۔ کہ ایرانی ہندی نزاع کے سلسلے میں اس کی کیا حیثیت اور اہمیت ہے۔

اگر جذبات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے، تو ماننا پڑے گا کہ غالب نے قاطع برہان لکھ کر علمی خدمت انجام دی۔ اور اس ایرانی ہندی نزاع کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی جو اب تک تشنہ بحث تھے۔

رضا علی خاں ہدایت، صاحب مجمع الفصحا نے فرہنگ انجمن آرائے ناصری میں غالب کے بعض[1] اعتراضات کو صحیح مانا ہے لیکن اس بحثا بحثی میں ذاتیات پر حملے ہونے لگے اور رفتہ رفتہ اس مباحثے کی علمی اور تحقیقی حیثیت ختم ہو گئی۔

مرزا غالب شروع ہی سے قتیل و واقف کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اور اپنے آپ کو عرفی و ظہوری کا ہم مرتبہ سمجھتے تھے۔ کلکتہ کے مشاعرہ اور برہان قاطع کے ہنگامے نے غالب کے جذبۂ مخالفت میں شدت اور عصبیت پیدا کر دی۔ ان کی مخالفت کا یہ عالم تھا۔ کہ جس سے بھی قتیل کا تعلق سُن پاتے تھے۔ اُس کے دشمن ہو جاتے تھے۔ مولوی غیاث الدین رام پوری مولف غیاث اللغات نے قتیل کی 'چار شربت' کا بھی حوالہ دیا ہے۔ غالب اس تعلق کو کب برداشت کر سکتے تھے۔ چناں چہ لکھتے ہیں:-

[1] مخدومی قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ ان مسائل کے بارے میں جو غالب اور حامیان برہان قاطع میں مابہ النزاع ہیں، ہدایت نے جو کچھ لکھا ہے (فرہنگ نگار کی حیثیت سے، نزاع کی طرف اشارہ کئے بغیر اور اس سے کسی قسم کی واقفیت کا اظہار کئے بغیر) وہ اسّی فی صدی وہی ہے جو برہان میں ہے۔

غیاث الدین رام پوری ایک ملائے مکتبی تھا۔ ناقل نا عاقل۔ جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہوگا۔ اس کا فنِ لغت میں کیا فرجام ہوگا۔" [1]

مولوی غلام امام شہید چوں کہ قتیل کے شاگرد تھے۔ اس لیے ان کے متعلق ذکا حیدر آبادی کو لکھتے ہیں: "سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہاں کوسِ انا ولا غیری بجا رہے ہیں۔ اور سخن ناشناسوں کو اپنا زورِ طبع دکھا رہے ہیں"۔ [2]

غالب ہر جگہ قتیل کو ہندی فارسی دانوں کا نمائندہ اور اپنے آپ کو فارسی داں ایرانی نژاد کا علم بردار سمجھتے ہیں:۔

"یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے"۔ [3] "ایک گاؤ بچہ یہ زورِ سحر کو کچھ باتیں کرنے لگا بنی اسرائیل اسے خدا سمجھے"۔

"قتیل اساتذۂ سلف کے کلام سے قطعاً نا آشنا ہی نہیں اس کے علم فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے جو کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالکِ مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے، اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیش تر سادہ کشمیری یا کابلی یا قندھاری و ہراتی۔ احیاناً عامہ اہلِ ایران میں سے بھی کوئی ہو، مانا عظمائے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا۔ تقریر اور ہے تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بہ عینہٖ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ وطواط اور شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید یہ سب نثر میں کیوں خونِ جگر کھاتے۔ وہ سب اسی طرح کی نثر میں جو لالہ دیوالی سنگھ قتیل متوفی نے بہ تقلید اہلِ ایران لکھی ہے، رقم نہ فرماتے" [4]

صاحبِ عالم کو لکھتے ہیں:۔

---

[1] خطوطِ غالب ص ۱۱۷ [2] اردوئے معلیٰ: ۳۷۸ (لاہور ۱۹۲۳ء) [3] خطوطِ غالب: ۱۱۷ (بنام قاضی عبد الجمیل) [4] عودِ ہندی: ۱۵ (طبع علی گڑھ) عبد الغفور سرور کے نام۔

اصل فارسی کو اس کھتری بچہ قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا، رہا سہا غیاث الدین رامپوری نے کھو دیا۔ غور کرو کہ وہ خران نامشخص کیا کہتے ہیں، اور میں خستہ و دردمند کیا بکتا ہوں۔ واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے.. ان غولوں پر لعنت کرو۔[1]

قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:۔

"مگر یہ پیروی قتیل کی ہے کہ وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر بناتا ہے۔"[2]

تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

"لفظ "بے پیر" تورانی بچہ ہائے، ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے مرزا جلال اسیر علیہ الرحمہ مختار ہیں۔ اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے۔ کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادۂ ایران ایسا لفظ لکھے۔"[3]

مرزا غالب یہ سمجھتے تھے کہ زبان دانی فارسی میری ازلی دستگاہ ہے اور یہ عطیہ خاص منجانب اللہ ہے اس لئے اگر کوئی غلطی ان کی دانست میں ایرانیوں سے بھی ہوئی ہے تو اس پر بھی "تعجب"[4] کا اظہار کیا ہے۔ ایک اور موقع پر تفتہ کو

---

[1] عود ہندی: ۲۲ [2] اردوے معلیٰ: ۴۰۳ [3] خطوط غالب: ۱۹ حالاں کہ بے پیر بہت قدیم ترکیب ہے۔ خاقانی طالب آملی صائب اور اشرف کے یہاں موجود ہے (غالب بہ حیثیت محقق" علی گڑھ میگزین غالب نمبر: ۱۹۰) [4] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کورانہ تقلید کے قائل نہیں تھے۔ حزیں کے ایک مطلع کا ذکر کرتے ہوئے، تفتہ کو لکھتے ہیں:

"حزیں کے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زائد اور بے ہودہ ہے۔ متبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محض ہے! یہ ستم ہے! یہ عیب ہے اسکی پیروی کون کرے گا حزیں تو آدمی تھا یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہوتا تو اس کو سند نہ جانو۔" (خطوط غالب، ص ۲۳) وہ مطلع یہ ہے ؎

ز ترک تازیٔ آں نازنیں سوار ہنوز   ز سبزہ می وہد انگشت زینہار ہنوز

لکھتے ہیں :-

"فارسی میں مبدا، فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر"[۱]

سنو میاں، میرے ہم وطن جو دادی فارسی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں، جیساوہ گھاگھس الو عبدالواسع لفظ 'نامراد' کو غلط کہتا ہے اور یہ الو کا پٹھا قتیل "صفوت کدہ"... اور 'ہمہ عالم' کو غلط کہتا ہے، کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو "یک زبان" کو غلط کہوں گا۔ فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے، للہ الحمد و للہ الشکر[۲]

یہی وجہ ہے کہ غالب ہندوستان کے سخن وروں میں سوائے خسرو کے اور کسی کو مسلم الثبوت نہیں سمجھتے تھے۔ سرور کو لکھتے ہیں :-

"میں اہلِ زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدمایا متاخرین میں مثل صائب و کلیم و اسیر و حزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم و نثر میں نہیں لکھتا"[۳]

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں :-

"کلامِ سعدی و حزیں اور ان کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے۔ نہ آرزو اور واقف اور قتیل وغیرہم کا۔"

[۱۷ جنوری ۱۹۵۲ء]

اسی خط میں لکھتے ہیں :-

"نظر شگفتن" اور "گوش شگفتن" ہم نہیں جانتے اگرچہ منشی ہرگوپال تفتہ اور ملا نورالدین ظہوری نے لکھا ہو" (خطوط غالب، ص ۲۲)

[۱] خطوط غالب: ۸۴ [۲] خطوط غالب: ۸۴ [۳] عود ہندی: ۱۸ طبع علی گڑھ

تصویر مندرجۂ کلیات غالب

(۱۸۶۳ء)

مختار الدین احمد آرزو

مرزا غالب کی تصویریں

مرزا غالب کی تصویریں جو اب تک شائع ہوتی رہی ہیں ان میں معاصرانہ تصویریں بھی ہیں اور بعد کی بنائی ہوئی اور مصنوعی بھی۔ یہ بات حیرت ناک معلوم ہوگی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ چند تصویروں کے سوا بیشتر شائع شدہ تصویریں معاصرانہ نہیں اور نہ وہ مستند ہیں۔ اب تک راقم کو مرزا کی چار تصویروں کا پتہ چلا ہے جو معاصرانہ ہیں اور جنکی اصلیت مسلّم ہے۔

۱۔ تصویر مندرجۂ کلّیات غالب

مرزا کے فارسی کلام کا مجموعہ ان کی زندگی میں دو بار شائع ہوا ایک سعیٔ انقلاب سن ستاون سے بارہ تیرہ سال پہلے [۱] دیوان فارسی کے نام سے نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تصحیح کے ساتھ مطبع دار السلام دہلی میں چھپا تھا۔ یہ اشاعت بہت کم یاب ہے۔

اس اشاعت کے بعد مرزا نے اپنا کلّیات مرتب کیا اور اس میں بعد کا کلام بھی داخل کر لیا یہ مطبع نول کشور میں جون ۱۸۶۳ء سے پہلے چھپ چکا تھا۔ لیکن تصویر تیار

---

[۱] سال طباعت (۱۸۴۵ء) بروایت غلام رسول مہر "غالب": ۴۰۹ اشاعت سوم "مالک رام" ذکر غالب: ۸۲ اشاعت اوّل (مئی ۱۹۳۸ء) بقول جناب امتیاز علی عرشی "علی گڑھ میگزین غالب نمبر": ۱۱۶ راقم کا نسخہ دیوانِ فارسی ناقص ہے، اس لیے اس وقت سالِ طباعت کی تعیین سے قاصر ہے۔

نہ ہونے کی وجہ سے اس کی اشاعت روک دی گئی تھی، آخر ۲ رجون ۱۸۶۳ء کے اودھ اخبار میں یہ اعلان شائع ہوا:

"بہ وجہ عدم تیاری تصویر جناب مرزا صاحب موصوف کلیات بہ خدمت شائقان تقسیم ہونا ملتوی تھا اب تیار ہو گئی۔" اس اشاعت میں مرزا کے زائچہ ولادت کے علاوہ یہ تصویر بھی (جو لیتھو پر چھاپی گئی ہے) موجود ہے۔ اس میں وہ درباری لباس میں پیچ دار پگڑی باندھے کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں ایک تحریر ہے اور انداز مجموعی ایسا ہے جیسے وہ دربار میں اپنا قصیدہ سنا رہے ہوں۔ یہ کلیات مرزا کی زندگی میں شائع ہوا تھا اور وہ اس کی اشاعت کے ہر ہر مرحلے: کتابت، طباعت، تصحیح، جزو بندی وغیرہ سے ذاتی طور پر واقف رہے تھے۔ اس لئے اس تصویر کے مصنوعی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہت ممکن ہے یہ تصویر خود انھوں نے فراہم کی ہو۔ یا منشی نول کشور یا مطبع کے کسی ایسے آدمی کے پاس جس سے مرزا کے تعلقات ہوں، یہ تصویر پہلے سے موجود ہو۔

ان کے موجودہ خطوط میں اس تصویر کا کہیں ذکر نہیں ملتا، لیکن اگر مرزا کے وہ سارے خطوط مل جائیں جو انھوں نے منشی نول کشور اور مطبع والوں کے نام لکھے تھے تو اس میں اس تصویر کا ذکر ضرور مل جانا چاہیئے۔ بہرکیف اس تصویر کے اصلی ہونے میں کلام نہیں۔ مرزا کی صحت پسندی کا یہ حال تھا کہ بعض مرتبہ ایک لفظ کے غلط ہو جانے پر وہ واویلا مچانے اور ہنگامہ برپا کرنے لگتے تھے اور کتاب کے فرمے تک بدلوانے کو تیار ہو جاتے تھے۔ تصویر اگر ان کی نہ ہوتی یا ذرا بھی اُن کی شکل وصورت سے مختلف ہوتی تو وہ تصویرِ مطبوعہ کے سارے اوراق ضائع کرا دینے میں بھی پس وپیش نہ کرتے۔

یہ تصویر مرزا کی وفات سے ۶ سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ یہ معلوم نہیں کب بنوائی گئی تھی لیکن اس کا زمانہ ۱۸۶۳ء کے لگ بھگ سمجھنا چاہیئے۔

یہ تصویر سب سے پہلی مرتبہ کلیات غالب (نول کشور ۱۸۶۳ء) میں شائع ہوئی، وہیں سے "مکاتیبِ غالب" (مرتبہ امتیاز علی عرشی صاحب) کی اشاعت اول ۱۹۳۷ء، علی گڑھ میگزین "غالب نمبر" ۱۹۴۹ء، اور رسالہ "آجکل" بابت فروری ۱۹۵۲ء میں

تصویر قلعۂ معلی

(قبل از ۱۸۶۶ء)

شائع کی گئی۔

۲۔ تصویرِ قلعۂ معلّٰی

مرزا نے اپنی ایک تصویر بہادر شاہ کو نذر کی تھی۔ اس کا ذکر اُن کے خطوں میں ملتا ہے۔ سیّاح نے مرزا سے ان کی تصویر مانگی تھی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "صاحب اس بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں کھچا کھچا پھروں ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھو ایک جگہ ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھنچی ہوئی ہے۔ اگر ہاتھ آجائے گی تو وہ ورق بھیج دوں گا۔"[1] سیّاح بہت دنوں تک تصویر کا مطالبہ کرتے رہے اور کم از کم ۲۵ اگست ۱۸۶۱ء تک سیّاح کو تصویر نہیں ملی تھی۔ گو قرائن موید ہیں کہ ۱۷ اگست ۱۸۶۱ء تک انھیں مرزا کی تصویر مل چکی ہوگی۔ غالب نے میر ابراہیم علی خاں کو اپنی تصویر سیّاح ہی معرفت بھیجی تھی۔ اس کا امکان بہت کم ہے کہ انھیں تو نہ بھیجی ہو، اور ان کی وساطت سے میر ابراہیم علی خاں کو بھیجی ہو۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اُنھیں کونسی تصویر بھیجی تھی۔ قلعہ والی تصویر تو نہیں رہی۔

بہادر شاہ رحمتہ اللہ علیہ کا دور ختم ہو جانے کے بعد قلعہ میں انگریزوں نے اپنی بساطِ سیاست بچھائی اور ان کے عہد میں قلعہ کے ایک حصّے کو عجائب خانہ بنایا گیا۔ جس میں بہادر شاہ کے ملبوسات، اسلحہ۔ ذخیرۂ کتب اور دوسرے نوادر کے ساتھ ساتھ مرزا غالب کی تصویر بھی محفوظ کر دی گئی، یہ آج بھی عجائب خانہ کی زینت ہے، اور بقول شیخ محمد اکرام، "مرزا کی کسی تصویر سے اُن کی رئیسانہ تمکنت، عقابی تیز نگہی، اور شیرے کی ذہانت اس طرح نمایاں نہیں ہوتی جس طرح اس تصویر سے[2]۔"

یہ تصویر سب سے پہلی مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب نے اشتیاق علی صاحب

---

[1] اردوئے معلّٰی مطبع شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۲۲ء : ۱۷

[2] آثارِ غالب : ۸

سپرنٹنڈنٹ عجائب خانہ کی اجازت سے رسالہ اردو، بابت اپریل ۱۹۲۹ء میں شائع کی۔ پھر شیخ محمد اکرام نے غالب نامہ کی اشاعت ۳۶ء میں چھاپی۔ اب بھی آثارِ غالب میں شریکِ اشاعت ہے اور انھیں کی توجہ سے وقار عظیم صاحب نے فروری ۴۹ء کے 'ماہِ نو' میں اسکا عکس شائع کیا تھا۔ یہ تصویر ۱۸۶۶ء سے پہلے کی ہے۔ تصویر کے نیچے درج ہے "شبیہہ حضرت غالب دہلوی"۔

۳۔ تصویر کتب خانہ حبیب گنج

یہ تصویر مرزا کے آخری زمانے کی ہے۔ جو کسی فن کار نے ۱۲۸۳ء میں مختلف رنگوں سے بنائی ہے۔ یہ تصویر نمبر ۲ سے بہت مشابہ ہے۔ خود مرزا کی نشست، حقے کی نے، اور دوسری چیزوں کا انداز بہت ملتا جلتا ہے۔ تصویر کی پشت پر دو اندراجات ہیں ایک قدیم دوسرا جدید۔ قدیم عبارت یہ ہے "شبیہہ دل پذیر مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی عرف مرزا نوشہ"۔ جدید اندراج نواب صدر یار جنگ کا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر دہلی میں پچیس روپے میں خریدی گئی تھی۔

اسے پہلی مرتبہ مالک رام صاحب نے 'ذکرِ غالب' اور 'سبدِ چین' (۱۹۳۸ء) میں اور رسا ہمدانی مرحوم نے نادر خطوط غالب، لکھنؤ ۱۹۲۹ء میں شائع کیا۔ یہی تصویر مولوی عبید الرحمٰن خاں صاحب شروانی کی عنایت سے راقم نے علی گڑھ میگزین کے 'غالب نمبر' (۴۹ء) اور 'آج کل' (۵۲ء) میں شائع کی ہے۔ "نادر خطوطِ غالب" میں پوری تصویر کا عکس ہے جس میں پیشانی پر ان کا شعر "غالب نام آورم الخ" بھی مندرج ہے۔ علی گڑھ میگزین میں حاشیے کے بیل بوٹے اور مندرجہ بالا شعر محذوف ہے۔ 'ذکرِ غالب' اور 'سبدِ چین' میں اور زیادہ اختصار اور کفایت شعاری کو راہ دی گئی ہے۔ صرف مرزا کی تصویر ہے۔ تصویر کے عقبی زمین اور آس پاس کا ماحول حذف کر دیا گیا ہے۔

ان تینوں تصویروں کے مستند اور معاصرانہ ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ تینوں کے خدوخال ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں خصوصاً آخری دو

تصویر کتب خانۂ حبیب گنج

(۱۲۸۳ھ)

تصویروں میں تو بیحد مماثلت ہے۔ اصل تصویر میں بھی بہت حد تک اور ارد گرد کی فضا اور ماحول میں بھی۔

۴۔ تصویر نسخۂ حمیدیہ

دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ طبع اوّل میں بھی مرزا غالب کی ایک قلمی تصویر ہے، فنی طور پر تو اس تصویر کا کوئی درجہ نہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ مصوّر نے اس پر بہت کم محنت کی ہے، لیکن تصویر کے اصلی اور معاصرانہ ہونے میں شبہہ نہیں، لباس اور چہرے کے خد و خال میں ان تین تصویروں سے بڑی مشابہت ہے جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، کس زمانہ میں یہ تصویر بنائی گئی معلوم نہیں، اور نہ یہ پتا چلا کہ یہ تصویر کہاں سے حاصل ہوئی۔

۵۔ غالب کی ایک قلمی تصویر مخدومی مولوی عبدالحق صاحب کے پاس بھی ہے جو ان تصویروں سے بہت مشابہ ہے۔

مرزا کی ایک تصویر کتب خانۂ شرقیہ بانکی پور میں بھی ہے، غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ کلیات غالب (طبع اوّل) کی مطبوعہ تصویر [تصویر نمبر ۱] پر کسی نے چابک دستی سے ایسی خوب صورت رنگ آمیزی کی ہے کہ قلمی تصویر کا دھوکا ہوتا ہے، یہ تصویر جناب عندلیب شادانی صاحب کے ملوکہ قلمی دیوان غالب میں تھی جن سے پروفیسر محمد محفوظ الحق مرحوم نے مانگ لیا تھا، اور اب انھیں کے ذخیرۂ کتب کے ساتھ کتب خانہ شرقیہ بانکی پور میں موجود ہے۔

۶۔ فوٹو

عکسی تصویر کا ذکر غالب کے یہاں ملتا ہے سیاح کو ۵ ستمبر ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں:
"گوشہ نشین آدمی، عکس کی تصویر اُتارنے والے کو کہاں ڈھونڈھوں"؟ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اُنھوں نے نہیں تو اُن کے احباب نے ایک عکس اُتارنے والے

کو ڈھونڈھ نکالا۔

"اکمل الاخبار" جس کے ایڈیٹر مرزا کے شاگرد بہاری لال مشتاق دہلوی اور مالک و سرپرست، حکیم محمود خاں تھے، کی اشاعت ۲۸ رمئی ۱۸۶۸ء میں مرزا کی ایک تصویر کا اشتہار ہے۔ جس سے مرزا کی اس عکسی تصویر پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اشتہار یہ ہے[1]

"شبیہہ مبارک جناب معلّی الالقاب نجم الدولہ۔ دبیر الملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ غالبؔ مدظلہ العالی۔

ناظرین دالاتمکین اور نیز شاگردانِ ارادت آئین حضرت ممدوح الصدر کو مژدہ ہو کہ دریں دلا حضرت ممدوح کی تصویریں فوٹوگراف کی ترکیب سے ایک شخص نے تیار کروادی ہیں پس جس صاحب کو شبیہہ مبارک لینی منظور ہو وہ دو روپیہ کے ٹکٹ بلف عنایت نامہ پیڈ لالہ بہاری لال کے نام اکمل المطابع دہلی میں بھیج دیں۔ بصیغہ بیرنگ اُن کی خدمت میں مرسل ہوگی۔"

یہ غالباً مرزا کی پہلی تصویر ہے جو مصوّر کے موقلم کی رہین منّت نہیں بلکہ کیمرے کے ذریعے سے لی گئی ہے دوسری بات یہ کہ اس اشتہار کی تاریخ ۲۸ رمئی ۱۸۶۸ء ہے گویا مرزا کے انتقال سے ۸ - ۹ ماہ پہلے۔ یہ زمانہ مرزا کی علالت اور انتہائی ضعف کا تھا۔ اس کے بعد مرزا اس قابل رہے ہوں کہ اطمینان سے فوٹو کھنچوا سکیں۔ قرینِ قیاس نہیں بہت ممکن ہے کہ یہ مرزا کی آخری تصویر ہو۔ جس مصوّر نے مرزا کی تصویر کھینچی تھی اس کا نام رحمت علی فوٹوگرافر تھا، اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے ایک بزرگ مرزا عبدالصمد بیگ کی توجہ سے یہ تصویر بنی تھی۔ مرزا فرحت اللہ لکھتے ہیں: "ہمارے خاندان میں دو بڑے شاعر گزرے ہیں ایک غالب دوسرے مومن، خدا کی قدرت ہے کہ ہمارے ہی ذریعہ سے دونوں کی تصویریں پبلک میں آئیں، میرے عمّ بزرگوار مرزا عبدالصمد بیگ مرحوم نے

---

[1] اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار، از پنڈت کیفی رسالہ اردو

تصویر مندرجۂ نسخۂ حمیدیہ

غالب کی تصویر ان کے انتقال سے چند ہی روز پہلے رحمت علی فوٹو گرافر سے کھنچوائی تھی، یہی وہ تصویر ہے جس کو لوگ اب آنکھوں پر رکھتے ہیں، میرے پاس اس کی اصل پلیٹ تھی لیکن رفتہ رفتہ مسالا (Hypoo) اس کو کھا گیا اور زرد ہوتے ہوتے بیکار ہو گئی ہے۔[1]

مرزا کی یہ تصویر عام طور پر مروّج ہے اور ان کی عام تصویروں میں یہی ایک تصویر ہے جسے استناد کا درجہ حاصل ہے۔ مولانا ابو الکلام کا بیان ہے کہ "میری نظر سے جو تین تصویریں غالب کی گزری ہیں ان میں غدر کے بعد کی ایک عکسی تصویر بھی ہے جس میں وہ کرسی پر بیٹھے ہیں، یہ فوٹو جو مرض موت میں لیا گیا تھا، ایک آدمی نے سہارا دے کر اُٹھا دیا ہے اسی حالت میں یہ تصویر لی گئی ہے"۔

مرزا کا یہ اصلی فوٹو کتب خانہ حبیب گنج میں موجود ہے اس کی قدامت دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ "اکمل الاخبار" میں جس فوٹو کا اشتہار ہے یہ وہی ہے، اس تصویر اور مروجہ تصویروں میں یہ پتا نہیں چلتا کہ مرزا کھڑے ہیں یا بیٹھے ہیں، یا نشست کا انداز کیا ہے، یہ تصویر جو پہلی مرتبہ پیش کی جا رہی ہے اس میں صاف نمایاں ہے کہ وہ کرسی پر بیٹھے ہیں، دونوں ہاتھ بھی نمایاں ہیں انگرکھے کا دامن بھی صاف دکھائی دیتا ہے گو تصویر کچھ ایسی دھندلی آئی ہے کہ دامن وغیرہ کچھ صاف نہیں ہے اسی لئے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے لوگوں نے یہ حصہ اُڑا دیا اور یوں وہ تصویر رواج پا گئی جو آج کل عام طور پر رسالوں اور کتابوں میں ملتی ہے۔

یہی فوٹو مرزا نے حضرت صاحب عالم صاحب مارہروی کو بھیجا ہے، یہ عکسی تصویر اور لفافہ کا کاغذ جس میں انھوں نے پیکیٹ بنا کر اس تصویر کو لپیٹ کر بھیجا ہے دونوں چیزیں محمد موسیٰ صاحب زیدی باغ پختہ، قصبہ مارہرہ کی عنایت سے اٹاوہ کی لائبریری میں محفوظ ہیں لفافہ پر پتا خود غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے:

مارہرہ حضرت صاحب عالم صاحب مدظلہ العالی از غالب ہ

---

[1] مومن کی تصویر کے متعلق ایک نوٹ" از مرزا فرحت اللہ بیگ رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۲۷ء

یہ لفافہ کیا ہے گندے رنگ کے دیسی اور چوکور کاغذ کو غالب نے اپنی تصویر کے ارد گرد پیکٹ بناکر لپیٹ دیا ہے، اس پر ایک ایک آنے کے دو ٹکٹ لگے ہوئے ہیں غالباً رجسٹری سے بھیجا ہوگا گو لفافہ پر اس کا کوئی اندراج نہیں نہ غالب کی طرف سے نہ ڈاک گھر والوں کی طرف سے۔ دہلی کی مہر زیادہ واضح نہیں صرف تاریخ ۲۷ اور سال ۶۸ء پڑھا جاتا ہے، مہینے کا پتا نہیں چلتا، ورنہ غالب نے یہ تصویر کس تاریخ کو روانہ کی اس کی تعیین ہو جاتی، دہلی سے یہ لفافہ علی گڑھ پہنچا اور یہاں کی مُہر موجود ہے لیکن آجکل کے املا کے خلاف ILLYGURH لکھا ہے، تاریخ بالکل پڑھی نہیں جاتی ممکن ہے ۲۸ ہو، مارہرہ میں ڈاک خانہ اس وقت نہ ہوگا اس لئے وہاں کی مُہر نہیں آخری مُہر ایٹہ کی ہے، تاریخ اور ماہ کے نقوش یہاں بھی مدھم ہیں، سال ۶۸ء صاف پڑھا جاتا ہے، دہلی اور علی گڑھ کی مہریں سیاہ ہیں اور ایٹہ کی سُرخ، لفافہ پر سیاہ قلم سے ایک اندراج ۲۹ مئی کا ہے، یہ خوبی ممکن ہے کہ اس تصویر کی مارہرہ پہنچنے کی تاریخ یہی ہو دہلی کی مہر سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے MAY 27 منقوش ہو۔ اس بات کو بھی سامنے رکھتے ہوئے کہ اس فوٹوگراف کا جو اشتہار اکمل المطابع میں شائع ہوا تھا اس کی تاریخ اشاعت ۲۸ مئی ۶۸ء ہے، ہمارا یہ قیاس بے جا نہیں کہ غالب نے اپنی تصویر ۲۷ مئی ۱۸۶۸ء کو دہلی سے مارہرہ بھیجی ہوگی۔

عکسی تصویر کی ایک کاپی مرزا نے اپنے دوست لالہ پیارے لال کی بھی نذر کی تھی، یہ تصویر لالہ سری رام کی وساطت سے سر عبدالقادر کو ملی اور انھوں نے اُسے دیوان اردو کے ساتھ شائع کی تھی جو ان کی تصحیح سے لاہور سے ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا[1] وہ اس تصویر کے متعلق رقم طراز ہیں:

اس دیوان کو ایک چیز ایسی دست یاب ہوئی ہے جو پہلے کسی نسخے کو میسر نہیں، یعنی مرزا غالب مرحوم و مغفور کی ایک صحیح اور مستند عکسی تصویر زیب ورقِ اوّل ہے،

---

[1] راقم کی نظر سے یہ ایڈیشن نہیں گزرا، یہ معلومات راقم کے نام جناب عرشی کے ایک مکتوب سے ماخوذ ہیں۔

غالب کی ایک قدیم عکسی تصویر

عمل: رحمت علی فوٹو گرافر (۱۸۶۸ء)

ان کی تصویر سے جو نیاز مند نے ان کی آخر عمر میں کھنچوائی تھی بہ خوبی ثابت ہو جائے گا.....
تصویر غالب ان شاء اللہ ضرور بھیجوں گا"[1]

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا عبدالصمد بیگ کے علاوہ خواجہ قمرالدین نے بھی مرزا کی آخری عمر میں ایک عکسی تصویر کھنچوائی تھی، خواجہ قمرالدین نے ۱۹۰۴ء تک تو مرزا کی تصویر انجم کو نہیں بھیجی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے بعد کو بھیج دی اور یہی تصویر ۱۹۱۰ء کے 'معیار' میں شائع ہوئی۔

ایک اور فوٹو:

مرزا کی ایک اور عکسی تصویر بہت رائج ہے، اس تصویر کا زاویہ پہلے سے کچھ مختلف ہے، ٹوپی میں بھی کچھ فرق ہے، عبا بہت قیمتی اور نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اور ان کے بعض دوستوں نے، غالب کا اصلی فوٹو اور حالی وغیرہ نے جو ان کا حلیہ اور لباس کا حال لکھا ہے ان سبھوں کو پیشِ نظر رکھ کر دہلی کے بعض آرٹسٹوں سے یہ تصویر تیار کرائی ہے اور پھر بعد میں جرمنی کے بعض فن کاروں نے بھی اس میں رنگ آمیزی کی ہے۔ یہ تصویر پہلی مرتبہ برلن سے شائع ہوئی۔ یہ فوٹو دراصل پہلے فوٹو کی بگڑی ہوئی (اچھی کی ہوئی؟) شکل ہے جس پر مصوروں نے اس قدر قلم کاری اور رنگ آمیزی کی ہے کہ تصویر اصلیت سے کچھ ہٹ گئی ہے، یہ تصویر معمولی ترمیموں کے ساتھ متعدد بار شائع ہو چکی ہے دیکھیے 'دیوان غالب طبع برلن'، 'غالب' از جناب غلام رسول مہر، اشاعت اوّل، روحِ غالب از سید محی الدین قادری زور، ۱۹۳۹ء، شرح کلام غالب از سرخوش، لاہور، اور علی گڑھ میگزین بابت ۱۹۴۸ء مرتبہ راقم دیوانِ غالب

---

[1] مرقع ادب از صفدر مرزاپوری: ۹، مکتوب خواجہ قمرالدین بہ نام آنجم نیشاپوری، "تذکرۂ ضیغم"، سے معلوم ہوتا ہے کہ انجم شاعر ہونے کے علاوہ مصور بھی تھے۔ تصویر عکس کشی میں مہارت کامل حاصل ہے، ص ۳۲

تصویر یادگار غالب

آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۵۲ء جس میں قاضی معز الدین احمد نے اس تصویر کا نہایت خوبصورت عکس شائع کیا ہے۔

تصویر یادگار غالب:

یادگارِ غالب کی اشاعت اوّل میں ایک تصویر مرزا غالب کی شائع کی گئی ہے، تصویر میں عقبی زمین اور آس پاس کی فضا کلیات غالب والی تصویر سے ملتی جلتی ہے لیکن اصل تصویر بہت بدلی ہوئی اور مسخ شدہ حالت میں ہے، یہ تصویر در اصل مرزا کی دو تین تصویریں سامنے رکھ کر بنائی گئی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد تحریر فرماتے ہیں[۱]: ایک فوٹو۔ دو اور تصویروں کے ساتھ خواجہ حالی مرحوم نے منشی رحمت اللہ رعد کے پاس اس غرض سے بھیج دیئے تھے کہ ان میں سے جو تصویر بہترین ہو اس کی نقل "یادگارِ غالب" کے لئے تیار کر لی جائے"، منشی صاحب نے خود مولانا ابوالکلام سے بیان کیا کہ "میں نے بنیادی طور پر یہی آخری فوٹو سامنے رکھا لیکن تخیل کا رخ اس طرف رہا کہ اس عالم سے چند برس پہلے ناک نقشا کیا رہا ہوگا، اس طرح ایک نیا چوکھا موقلم سے تیار ہو گیا"۔

تصویر کلیات غالب:

کلیات نظم۔ مطبوعہ جنوری ۱۸۷۲ء میں بھی مرزا کی ایک تصویر صفحہ ۲۶۹ کے مقابل شائع کی گئی ہے، یہ کلیات طبع ۱۸۶۳ء کا گویا چربہ ہے۔ بہت معمولی اختلافات اور تبدیلیوں کے ساتھ، ڈاڑھی کا خط زیادہ صاف آنکھ ناک اور بھوؤں کی لکیریں واضح، پھر آنکھیں زیادہ کھلی ہوئی ہیں، کپڑوں کی شکنیں زیادہ ہیں، غالب کے شعر: "غالبِ نام آورم" کا خط بھی بدلا ہوا ہے اور دونوں مصرعوں کے درمیان دو لکیریں ہیں، سب سے بڑی بات یہ کہ اس تصویر پر مصور کا نام بھی درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "تصویر فائز علی"،

---

[۱] غالب از جناب غلام رسول مہر صفحہ: ب اشاعت اوّل

کی بنائی ہوئی ہے۔

جعلی تصویریں

ابھی جن تصویروں کا ذکر ہوا ان کی یہ خصوصیت تھی کہ تصویریں بنیادی طور پر تو اصلی ہیں، لیکن بعد کے مصوروں کے موقلم نے انھیں اصلیت سے ہٹا دیا ہے۔ اب ایسی دو تصویروں کا ذکر آئے گا جو سراسر فرضی ہیں۔

(۶) شرح کلامِ غالب مصنفہ عبدالباری آسی مرحوم اور نگار غالب نمبر، میں مرزا کی جوانی کی جو تصویر شائع کی گئی ہے اس کی کوئی اصلیت نہیں اور قطعاً فرضی ہے۔

(۷) اسی طرح وہ تصویر جس میں گاؤ تکیہ کے سہارے گھریلو لباس میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں۔ کسی حال کے فن کار کے بحرِ تخیل کی ایک موج ہے اور بس۔ اس کا پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب سے ذکر آیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ تصویر مرزا عسکری مرحوم نے حکیم احمد لکھنوی سے بنوائی تھی، موصوف نے مرحوم کو اس سے روکنا بھی چاہا کہ ایسی فرضی تصویریں بنوانی اور شائع کرنی کچھ موزوں نہیں ہے۔

یہ تصویر تاریخ ادب اردو مترجمہ مرزا عسکری (حصہ نثر[1]) 'آجکل' بابت ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء[2] میں شائع ہوئی ہے اور اس کی ایک نہایت بھونڈی نقل جس سے تصویر بالکل مسخ ہوگئی ہے، 'ماہ نو'، فروری ۵۰ء میں شائع کی گئی ہے۔

—(۲)—

خود مرزا نے کن کن لوگوں کو اپنی تصویریں بھیجی تھیں۔ ذیل کی سطروں میں اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نواب کلب علی خاں

۲۷ مئی ۶۸ء کے عریضے میں لکھتے ہیں "شوقِ قدم بوسی نے تنگ کیا۔ جب دیکھا

۱؎ عمل و حکیم۔

۲؎ عمل شیوہ رسالہ 'آجکل' کے آرٹسٹ۔

تصویر مندرجۂ شرح کلام غالب از آسی مرحوم

عمل: حکیم احمد لکھنوی

کسی طرح جا نہیں سکتا۔ ناچار اپنا نقشا اُترِوایا، اور خدمتِ عالی میں روانہ کیا۔ جب تک کہ میں جیتا ہوں تب تک اس صورت میں حاضر رہوں گا۔"[۵۱]

لیکن ۱۵ر جون تک انھیں اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ تصویر نواب صاحب کو ملی یا نہیں۔ اسی تاریخ کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "پیر و مرشد! سابق کے عریضے کے ساتھ میں نے اپنی تصویر حضور میں بھیجی ہے۔ اس کی رسید اس نوازش نامے میں مرقوم نہ تھی۔ مجکو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ لفافہ ڈاک میں تلف نہ ہو گیا ہو۔ اگر اس کی رسید سے شرف اطلاع پاؤں تو دل جمعی ہو جائے۔"[۵۲]

مرزا کے پہلے خط کے لفاف پر منشی سیل چند میر منشی کا حسبِ ذیل نوٹ ہے: "تصویر بعد ملاحظہ سپرد میر سید مجادر علی صاحب شد۔ ۲ر جون ۱۸۶۶ء۔" خود نواب صاحب نے مرزا کے دوسرے خط کا جواب ۷ر جولائی کو دیا اور لکھا: "شبیہہِ آں شفق وصولِ شادمانی آور دہ از فرطِ محبتہا متصوّر شد۔"[۵۳]

ظاہراً یہ تصویر ضائع ہو گئی۔ ورنہ 'مکاتیب غالب' کے فاضل مرتب اس کے وجود کا ضرور ذکر کرتے اور پھر یہ کہ اپنی کتاب کی پہلی اشاعت میں کلیاتِ غالب کی تصویر کا چربا نہ چھاپتے۔

شیو نرائن آرام

۱۰ر جنوری ۱۸۶۳ء کو انھیں ایک خط میں لکھتے ہیں: "اس دیوان اور تصویر کا ذکر کیا ضرور ہے؟ رام پور سے وہ دیوان صرف تمھارے واسطے لکھوا کر لایا۔ دلّی میں تصویر بہ ہزار جستجو ہم پہنچا کر مول لی اور دونوں چیزیں تم کو بھیج دیں، وہ تمھارا مال ہے چاہو اپنے پاس رکھو چاہو کسی کو دے ڈالو۔۔۔۔ تم نے دستنبو کی جد دل اور جلد بنوا کے ہم کو سوغات بھیجی۔ ہم نے اپنی تصویر

---

[۵۱] مکاتیب غالب: ۸۰ (اشاعت ششم ۱۹۴۹ء) [۵۲] مکاتیب غالب: ۸۱ [۵۳] مکاتیب غالب حواشی: ۱۸۷

اور اردو کا دیوان تم کو بھیجا۔"[۱]

شہزادہ بشیر الدین

انھیں مرزا نے ۱۶ جون ۱۸۶۵ء سے پہلے اپنی ایک تصویر بھیجی تھی جو ان تک نہ پہنچ سکی۔ مرزا بہت پریشان ہوئے، لکھتے ہیں: "خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر ننگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا، اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر پھوڑتا اور کیوں کر اس غم کی تاب لاتا کہ اپنے کو کھنچوا کر بصورتِ تصویر آپ کی خدمت میں بھیجا، لفافہ انگریزی، اقبال نشان شہاب الدین احمد خاں سے لکھوا کر بیرنگ ارسال کیا۔ اس فرمان میں اس لفافے کی رسید نہ پائی، ظاہرا ڈاک پر ڈاکو گرے اور میرے پیکرِ بے روح کے ٹکڑے اڑا دیے۔ بے تاب ہو کر یہ عبارت حضرت کو بھیجی۔"[۲]

کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ تصویر، دیر ہی میں سہی آخر انھیں ملی یا نہیں؟

سیّد عالم علی خاں

سید عالم علی خاں اور سید احمد حسین مودودی کو ایک مشترکہ خط میں ۱۷ جولائی ۱۸۶۵ء کو لکھتے ہیں: "بارے بصورتِ تصویر دونوں صاحبوں کی خدمت میں میرا سلام پہنچنا معلوم ہوا، اگرچہ اس صورت میں چلنا پھرنا خدمت بجالانی نہیں ہو سکتی۔ مگر خیر حضرت کے پیشِ نظر حاضر رہوں گا۔"[۳]

سیّد احمد حسنؑ مودودی

اُنھوں نے مرزا کو اپنی ایک تصویر بھیجی تھی، مرزا نے بھی اپنی ایک تصویر سیّاح کی معرفت انھیں بھیج دی۔ ۱۷ اگست ۱۸۶۵ء کو ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں: "امسال

---

[۱] اردوئے: ۲۸۵، [۲] خطوطِ غالب: ۴۰۵، [۳] اردوئے: ۱۸۴

اس لفافہ کا عکس جس میں غالب نے اپنی
عکسی تصویر صاحب عالم مارہروی کو روانہ کی تھی
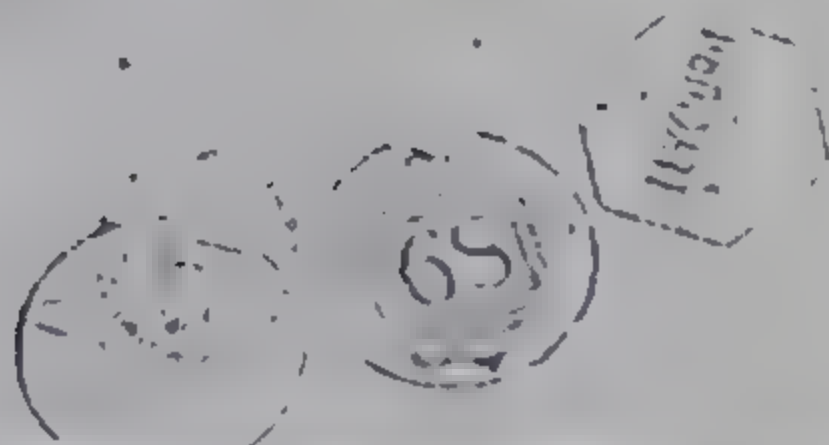
(۲۷ مئی ۱۸۶۸ء)

فقیر نے جو اپنی خاکساری کا، یعنی تصویر منشی میاں داد خاں سیاح کی معرفت نذر کی ہے یقین ہے وہ پہنچی ہو گی [۱]

سید عالم علیخاں کے خط میں جس تصویر کا ذکر ہے وہ ظاہراً اس تصویر سے مختلف ہے جس کے متعلق غالب، الحمد حسن مودودی کو لکھ رہے ہیں۔ دونوں کو جداگانہ تصویریں بھیجی ہوں گی۔ مقدم الذکر کو تصویر ۷ ار جولائی سے پہلے مل چکی تھی جب کہ اس کے ایک ماہ بعد، ۱۷ اگست تک غالب کو علم نہ تھا کہ جو تصویر انھوں نے مودودی کو بھیجی ہے وہ انھیں ملی یا نہیں۔

سید شاہ صاحب عالم مارہروی

مارہرہ کے چودھری عبدالغفور سرور، حضرت صاحب عالم، شاہ عالم اور مقبولِ عالم سے غالب کے کیا تعلقات تھے اُس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ چودھری صاحب اور حضرت صاحب عالم کے نام جو خطوط مرزا نے لکھے ہیں وہ تعداد میں اس قدر ہیں کہ اس پر عودِ ہندی کی پوری ایک فصل تیار ہو گئی ہے۔ صاحبِ عالم اور مرزا دونوں زندگی بھر ایک دوسرے سے ملاقات کی تمنا کرتے رہے لیکن کم از کم حضرت صاحب عالم نے مرزا کو نہیں تو ان کی تصویر دیکھ کر اپنی حسرت ضرور پوری کر لی تھی۔

اٹاوہ کی ایک لائبریری میں ابھی حال میں کچھ کتابیں اور نوادر مارہرہ سے آئے ہیں اس میں مرزا غالب کی ایک عکسی تصویر اور اس کا لفافہ بھی ہے جو انھوں نے حضرت صاحب عالم کو بھیجا تھا۔ اس کا عکس ہدیۂ ناظرین ہے جس کے لئے ہم امتیاز الدین احمد زبیری کے ممنون ہیں۔

رائے بہادر پیارے لال

مرزا نے اپنی عکسی تصویر اپنے دوست لالہ پیارے لال انسپکٹر مدارس کو بھی دی تھی، اس تصویر کے نیچے خود غالب کے قلم سے ان کا یہ شعر لکھا ہوا ہے:

---

[۱] اردوئے معلیٰ: ۱۷۷

غالب نام آورم نام ونشانم مپرس ہم اسد اللٰہم وہم اسد اللٰہیم

یہ تصویر پیارے لال کے عزیز لالہ سری رام کے پاس تھی۔ اور انھوں نے اشاعت کے لئے سر عبدالقادر کو دی تھی جنھوں نے دیوان اردو کی اشاعت ۱۹۱۹ء میں اسے شائع کیا تھا۔

میاں داد خاں سیاح

سیاح غالب کے بڑے معتقدوں میں تھے اور ان کے نام متعدد خطوط غالب نے سپرد قلم کئے ہیں۔ میر غلام بابا، میر ابراہیم علی خاں، سید احمد حسن مودودی، سید عالم علی خاں سے غالب کے تعلقات کی استواری میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان کے نام کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلسل کئی سال تک غالب سے اُن کی تصویر مانگتے رہے۔ مرزا بھی تصویر بھیجنے پر مستعد نظر آئے لیکن کم از کم ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء تک اُنھوں نے سیاح کو تصویر نہیں بھیجی تھی لیکن سیاح کے اس اصرار کے باوجود انھوں نے تصویر بھیجی ہو، قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا ہے خصوصاً ایسی شکل میں ان کی معرفت ایک تصویر احمد حسن مودودی کو بھیجی ہو۔ مرزا ان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: "فقیر نے جو اپنی تصویر منشی داد خاں سیاح کی معرفت نذر کی ہے یقین ہے وہ پہنچی ہو گی۔"[1]

ان وجوہ سے جن لوگوں کو غالب نے اپنی تصویریں بھیجی تھیں اس فہرست میں میں سیاح کا نام درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ مرزا کے کسی خط میں اگرچہ تصویر بھیجنے کا ذکر نہیں ہے لیکن مرزا کے سارے خطوط موجود کہاں ہیں؟

سیاح کو تصویر بھیجنے کی تاریخ ۱۷ اگست ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ سمجھنی چاہئے۔

(۳)

ذیل میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مرزا نے اپنی تصویروں کے سلسلے میں

---

[1] اردوئے معلیٰ: ۱۷۷

اُردوئے معلّیٰ رقعات میں جو کچھ لکھا ہے اُسے پیش کیا جائے :

بنام سیّاح :

۵ ستمبر ۶۶ء کے ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں : صاحب ! اس بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں کھچا کھچا پھروں۔ گوشہ نشیں آدمی عکس کی تصویر اُتارنے والے کو کہاں ڈھونڈھوں، دیکھو ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھچی ہوئی ہے اگر ہاتھ آجاوے گی تو وہ ورق بھیج دوں گا۔[1] پھر ۱۴ نومبر کو لکھتے ہیں :۔ ایک میرے دوست مصوّر، خاکسار کا خاکہ اُتار کر دربار کا نقشا اُتارنے اکبر آباد کو گئے ہیں وہ آجائیں تو شغل تصویر تمام ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے۔[2]

۱۱ جون کو لکھتے ہیں : تصویر کا حال یہ ہے کہ ایک مصوّر صاحب میرے دوست میرے چہرے کی تصویر اُتار کر لے گئے، اس کو تین مہینے ہوئے آج تک بدن کا نقشا کھینچنے کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کیا آئینہ پر نقشا اُتروانا بھی۔ ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں عید کے دن وہ آئے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ بھائی میری شبیہہ کھینچ دو، وعدہ کیا تھا، کل تو نہیں پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا۔ یہ پانچواں مہینہ ہے آج تک نہیں آئے۔[3]

۲۵ اگست ۶۷ء کو لکھتے ہیں : تصویر کھینچنے والا جو ہندوستانی ایک دوست تھا وہ شہر سے چلا گیا۔ ایک انگریز ہے وہ کھینچتا ہے، مجھ میں اتنا دم کہاں کہ کوٹھے پر سے اُتروں، پالکی میں بیٹھوں اور اس کے گھر جاؤں اور گھنٹہ دو گھنٹہ کرسی پر بیٹھوں اور تصویر کھنچوا کر جیتا جاگتا اپنے گھر پھر آؤں۔[4]

لیکن کئی سال گزرنے کے بعد بھی یہ وعدہ پورا نہ ہو سکا۔ انھیں کو ۲۵ جنوری ۶۸ء کو لکھتے ہیں : مصوّر سے خود عاجز ہوں۔ وعدہ ہی وعدہ ہے وفا کا نام نہیں۔[5]

---

[1] اردوے : ۱۷ [2] اردوے : ۸ [3] اردوے : ۲۵ [4] اردوے : ۱۵ [5] اردوے : ۱۸

یہ مصوّر صاحب تو نہ آئے اور نہ مرزا میں اب اتنا دم تھا کہ انگریز مصوّر کی دوکان میں دو گھنٹہ بیٹھ کر تصویر بنوائیں لیکن مئی ۱۸۶۵ء سے پہلے کسی فوٹو گرافر نے ان کی تصویر اُتار لی اور قیاس ہے کہ یہی تصویر اُنھوں نے اگست ۱۸۶۸ء سے پہلے پہلے سیّاح کو روانہ کر دی۔

بنام مجروح:

۱۸ دسمبر ۱۸۶۰ء کے خط میں لکھتے ہیں: میاں محمد افضل تصویر لے گئے، اب وہ تصویر کھینچا کریں اور تم انتظار[1]۔ کچھ انتظار دیکھنے کے بعد بھی جب مجروح کو تصویر نہیں ملی تو اُنھوں نے تقاضا کیا۔ ۹ جنوری ۱۸۶۱ء کو مرزا نے جواب دیا: "میاں تمھاری تحریر کا جواب یہ ہے کہ وہ تصویر جو میں نے میاں محمد افضل کو دی تھی وہ اُنھوں نے واپس دی اور اس کی نقل کے باب میں کہا کہ ابھی تیار نہیں ہے، جب وہ تیار ہو جائے گی۔ میں ان کو روپیہ دے کر لے لوں گا۔ خاطر جمع رکھو[2]۔ ۸ مارچ [۱۸۶۱ء][3] تک تصویر تیار نہ ہو سکی تھی۔ مرزا انھیں لکھتے ہیں: میاں محمد افضل تصویر کھینچ رہے ہیں۔ جلدی نہ کرو، دیر آید درست آید[4]۔

بنام شیونرائن آرام:

معلوم ہوتا ہے شیونرائن نے مرزا سے اُن کی تصویر مانگ بھیجی تھی۔ ساتھ یہ بھی لکھا ہوگا کہ آپ کو زحمت ہوگی۔ یوسف علی خاں عزیز (جن سے اُن کے گہرے مراسم تھے اور جو اُن دنوں دہلی ہی میں مقیم تھے) اس کام کو کر لیں گے۔ اس کے جواب میں مرزا ۲ جولائی ۱۸۶۰ء کو لکھتے ہیں: تصویر میری لے کر کیا کرو گے۔ بے چارہ عزیز کیوں کر کھنچوا سکے گا، اگر ایسی ہی ضرورت ہے تو مجھے لکھو، میں مصوّر سے کھچوا کر تم کو بھیج دوں۔ نہ نذر درکار نہ نیاز[5]۔

---

[1] اردوئے معلیٰ: ۱۱۸، خطوط: ۲۶۵ [2] اردوئے معلیٰ: ۱۱۷، خطوط: ۲۶۵ [3] مہیش پرشاد مرحوم اس خط کو ۱۸۵۸ء کا لکھا ہوا سمجھتے تھے۔ یہ خط میرے خیال میں تین سال بعد ۱۸۶۱ء کا لکھا ہوا ہے۔

[4] اردوئے معلیٰ: ۱۱۹، خطوط: ۲۳۶ [5] خطوط: ۴۰۵

———(۴)———

مرزا کو تصویروں سے خاص دل چسپی تھی، اپنی تصویریں بھی دوسروں کو بھیجتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کی تصویریں بھی منگواتے تھے اور ان سے لُطف اندوز ہوتے تھے۔

مرزا نے غلام بابا خاں رئیس سورت سے ان کی تصویر منگوائی ہے تصویر ملنے کے بعد سیاح کو لکھتے ہیں:

"حال تصویر کا یہ کہ میں نے اپنے سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا، گویا چھوٹے صاحب [غلام بابا خاں] کو دیکھا۔ لیکن اس کا سبب نہ معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے ہم سے بات نہ کی، خیر دیدار تو میسر ہوا گفتار بھی اگر خدا نے چاہا تو سُن لیں گے۔ دیکھو منشی صاحب.... حضرت کی تصویر میں کہنیوں تک ہاتھ کی تصویر ہے۔ آگے پہنچے اور پنجے کا پتا نہیں۔ مکالمہ ایک طرف مصافحہ کی بھی حسرت رہ گئی"۔ [۵۱] احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں: "تصویر مہر منیر پہنچی.... اور میں نے رسید لکھ بھیجی" [۵۲] شیو نرائن کو لکھتے ہیں: "تصویر پہنچی" [۵۳] اسی طرح مرزا حاتم علی مہر کی تصویر ملنے کے بعد جو خط انھوں نے لکھا ہے [۵۴] اس کا شمار ان کے بہترین خطوں میں ہو سکتا ہے"۔

ان کے خطوں سے اس زمانہ کے مصوّروں کے متعلق بھی کچھ معلومات مل جاتے ہیں:

شیو نرائن نے بہادر شاہ کی تصویر منگوا بھیجی ہے اُنھیں لکھتے ہیں: بادشاہ کی تصویر کی صورت یہ ہے کہ اُجڑا ہوا شہر نہ آدمی نہ آدم زاد۔ مگر ہاں ایک دو مصوروں کی آبادی کا حکم ہو گیا ہے وہ رہتے ہیں۔ سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لٹنے کے آباد ہوئے ہیں تصویریں بھی اُن کے گھروں میں سے لٹ گئیں جو کچھ رہیں وہ صاحبانِ انگریز نے بڑی خواہش سے خرید کر لیں۔ ایک مصور کے پاس ایک تصویر ہے وہ تیس روپے سے کم کو نہیں دیتا۔ کہتا

---

[۵۱] اردوئے: ۱۱ [۵۲] اردوئے: ۱۷۷ [۵۳] اردوئے: ۲۸۲ خطوط: ۲۰۶ [۵۴] اردوئے: ۱۸۹ خطوط: ۳۱۲

ہے تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں۔ تم کو دو اشرفی کو دوں گا ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اُتار دے۔ اس کے بھی بیس روپے مانگتا ہے اور پھر خدا جانے اچھی ہو یا نہ ہو، اتنی مہرنیں بے جا کیا ضرور ہے؟ میں نے دو ایک آدمیوں سے کہہ رکھا ہے۔ اگر کہیں سے ہاتھ آ جائے گی تو لے کر تم کو بھیج دوں گا مصوروں سے خرید کرنے کا نہ خود مجھ میں مقدور نہ تمھارا نقصان منظور۔"[1]

یہ اکتوبر ۱۸۵۸ء کی بات ہے، یعنی انقلاب کو ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے مصوروں کا دہلی میں فقدان تھا لیکن ۱۸۶۶ء تک اچھے خاصے مصور آباد ہو چکے تھے اور بعضوں سے مرزا کی دوستی بھی تھی۔ ان کے رقعات میں کئی مصور دوستوں کا ذکر ملتا ہے۔[2] ہندوستانیوں کے علاوہ انگریز مصوروں کی دو کانیں دہلی میں ۱۸۶۷ء میں موجود تھیں۔[3] وہاں فوٹو گرافر بھی موجود تھے اور مصور بھی۔ مصور کاغذ پر بھی تصویریں بناتے تھے اور ہاتھی دانت پر بھی[4] اور آئینہ پر بھی نقشا اُتروانے کا رواج تھا۔[5]

ہمیں کم از کم ایک مصور کا علم ہے جس سے غالب اپنا کام کرایا کرتے تھے ——— محمد افضل اِن سے تصویریں بنواتے تھے اور اپنی کتابوں کے سرورق کی تزئین اور قصیدوں کے بیل بوٹے بنانے کا کام بھی لیا کرتے تھے محمد افضل کا ذکر اُن کے خطوط میں متعدد بار آیا ہے: "میاں محمد افضل تصویر لے گئے اب وہ تصویر کھینچیں اور تم انتظار۔" "وہ تصویر جو میں نے میاں محمد افضل کو دی تھی۔ وہ اُنھوں نے واپس کر دی۔" "میاں محمد افضل تصویر کھینچ رہے ہیں جلدی نہ کرو۔" یوسف مرزا کو لکھتے ہیں "دو مہینے رات دن خون جگر کھایا اور ایک قصیدہ ۶۴ بیت کا لکھا۔ محمد افضل مصور کو دے دیا وہ پہلی دسمبر کو مجھ کو دے گا۔"[6]

مرزا کی تاریخی تصنیف "مہر نیم روز" جو فتح الملک ولی عہد بہادر کے حسب الحکم

---

[1] اردوئے: ۲۴۵ خطوط: ۳۸۲۔ [2] اردوئے: ۸، ۱۵، ۱۸۔ [3] اردوئے ۱۵

[4] اردوئے: ۲۶۵ [5] اردوئے: ۲۵ [6] خطوط: ۱۶۴

فخر المطابع میں شائع ہوئی تھی اس کا سرورق، بیل بوٹے اور نقش و نگار "محمد خدا بخش" مصور نے بنائے تھے۔

محمد فضل مصور، دہلی کے مشہور مصوروں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور خود اپنے زمانہ کے ممتاز مصور تھے۔ غالب کے عزیزوں میں خواجہ امان اور خواجہ قمرالدین خاں انھیں کے تربیت یافتگان میں سے تھے۔

تاریخ تحریر: ۱۵ر جنوری ۱۹۵۷ء
نظرثانی: ۱۵ر مئی ۱۹۵۷ء

قاضی عبدالودود

ہرمزدِ ثم عبدالصمد

تمہید: غالب نے عبدالصمد کو اپنے وقت کا جاماسپ[1] اور بزرجمہر[2] کہا ہے اور اُسے دشتمیں ساساں[3]، کا لقب دینے سے باز رہے ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ جتنا رازداں تھا، اتنا رازگو نہ تھا۔ غالب نے اُسے منطق و فلسفہ میں[4] مولوی فضل حق کا نظیر، عربی کا "فاضل متبحر" اور فارسی کا "مالک[5] زبان" بتایا ہے، اور جا بجا اس سے اپنی فیض یابی کا ذکر بڑے فخر و ناز سے کیا ہے:

(۱) وزیں.. فرمانِ آموزگار است... دمن آئینِ[6] معنیٰ آفرینی و کیشِ یگانہ بینی ازدے فراگرفتہ ام.. برروان وے آباد..

رشح کفِ جم می چکد از مغزِ سفالم[9] — سیرابی نطقم اثرِ فیضِ حکیمست" د ص ۱۳ و ۱۴

قاطع = قاطع برہان ۔ برہان = برہان قاطع (نسخہ مطبوعہ ۱۲۷۴ھ کے صفحات کے حوالے دیے گئے ہیں)۔ د = درفش کاویانی، قاطع کی اشاعت ثانی۔ د ا = د کی جگہ د ا اگر کوئی عبارت صرف د میں ہے، قاطع کی اشاعت ثانی میں نہیں۔ محرق = محرق قاطع برہان طبع ۱۲۸۰ھ، ل = لطائف غیبی طبع ۱۲۸۱ھ۔ ردّ محرق مصنفہ غالب مگر منسوب بہ سیاح۔ (حوالے صفحوں کا نہیں لطیفوں کا دیا گیا ہے)۔ مؤید = مؤید برہان طبع ۱۲۸۲ھ۔ تیغ = تیغ تیز از غالب ردّ مؤید۔ قطع = قاطع القاطع ردّ قاطع طبع ۱۲۸۳ھ اس کتاب کا جواب غالب نے نہیں دیا۔ ای = اردوئے معلّیٰ طبع لاہور ۱۹۲۲ھ۔ ض = غالب کا ایک طویل خط بنام ضیاء الدین جس کا عکس غ میں شائع ہوا ہے۔ عود = عود ہندی انوار المطابع الہ آباد۔ غ = علی گڈھ میگزین کا غالب نمبر ۱۹۴۵ء۔ ی = غالب کی راست گفتاری از راقم علی گڈھ میگزین ۱۹۴۸ء۔ مح = "غالب بہ حیثیت محقق" از راقم۔ جہاں = فرہنگ جہاں گیری مطبوعہ۔ ی = یادگار غالب طبع لکھنؤ۔

اور ۲ ض۔ بزرجمہر چاہیے۔ جیم فارسی سے بالکل غلط اور غالب نے اسی سے لکھا ہے۔ ۳ د اعبارت فصل ۲ میں ملی۔ ۴ ض ۵ و ۶ ط تیغ ص ۱۳ و ۱۴ کے معنی آفرینی = شاعری۔ عود کی عبارت جس میں استاد کی مشق کا ذکر ہے فصل ۲ میں ہے۔ ۸ یگانہ بینی = توحید وجودی" ودیگر از ہبیں انبوہ پارسیاں یگانہ بیناں کہ دایشاں

(۲) "لطائف فارسی بجت غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میری حالی ہوئی۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا.. حقیقت اس زبان کی.. خاطر نشاں ہوگئی" ص

(۳) "چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے، بارے مراد بر آئی، اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا.. اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے" مکاتیب غالب اشاعت ثانی ص ۶۰

۱) غالب نے عبدالصمد کے جو حالات لکھے ہیں وہ کچھ زیادہ نہیں: اصلی نام ہرمزد تھا اور سلسلۂ نسب [11] ساسان پنجم تک پہنچتا تھا۔ اس کا وطن [12] یزد تھا اور وہاں کے "جلیل القدر [13]" امیرزادوں میں شمار ہوتا تھا۔ "علمائے عرب [14] و بغداد" سے پچاس برس" علوم عربیہ تحصیل کرنے کے بعد زردشتی مذہب [15] ترک کر کے مسلمان ہو گیا تھا، اور اپنا اسلامی نام عبدالصمد [16] رکھا تھا۔ یہ "مومن موحد و صوفی صافی [17]" بطریق سیاحت ۱۲۲۶ھ [18] میں آگرہ پہنچا اور دو سال وہاں غالب کے گھر [19] میں مہمان رہا۔ غالب نے یہ نہیں بتایا کہ آگرہ کہاں سے آیا تھا اور وہاں سے اس کا کہاں جانا ہوا۔ غالب کے قیام دہلی کے بعد تک اس سے مراسلت رہی، اور وہ کبھی کبھی اپنے خط میں اپنا نام عبدالصمد کی جگہ "ارونہ [20] بندہ" بھی لکھا کرتا تھا۔ غالب نے یہ نہیں بتایا کہ ۱۲۲۶ھ میں اس کی کیا عمر تھی، لیکن جس شخص نے پچاس برس علمائے عرب و بغداد سے تحصیل علم کی ہو، وہ اس وقت ۶۵ برس سے کم کا ہو، یہ قرین قیاس نہیں۔ زمانۂ وفات کی یقین غالب نے نہیں کی، لیکن قاطع وغیرہ میں جو الفاظ اس کے لیے استعمال کیے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ قاطع کی تصنیف سے پہلے ہی وہ راہی عدم ہو چکا تھا۔ عبدالصمد سے استفادے کے بہ بانگ دہل اعلان کے باوجود، غالب یہ بھی کہا کرتے تھے کہ "مجھ کو مبدءِ

---

۴ راجشائی خوانند۔ نزد ایشاں جہاں را در خارج وجودی نیست، ہرچہ ہست ایزد است، جدا او چیزی نہ" دبستان مذاہب ص ۵۔ ۹ کلیات نظم فارسی ص ۲۰۶ ۔ غزل کا شعر ہے۔

۱۰ د ص ۱۳، ل ۱۵۔ ۱۱ ل ۱۵۔ د میں ہے "پارسی نژاد فرزانہ بود از تخمۂ ساسانیاں" ص ۱۳۔ ۱۲ ل ۱۵ ۱۳ و ۱۴ ل ۱۵۔ ۱۵ د ص ۱۳ ل ۱۵۔ ۱۶ "و خود را عبدالصمد نامیدہ" د ص ۱۳، مگر حالی کہتے ہیں کہ عبدالصمد نام رکھا گیا۔ ی ص ۱۴۔ ۱۷ اض۔ ۱۸ و ۱۹ د ص ۱۳ "در اکبر آباد .. دو سال بکلبۂ احزان من آسودہ است" مگر حالی لکھتے ہیں "دو برس تک مرزا کے پاس اول آگرہ میں اور پھر دلی میں مقیم رہا"

فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے، اور عبد الصمد محض ایک فرضی نام ہے، چوں کہ مجھ کو لوگ بے اُستادا کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی اُستاد گڑھ لیا ہے۔" ی ص۱۴

(۲) عبد الصمد سے متعلق غالب کے بیانات میں تضاد ہے، لیکن فی الحال اسے نظر انداز کر کے، یہ دیکھنا ہے کہ "فارسی بحت"، کے وہ "لطائف"، اور "فارسی آمیختہ بہ عربی"، کے وہ "غوامض"، جو اس کے حوالے سے غالب نے پیش کیے ہیں کس پائے کے ہیں:

(۱) فارسی میں دو حرف "متحد المخرج" بل کہ قریب المخرج" موجود نہیں، ⊕ س سے ث و ص نہیں، ت سے ط نہیں، الف سے ع نہیں، غ سے ق نہیں، ز سے ض اور ظ نہیں۔ اس صورت میں یہ کیوں کر روا رکھا جا سکتا ہے کہ "دو حرف متحد المخرج" ذ اور ز فارسی میں موجود ہوں؟ ذ جو فارسی میں آتی ہے، اس کی وجہ یہ بیان کی ہے:

"دبیرانِ پارس را قاعدہ چناں بود کہ بر سرِ دال ابجد نقطہ نہادندے، پسینیاں ازیں رسم الخط بہ وجود ذال منقوطہ در گماں افتادند۔ چوں دریں اندیشہ وجود دال بے نقطہ از میاں می رفت و ہمہ ذال منقوطہ می ماند، اکابر عرب قاعدہ قرار دادند، و تفرقہ، دال و ذال را بر آں قاعدہ اساس نہادند" (ص۱۳)

غالب کو اس توجیہ پر بڑا ناز تھا، مگر یہی بات کسی قدر اختلاف کے ساتھ جہاں میں موجود ہے۔ غالب نے کمال یہ کیا کہ صاحب مؤید نے جہاں کی عبارت نقل کی تو باوجود اس کے کہ کتاب کا حوالہ صراحتہً موجود تھا، انھوں نے صاحب مؤید پر [۲۱] یہ الزام لگایا کہ

ی ص۱۴ حالی نے یہ نہیں بتایا کہ عبد الصمد کے قیام دہلی کا حال انھیں کس طرح معلوم ہوا۔ [۲۰] د ص۲۰ کے کل باتیں جو غالب نے عبد الصمد کے حوالے سے لکھی ہیں نقل کر دی گئی ہیں، لیکن بعض امور سے متعلق اظہار رائے کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے۔ ⊕ ہندوستانی س اور ص میں فرق نہ کرتے ہوں، لیکن سعدی کے ایک شعر سے جس میں فضل کا قافیہ عدل آیا ہے، ایران کے متعلق جو نتیجہ نکلتا ہے واضح ہے۔

[۲۱] تفاصیل ر ص۴۰ د۱۷ غالب کو ان مخطوطات کا ذکر کرنا تھا جن میں د و ذ میں فرق نہیں۔

انھوں نے مجھ سے سرقہ کیا ہے:

"حضرات کو میں اس امر خاص میں بہت تکلیف دوں گا اور داد طلبی میں اصرار وابرام کروں گا۔ فرہنگہائے پیشیں میں کوئی مجھ کو یہ مطلب دکھادے تو میں گنہگار، ورنہ مولوی اٹھائی گیرا۔ یہ راز مجھ سے شت ہرمزدتخم مولانا واولانا حضرت مولوی عبدالصمد علیہ الرحمتہ نے کہا ہے، دوسرا کوئی اس کو نہیں جانتا تھا۔ ایسی نئی بات کو چُرانا اور اپنا قول بنانا چوری اور سرزوری خیرہ رائی اور بے حیائی ہے یا نہیں؟ . . اے اہلِ عقل کوئی تو بولو خدا لگی"، تیغ صـ۱۲

فارسی میں "دو قریب المخرج" حروف کے وجود کا انکار بدیہیات کا انکار ہے۔ ب پ وف قریب المخرج ہیں، اسی طرح ر اور ل، د اور ت وغیرہ طرہ یہ کہ غالب نے خود قاطع میں دوسری جگہ اس کا اقرار کیا ہے کہ فارسی میں قریب المخرج حروف ہیں۔ غالب رستاد (ایک فارسی لفظ) کی بحث میں لکھتے ہیں: "چوں در دو حرف قریب المخرج برافکندن احد المتجانسین رسم است،" د صـ۴۷۔ ذ کا صحیح تلفظ جن لوگوں کو معلوم ہے وہ کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ز اور ذ متحد المخرج ہیں۔ فارسی میں وجود ذ کی جو وجہ غالب نے لکھی ہے وہ جہان میں موجود ہے، لیکن یہ کتاب ہندوستان میں عہد جہاں گیری میں تمام ہوئی ہے، اور زمانہ قدیم کے بارے میں اس کے وہ بیانات جن کی سند اس میں نہیں، لازماً قابل قبول نہیں۔ پانچویں، چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے فارسی مخطوطات موجود ہیں، مگر ان سے غالب اور صاحب جہاں کے اس دعوی کی کہ کاتب دال بھی ذال کی طرح لکھا کرتے تھے، تصدیق نہیں ہوتی۔ یہ بات کہ دو ذ میں فرق کرنے کے لیے 'اکابر عرب' نے کوئی قاعدہ بنایا تھا، جہاں میں نہیں، اور کسی طرح قرین قیاس بھی نہیں سمجھی جا سکتی۔ عربی میں ایک[۲۲] مختصر سی نظم اس کے متعلق البتہ

---

۲۲ تاریخ گزیدہ میں یہ نظم بہ نام ظہیر فاریابی اور فرہنگ شعوری (فارسی ترکی جلد اطبع قسطنطنیہ) میں بھی یہی ہے مگر حاشیۂ القاموس المحیط (طبع قاہرہ) میں بہ نام ابو النصر فاریابی۔ حلل مطرز در فن معما و لغز مصنفہ شرف الدین علی یزدی مؤلف مشہور (نسخۂ سید محفوظ الحق مرحوم) میں یہ نظم موجود ہے، مگر مصنف کا نام نہیں دیا۔ کلیاتِ ظہیر کی تینوں مطبوعہ اشاعتیں اور متعدد قلمی نسخے جو میری نظر سے گزرے ہیں، اس سے خالی ہیں۔

ہے، مگر یہ کسی عرب کی طرف منسوب نہیں۔ قدیم ترین فارسی کتاب جس میں یہ قاعدہ ملتا ہے، المعجم فی معاییر اشعار العجم ہے۔[۲۳]

"بدانک در صحیح لغت دری ما قبل دال مہملہ الا راء ساکن چنانک درد و مرد یا زاء ساکن چنانک دزد و مزد یا نون ساکن چنانک کمند و گزند نباشد و ہر دال کی ما قبل آں یکی از حروف مد و لین است، چنانک باذ و شاذ و سوذ و شوذ و دیذ و کلید یا یکی از حروف صحیح متحرک است چنانک بمذ و سپذ و دو ہمہ ذال معجمہ اند۔ و در زبان اہل غزنین و بلخ و ماوراء النہر ذال معجمہ نیست و جملہ دالات مہملہ در لفظ آرند" ص ۱۹۲

نصیر الدین طوسی، ابن یمین[۲۴] وغیرہ کی طرف بھی ایسی نظمیں منسوب ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ کن فارسی لفظوں کو ذال لکھنا چاہیے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ خود غالب کے اس بیان سے کہ دو ذ میں تمیز کرنے کو قاعدہ بنایا گیا تھا، یہ ثابت ہے کہ فارسی میں ذ تھی، نہ ہوتی تو صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوتا کہ یہ حرف فارسی میں نہیں۔ حقیقت حال فاضل بزرگ، محمّد بن عبد الوہاب قزوینی مرحوم کے الفاظ میں یہ ہے:

---

۲۳ المعجم اوائل ماہ ہفتم میں لکھی گئی ہے۔ حسین بن ابراہیم نطنزی (متوفی ۴۹۹ھ) (نسخۂ کتب خانۂ مشرقیہ پٹنہ (ورق ۱۵۵) میں یہ عبارت ہے: "والحروف لا تدخل الفارسیۃ ثمانیۃ یجمعہا: صع حط ثظ فقض" اس سے صاف ظاہر ہے کہ نطنزی کے نزدیک ذال فارسی حروف میں ہے۔

مع میں جو ذال کی بحث ہے وہ بھی دیکھی جائے۔

۲۴ ابن یمین کا ایک قطعہ جو اس کے کلیات سے ماخوذ ہے "فرہنگ غالب" (نوشتۂ راقم ص ۲۵۸) میں موجود ہے۔ واضح رہے کہ جن الفاظ کو غالب ذ کی بجائے د سے لکھنا چاہتے ہیں، ان میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر سب کے سب ایران میں د سے لکھے جاتے ہیں، اور انھیں کسی زمانے میں ذ سے لکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ڈاکٹر منوہر سہائے انور نے جو آرزو پر ایک بسیط محققانہ مقالے کے مصنف ہیں، مجھے لکھا تھا کہ آرزو نے بھی آخر عمر میں وہی رائے ظاہر کی تھی جو غالب کی ہے۔ اس صورت میں غالب کے ہم نوا اور بھی ہیں، لیکن، سوال ایران کا ہے، ہندوستان کا نہیں۔ اس بات سے کہ تسلط اسلام سے پہلے ایران میں کوئی حرف ایسا تھا یا نہیں جس کی آواز ذال کی ہو، کبھی اور بحث کی جائے گی۔

"در بلاد زبان فارسی بہ استثنای بعض نواحی۔ تا قرن ششم و ہفتم بل ہشتم ہجری
ما بین دال و ذال فارسی تمیز می دادہ و فرق می گذاشتہ اند، ہم در تلفظ ظاہراً و ہم در کتابت
قطعاً۔ و در اغلب نسخ فارسی کہ اکنوں بدست است، و قبل از قرن ہشتم استنساخ شدہ
است، ذالہای فارسی عموماً با نقطہ مسطور است، ولی از حدود قرن ہشتم بعد بجہات
نامعلوم بتدریج ایں تمیز از میانہ برداشتہ شد، و ذالہای معجمہ متدرجاً بہ دالہای
مہملہ مبدل شد، و اکنوں در ایران جمیع ذالہای فارسی را دال مہملہ خوانند و نویسند،
بہ استثنای قلیلی از کلمات چوں گذشتن و گذاشتن و پذیرفتن و آذر و آذربایجان
وغیرہا" (مقدمہ، تاریخ جہانگشای حاشیہ، صفحہ فج)

(٢) "... عبدالصمد گاہ گاہ در مکاتبات خود را اروند بندہ نوشتی، چوں پژوہش
رفت فرمود کہ اروند بندہ مضاف و مضاف الیہ مقلوب است، یعنی بندۂ اروند،
بندہ ترجمۂ عبد و اروند ترجمۂ صمد و نیز می فرمود کہ چوں طبائع لطیف استعارہ را دوست
دارد، اروند را کہ اسم کوہ است، بہ معنی تمکین و وقار و شان و شوکت نیز آرند"
(ص ۱۰۸) ('صمد' کے کیا معنی غالب کے نزدیک ہیں، اس کے لیے فصل آخر دیکھی جائے)۔ دنیا میں
عبدالصمد کے سوا کسی نے اروند و صمد کو ہم معنی نہیں کہا (برای تفاصیل ← فصل ۲)
یہ قول بھی محتاج ثبوت ہے کہ اروند پہلے کسی پہاڑ کا نام تھا، بعدہٗ مجازاً تمکین و وقار
وغیرہ کے معنی میں مستعمل ہوا۔

(٣) "اورمزد و ارمزد و ہرمزد ہر چہار لفظ بزای ہوز اسم مشترک است۔۔
و اسفندارمزد و اسفندارمز ہم نام ماہ ہست و ہم نام روز و ہم نام سروش و
ایں افادہ نیز از فیض تقریر مولانا عبدالصمد است علیہ الرحمۃ" (ص ۱۰۸)

اورمزد وغیرہ کے جو معنی غالب نے دیے ہیں، 'برہان' میں بھی ہیں، اس لیے عبدالصمد
کی ان سے واقفیت اس کے لیے مایۂ نازش نہیں ہو سکتی۔ ظاہراً غالب کا یہ خیال ہے کہ
'مز' اور 'مزد' ان تمام الفاظ میں ایک ہے، مگر حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اورمزد
و ہرمزد وغیرہ درست ہیں، لیکن، اسفندارمز اور اسفندارمزد صحیح املا نہیں، ز کی جگہ

جگہ دِچا ہے۔ قدیم ایرانی زبانوں میں ان کی جو شکلیں ہیں، وہ ہرگز زکی مؤید نہیں۔ متداول فرہنگوں میں بھی خواہ وہ ایران میں لکھی گئی ہوں، خواہ ہندوستان میں یہ الفاظ ذ ہی سے ہیں، گو اس کا امکان ہے کہ غلطی سے کسی ایرانی نے ان میں کسی کو ز سے لکھ دیا ہو۔

(۴) "از استاد شنیدہ ام کہ گند چنانکہ معنی قوّت جسمانی دہد، افادۂ معنی قوّتِ عقلی و علمی نیز کند، ازینجاست کہ مرد دانشمند را گُندا گویند" (ص ۱۳۵)

(۵) "پوشتن۔۔ وپشتن۔۔ مصدریست پارسی الاصل (کذا) ومضارع نیز دو صورت دارد: پوژد و پژد۔ ہر آئینہ مصدر مضارعی نیز دوگونہ می تواں ساخت پوزیدن و پزیدن۔ امّا معنی ایں ہر چہار دعا خواندن و بر آب و شربت دمیدنست، و ایں چنیں را در فارسی دُردن بہ دال مضموم و واو معروف و چیزیکہ دروں بر آں دمیدہ باشند پوشتہ وپشتہ و پوزدہ و پزدہ گویند و پوزش و پزش حاصل بالمصدر پوزیدن و پزیدن است کہ مجازاً بمعنی عذر و استعذار آید۔ اکنوں در دبستان مذاہب ہمیگریم کہ پشتن وپشتہ بہ تحتانی نوشتہ اند۔ حاشا کہ رستم بیگ دبستان مذاہب کہ گرانمایہ ایست بغوامض دین زردشتیاں ودقائق نطق پارسیاں دریں منطق خطا کندو۔۔ بپای حطی نویسد۔ اتفاق کارواں کارواں کاتبانست، بر غلط نوشتن۔ نگرندگان مشاہدہ را شاہد گرفتند، وہم بریں جادہ رفتند، و اگر فرزانہ فرزبود آئین عبدالصمد را نمودی، نامہ نگار نیز یکے از نگرندگاں بودی، نہ خود راہ راستین پیمودی ونہ دیگراں را آگہی افزودی" (ص ۱۴۴)

پوشتن وپشتن فارسی مصادر نہیں۔ پشتن پہلوی ہے "بمعنی ستودن و عبادت کردن و فدیہ آوردن" ہے (مقدمۂ یشتہا جلد ۱ ص ۱۴ از آقای پور داؤد)۔ کسی زردشتی کا اسے پشتن کہنا ویسا ہی ہے جیسے ایران کے کسی مسلمان کا نماز کو نماز اور روزہ کو روزہ کہنا۔ پوزیدن فارسی مصدر ہے، مگر اس کے معنی پشتن سے مختلف ہیں، اور یہ دونوں ایک دوسرے سے کچھ سروکار نہیں رکھتے۔ (مزید تفاصیل کے لیے رجوع فصل ۱)۔ کمال یہ ہے کہ غالب یہ بھی نہیں کہتے کہ دبستان مذاہب کے کسی نسخے میں پشتن اور پشتہ مجھے پ سے ملا ہے، وہ خود

معترف ہیں کہ کاتبوں کا اتفاق ہی سی لکھنے پر ہی۔ جس طرح دن اور تن علامت مصدر ہیں یدن بھی ہی۔ ایک ریشے سی دو مصدر ایک دن یا تن کے ساتھ اور دوسرا یدن کے ساتھ آتی ہیں، یا نہیں اس کا انحصار سماعت پر ہی۔ اگر پوزیدن ہی تو اس سی یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ پوشتن لازماً ہونا چاہیے (یہ بات غالب ذیل میں کہی ہی) ٹھیک اسی طرح جیسے کہ سزیدن کے وجود سی سزدن کی ہستی پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ فارسی میں بہ یک وقت آوردن اور آوریدن، پژمردن اور پژمریدن، گستردن اور گستریدن وغیرہ کا ہونا اس کا مجاز نہیں کرتا کہ ہر مصدر کی امر پر یدن، کا اضافہ کیا جائے۔

دروں کے متعلق غالب کے قلم سی جو کچھ نکلا ہی وہ اس اختلاف کے ساتھ جو شتین کو یای فارسی سی پڑھنے سی پیدا ہو جاتا ہی، یعنی کتاب برہان میں بھی ہی (ص۳۲۴؛ لیکن دروں بہ ضمۂ دنہیں، بہ فتحۂ د ہی (پہلوی پازند انگریزی فرہنگ (ص۱۷۲) دروں کے معنی دیباچہ ایسنا میں یہ دیئے ہیں: "در پہلوی دروں .. عبارتست از نان کوچک گرد بدوں خمیر مایہ کہ بہ سروش نذر می شود۔ این نان مقدس نقط علامتی است، واشارہ است بہ نذور و خیرات" ص۲۵۔

(۶) "چوں تازیاں بر پارسیاں چیرہ دست آمدند.. بسیاری بصدقِ دل مسلمان شدند، برخی.. آشکارا اسلام گزیدند و نہانی ہم بر آں جادۂ پی سپر ماندند آں کہ یزدانِ اہرمن دوست.. ہر گونہ دقائق وحقائق کہ از اسلامیاں شنوندند بہ کنج نشستند و بہ اتفاق منافقانِ دگر از بہر ہر مسمّیٰ اسمی تراشیدند.. وچنیں وانمودند کہ زردشت بطریق پیشگوئی.. چنیں فرمودہ است.. آنچہ از معجزات.. در زمرۂ مسلمیں شہرت یافت ہمہ بر زردشت بستند و برای وی عروج ما نا بہ معراج نبی ہاشمی نشاں دادند و گذشتن از افلاک و رسیدن بہ فرگاہ دادار پاک و شنیدن سخن از غیب و دیدن بہشت و دوزخ ہمہ را در دامنش ریختند و کراسہ وخشور را بہ معنی مصحف مجید و سیناد.. بہ معنی سورہ و چینود بہ اعراب مجدلہ بہ معنی پل صراط نتیجۂ لفظ آفرینی

این گروه .. است .. عبدالصمد این راز با من میگفت و بر فریب[۲۵] و نیرنگ پارسیان می خندید۔ نگارندۂ دبستان مذاہب رای از بیان میدانست۔ از سوره سوره بودن ژند و سیمناد بودن نام سوره در اصل وجود داشتن پل صراط در کیش زردشت ابای کرد و این اخبار و این اسمارا ہم بافتۂ شوریده مغزان پارس دانی نمود و می فرمود که بزبان دری دو نشز ہای باب انفظ .. در و مجمل فصل تنسک آرند .. و فصل را بر باب مقدم دارند و ہر تنسک یعنی ہر فصل ہے۔ باژ چند یعنی دری چند مشتمل باشد چنانکہ مجموع ژند بیست و یک نسک ارد و صد ده۔ ہمانا نسک را بخش میتواں گفت .. و ابواب و فصول مروجۂ حال را در تقدیم و تاخیر بدان فصول و ابواب مطابق نتوان اندیشید چوں از نظم پرسش بمیاں آمد گفت که در نظم قافیہ را پیوند گویند و ردیف را پساوند و غزل را چامہ و غزل دراز را چیگامہ۔ اما اوزان و بحور در میان پارسیان نبود۔ زمزمۂ این گروہ بے اشعار ہند۔ یان می دانست که فقرہ فقرہ الفاظ[۲۶] متحد الآخر فراہم آرند و در وزن برابر نباشد۔ اوزان و بحور از متخرجات طبع عالیۂ اہل عرب است۔ گفتم ابتدای بروز کلمۂ موزوں از زبان .. بہرام گور است۔ گفت چنیں خواہد بود۔ بہرام در عراق و عرب نشو و نما یافتہ است، در شکارگاہ وقت زدن صید یا بردن گوی از راہ نشاط زمزمۂ سرودہ باشد، علمای آں سرزمین بنظرہای دقیق و فکرہای ژرف قانون نہاد وضع کردند و قاعدہ ہا نہادند و این اساس را چناں که اکنوں در عرب و عجم

---

۲۵ "فریب و نیرنگ پارسیاں" یہ غالب یا عبدالصمد کو ہنسنے کا حق حاصل نہیں۔ غالب عمر بھر دساتیر کی اصلیت کے قائل رہے اور اس کے مصنوعی الفاظ کو جن کا ایران کی کسی زبان سے کچھ تعلق نہیں، فخریہ استعمال کرتے رہے۔ ساسان پنجم بھی جس سے غالب عبدالصمد کا سلسلۂ نسب ملاتے ہیں، ایک خیالی ہستی ہے۔ ساسان پنجم کا جو نسب نامہ دبستانِ مذاہب میں ہے، دساتیر کے مطابق ہے، لیکن کسی طرح باور کرنے کے قابل نہیں۔ ساسان پنجم خسرو پرویز نبیرۂ نوشیرواں کا ہم عصر ہے اور دارا کو جو سکندر سے مغلوب ہوا اس کا جد سوم لکھا ہے، حالانکہ پرویز اور دارا کے درمیان ۰۰ ۵ برس سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ ۲۶ تعجب ہے کہ غالب نے دوہڑے اور چوپائیاں بھی نہیں دیکھیں جن کے آخر میں قوافی ہوتی ہیں۔

شائستہ استواری دادند۔ نہ بینی کہ مطالب ودر بایستہای این فنّ فرخ را در پارسی زبان نامی نیست" (ص ۱۳۲ و ۱۳۳) "دانش آموز درخشاں تراز روز فرزانہ ہرمزد تم عبدالصمد میفرمود کہ ہر صحیفہ کہ بر وخشوران پارس از آسمان فرود آمدہ است در آسمانی زبانست کہ آنرا فرآئین نواد گویند۔ آرش آں واژہ ہای وشیرہ وآں سخنہای پاکیزہ پیمبراں را بہ میانجی سروش از فرگاہ دادار پاک بردل فرو میریزد وایں روشن گہراں آزاد دلنشیں پیرہ دخشوراں میکنند تا آں رازہای سترگ را در زبان قوم بہ بند نگارش درآورند، چنانکہ پایخواں زند کہ بہ پاژند مشہور است، ہم چنیں ہمسیراز دساتیر کہ ساسان پنجم بزبان دری نگاشتہ است۔ از جانب من پژوہش رفت کہ در دل چناں فرود می آید کہ ژند ودساتیر را زبان یکے خواہد بود۔ گفت آری۔ گفتم از ژند و پاژند در گیتی نشان ماندہ باشد۔ گفت نماندہ است مگر نسکی چند از پاژند۔ گفتم مگر ہنجار نگارش پاژند و عبارت ساسان پنجم یکیست۔ گفت البتہ۔ اکنوں غالب ہیچداں میپرسد کہ ایں فرہنگ نگاراں لغتی چند و مصدری چند می آرند و مآخذ آں لغات و مصادر چناں وامی نمایند کہ ژند است، ژند کجاست کہ لغات و مصادر از آں بدر تواں کشید و اگر ہست ناشناسا ز بانیست کہ بہ دری و پہلوی ویژہ ارمی نماند" (ص ۱۳۵)

(الف) منافقین ایران کی جس منظم کوشش کا غالب نے ذکر کیا ہے، وہ محتاج ثبوت ہے۔ "بہ اتفاق منافقان دگر" کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ ایرانیوں کے علاوہ اور قوموں کے منافق بھی اس کوشش میں شریک تھے، اس دعوی کی بھی کوئی سند موجود نہیں۔ میرا خیال ہے کہ غالب کا بیان دبستانِ مذاہب کی عبارت ذیل پر مبنی ہے جو سمرادیوں سے متعلق ہے:

"وایشاں اکنوں با مسلماناں درآمیختہ اند در لباس مومناں می گردند و بر مذہب ایشاں کامگار نامی 'زپارسیۂ (کذا) ایں گروہ کہ در عہد .. محمود .. رسالۂ منظوم نوشتہ .. وایں کیش را بر دیگر آئینہا ترجیح دادہ باین وجہ کہ سرا سرارباب ادیاں از عقائد خود آنچہ ذکر کردہ اند از وجود خدای .. و بہشت و دوزخ صراط وحشر

دلشر و سوال وجواب . . ہمہ در کیش درست بود" ص۲۲

کامگار کی کتاب کا حال مجھے معلوم نہیں، اور یقین نہیں کہ لکھی بھی گئی ہو لیکن یہ مسلّم ہے کہ تسلط اسلام کے بعد زردشتیوں نے ایسی کتابیں تحریر کی ہیں جن میں اسلام پر اپنے عقائد کی فوقیت دکھائی ہے اور اسلام و زردشتیت میں خواہ مخواہ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ زردشت کی کوئی پیش گوئی اسلام سے متعلق موجود نہیں، زردشت کا نبی ہونا ایک ایسا عقیدہ نہیں، جو ایران میں اسلام کے استیلا کا نتیجہ ہو۔ کسی خاص معجزے کا کسی نبی سے سرزد ہونا یا نہ ہونا اس کے صادق یا کاذب ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ نبی کے لیے غیب کی آواز سننا کوئی بڑی بات نہیں، معراج زردشت کا عقیدہ بھی قدیم سے چلا آرہا ہے اور کم از کم غالب کے جو دساتیر کی اصلیت کے قائل ہیں، یہ کہنے کا حق نہیں کہ مسلمانوں سے لیا گیا ہے، اس لیے کہ معراج زردشت کا ذکر دساتیر میں ہے (تفاصیل مع)۔

(ب) کراسہ عربی لفظ ہے۔ قاموس جلد ۲ ص۲۴۶ میں ہے: "الکراستہ جزء من الصحیفۃ" بنے بہ معنی قرآن مستحدث سہی، لیکن لفظ پرانا اور پشتن سے مستخرج ہے — اکابر شعرای ایران نے اسے استعمال کیا ہے:

"نرم دار آواز بر انسان چو انسان زانکہ حق	انکر الاصوات خواند اندر پنے صوت الحمیر" سنائی[27]
"مر ضعیفاں را تو بے خصمی مداں	از پنے اذا جاء نصر اللہ بخواں" رومی

(ج) ظاہرا غالب یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ لفظ سورہ قرآن کے لیے مخصوص ہے، یہ صحیح نہیں، ادیب صابر کا شعر ہے:

"بہ سورۂ توریت و سطر سطر زبور	بہ آیۂ آیۂ انجیل و حرف حرف نوی"

اس سے قطع نظر، سیمناد بہ معنی سورہ دساتیر میں آیا ہے جس کی قدامت کے غالب قائل ہیں۔

---

[27] یہ دونوں شعر جہاں ہیں میں اور پہلا کلیات سنائی مطبوعہ بمبئی موجود ہے، دوسرا ظاہرا مثنوی رومی کا ہے، لیکن میں نے ابھی مثنوی میں اسے تلاش نہیں کیا۔ یہ لفظ ب اور دے بھی لکھا جاتا ہے۔

(د) چینود[۲۸] گاتھا میں آیا ہے اور اس کی قدامت تمام محققین مشرق و مغرب کے نزدیک مسلم ہے۔ پل صراط کا خیال زردشتیوں نے مسلمانوں سے نہیں لیا، مسلمانوں نے زردشتیوں سے لیا ہے۔ چینود ان الفاظ میں نہیں، جن کے حرکات و سکنات نامعلوم ہوں، اس لیے کہ یہ اوستائی لفظ ہے اور اوستائی رسم خط ایسا ہے کہ کسی لفظ کے حرکات و سکنات کے متعلق شبہہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ غالب نے ل (۱۱) میں میں اس سے صراحتاً انکار کیا ہے کہ عبدالصمد نے انھیں چینود کے بارے میں کوئی بات بتائی تھی: "بھلا اتنا تو سمجھے ہوتے کہ اُستاد شاگرد کو لفظ بتائے اور اعراب چھپا رکھے" حال آں کہ قاطع میں[۱۳۲] اس کی نسبت جو کچھ ہے عبدالصمد ہی کے حوالے سے ہے۔

(ک) نسک اور در کے متعلق جو کچھ غالب نے لکھا ہے کس حد تک صحیح ہے، اس کا اندازہ فصل اسے ہو سکتا ہے۔

(ن) ایران شناسوں کے مسلمات سے ہے کہ گاتھا منظوم ہے اور یہی حال یشت کے کچھ اجزا کا ہے۔ کچھ لوگ اس کے بھی قائل ہیں کہ پہلوی میں کلام منظوم موجود ہے۔ گاتھا اور یشت کی نظم اس طور کی نہیں جو غالب کے قول کے مطابق ہندی نظموں کی ہے۔

(ع) بہرام گور کا شعر کہنا بہت سی کتابوں میں درج ہے، لیکن ان میں ایک بھی اتنی قدیم نہیں کہ تشفی بخش ثبوت سمجھی جا سکے۔

(ط) بہرام نے واقعی عراق عرب میں نشوونما پائی تھی، لیکن عربی عروض کی بنا وہاں پڑنے کی یہ وجہ نہیں۔ اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ خلیل واضع عروض عربی نے بہرام کے اصلی یا فرضی اشعار دیکھے تھے، یا عراق عرب کے شعرا نے عربی اشعار بہرام کے تتبع میں کہے۔

---

۲۸ چینود ایران کے بعض مستند اساتذہ کے کلام میں بھی آیا ہے۔ دسوک تک جو مباحث ہیں ان کے لیے ع فصل اور ۲ دیکھی جائے۔

(ی) پرانے زمانے میں مختصر یا طویل غزل تھی کہاں جو ان کے لیے چامہ و چگاسہ جیسی اصطلاحیں مستعمل تھیں، ۔ردیف بھی خود غالب کے قول کے مطابق قدیم نہیں، اس لیے اس کے لیے بھی کوئی قدیم لفظ نہیں مل سکتا۔ رہا ان کا مستحدث ہونا، تو یہ غالب نے کہیں لکھا نہیں، اور اس بنا پر کہ انھوں نے صاحب برہان پر بڑی سختی سے اعتراض کیا ہے کہ وہ الفاظ کے مستحدث ہونے کا ذکر نہیں کرتا، تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ الفاظ ان کے نزدیک معانی زیر بحث میں قدیم ہیں۔ پیوند و پساوند کے معانی کی نسبت قاطع برہان کی دونوں اشاعتوں میں کچھ اختلاف نہیں، لیکن، دستنبو کی کل اشاعتوں میں پیوند بہ معنی ردیف اور پساوند بہ معنی قافیہ ہے۔

(ک ش) ساسان پنجم فرضی مترجم و مفسر دساتیر ہیرہ وخشور (خلیفہ) نہیں، وخشور (پیمبر) ہے۔ عبد الصمد اوستا سے جو اصلی کتاب ہے، کسی قسم کی واقفیت کا اظہار نہیں کرتا۔ اوستا اور زند کے معتد بہ اجزا موجود ہیں۔ دساتیر اور زند کی زبان ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ پازند زند سے مختلف نہیں، فرق یہ ہے کہ زند پہلوی خط میں لکھی جاتی ہے اور ہزوارش اس میں موجود ہے، پازند اوستائی خط میں لکھی جاتی ہے اور ہزوارش سے خالی ہے۔ ترجمہ و تفسیر دساتیر کی زبان موجودہ فارسی ہے جس میں کچھ مصنوعی الفاظ شامل ہیں۔

(۳) اس فصل میں یہ دکھایا جائے گا کہ غالب کی زندگی میں ان کے مخالفین نے عبد الصمد کے متعلق کیا کہا اور غالب نے اسے دیکھ کر کیا کہا:

(۱) "اکنوں راست راست و واشگاف مینگارم کہ مرزا غالب دو سال در عمر سیزدہ سالگی و چہاردہ سالگی در میوہ خوری و کلاہ زر دوزی کج نہادن روز بروز ہرمزد . . گذرانیدہ باشد و سوای چند الفاظ پارسی غیر مشہورہ کہ وی ہمیں را داشتہ باشد نیاموختہ و اگر باور کنم کہ وی عالم و زباندانِ پازند بود تاہم بچہء سیزدہ سالہ و چہاردہ سالہ بجز خورد و نوش بہ دیگر امور علم افزای خرد ہوش کے نپردازد" محرق ص ۶۸

"اگر ہرمزد . . پیکر ہستی را نگذاشتے مثل آغا عبد الرشید خوشنویس کہ وی اشعار

درحقِ خواجہ محمود نگاشتہ بود لوادی مرزا.. غالب ہمچنیں فرمودندی:

خواجہ محمود آنکہ یک چندی[۲۹] بود شاگرد ایں فقیر حقیر
درحق او نرفتہ تقصیری لیک او ہم نمی کند تقصیر
می نویسد ہر آنچہ از بد و نیک جملہ راحی کند بنام فقیر" صـ۶۹

مصنفِ محرق کے اقوال کا اس کے سوا کچھ اور مطلب نہیں کہ جس عمر میں غالب عبدالصمد سے اپنا ملنا بتاتے ہیں، وہ ایسی نہیں کہ اس سے زیادہ استفادہ کر سکے ہوں۔ غالب نے قاطع میں خود اپنی رائیں عبدالصمد کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ غالب نے محرق کے اقتباس اول کا یہ مطلب لیا ہے کہ مصنف محرق نے انھیں عبدالصمد کا معشوق کہا ہے اور سوقیانہ الفاظ میں جو جواب دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "المرء یقیس علی نفسہ"۔ دوسرے اقتباسات کے بارے میں وہ ل میں لکھتے ہیں:

"صفحہ ۶۱ میں منشی جی ایسا کچھ لکھتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ ہرمزد وجودِ خارجی نہیں رکھتا تھا کہ ناصبی کے ساتھ مترادف بالمعنیٰ ہو۔ ساسان پنجم کی اولاد میں سے رہنے والا یزد کا.. ہندوستان تشریف لایا اور حضرت غالب سے ملا اور دو برس ان کا مہمان رہا۔ اس کو منشی جی کس دلیل سے جھوٹ کہتے ہیں؟ نجم الدولہ جھوٹ نہ بولیں گے۔"

(۲) ساطع برہان کے مصنف نے عبدالصمد سے متعلق کوئی قابلِ ذکر بات نہیں کہی۔ غالب نے نامۂ غالب ساطع کے جواب میں لکھا ہے، اس میں یہ عبارت ملتی ہے:

---

۲۹ تاریخ عالم آرائے عباسی میں جو مآۃ یازدہم کی تصنیف ہے محمود کا نام محمود اسحق لکھا ہے اور ان تینوں اشعار کو "مولانا میر علی" کی طرف منسوب کیا ہے۔ صـ۱۲۵ اس انتساب کی تصدیق شاہد صادق کے قلمی نسخے سے بھی ہوتی ہے جو کتب خانۂ مشرقیہ پٹنہ میں موجود ہے۔ یہ بھی اسی صدی کی کتاب ہے۔ اس میں یہ بیت زائد ہے:

دبہر تعلیم او دلم خوں شد تا خطش اِفت صورتِ تحریر (بیت ۲)

"احسان مند ہوں کہ آپ نے منشی سعادت علی کی طرح ... مجھ کو معشوق میری استاد کا نہ لکھا۔۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے، مشق کا کمال میں نے اُستاد سے حاصل کیا ہے" (عود ص ۱۹۶)۔

(۳) مؤید برہان کے مصنف نے جابجا ان رایوں سے جو غالب نے عبدالصمد کی طرف منسوب کی ہیں، اختلاف کیا ہے۔ ان کی وہ عبارتیں جن میں سے ایک پشتن سے متعلق ہے، نقل کی جاتی ہیں:

"ہرمزد عبدالصمد راہمہ داں اُستادِ کامل فن برای خود قرار میدہد، چوں تالیفی ازو بدست روزگار نیست و حالش معلوم و مشہور نیست، اگر ہمچناں باشد، گو باش۔ مدعی را چہ فخر است و کدام بزرگی"۔ ص ۴۱۳

"ہیہات غالب بگفتۂ یک کس کہ حال علم و زبانداں نیش جا بجا بر نگرندگان جلی می شدہ است و ایں جا بوجہ احسن جہل مرکبش واضح می شود، از گفتار ہزاراں مردم ثقہ اعراض کرد" ص ۴۴۵

غالب نے تیغ میں اس کا کچھ جواب نہیں دیا، بل کہ پشتن و پشتن کی بحث ہی نہیں چھیڑی۔

(۴) قاطع القاطع کے مصنف کی اصلی غرض غالب کی توہین و تذلیل ہے۔ اس نے کہیں تو یہ لکھا ہے کہ غالب نے اپنے استاد کو بدنام کیا ہے اور کہیں یہ کہ وہ خود کچھ نہ تھا۔ قطع کے دو اقتباسات درج ذیل ہیں:

"ایں ملامت کشِ روزگار استاد خود را چرا شریک حال خود ساخت و برسوائی او پرداخت، مگر بارِ ملامت سنگیں بود، تنہا تاب کشیدنش ندید، ناچار بیچارہ را بامداد طلبید، افسوس صد افسوس اگر چنیں تلمیذ ناہموار نمی بود، آں مرد دانا را بہ نادانی کہ می ستود۔۔" ص ۲۰

"یکی از عوام النّاس را کہ عبدالصمد نام او گرفتہ، پیشوای خود سمردہ است۔۔ قول او راکہ اصلی ندارد، مبثبت مدعای خویش می شمارد" ص ۲۴۹ و ص ۲۵۰

یہ بالکل بدیہی ہے کہ ان چاروں کتابوں کے مصنف اس سوال سے بحث نہیں کرتے کہ عبدالصمد وجود خارجی رکھتا تھا یا نہیں۔ انھیں ان اقوال سے غرض ہے، جو اس کی طرف منسوب کیے گئے ہیں اور یہ ان کے نزدیک عموماً قابل قبول نہیں۔

۴) اس فصل میں غالب کے تلامذہ یا معتقدین کے اقوال کے متعلق عبدالصمد سے بحث ہے:

(۱) حالی کی یادگارِ غالب پہلی مستقل کتاب ہے، جو غالب کے حالات اور کلام پر لکھی گئی ہے۔ حالی معترف ہیں کہ غالب کی زبان سے کبھی کبھی یہ سنا گیا ہے کہ عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے (عبارت فصل ۲ میں دیکھیے)، لیکن اس کے باوجود وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی سیکھی تھی (ی ص ۱۴)۔ حالی نے اس پر بس نہیں کیا، آگے چل کر لکھتے ہیں: "اس کے فیضِ صحبت نے کم سے کم وہ ملکہ ضرور مرزا میں پیدا کر دیا تھا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ اگر حاصل شعور خوانده برابر است و اگر حاصل نشود ہم خوانده و ناخوانده برابر۔۔ اس نے تمام فارسی زبان کے مقدم اصول اور گر اور پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار جن کو فارسی زبان کے سمجھنے میں بہت بڑا دخل ہے اور پارسی و سنسکرت کا متحد الاصل ہونا اور اسی قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کے بوجہ اولیٰ ذہن نشین کر دی تھیں" (ی ص ۱۵ و ۱۶)۔ حالی اس کے بھی مقر ہیں کہ "زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کی بول چال اور ان کی قوتِ متخیلہ پر چڑھ گیا تھا (ی ص ۱۲۰)

یہ بات کہ عبدالصمد وجود خارجی نہ رکھتا تھا ظاہرا حالی نے خود غالب کی زبان سے نہیں سنی، لیکن یہ بات ان پر تمام تھی کہ غالب نے یہ بات کہی ضرور ہے، ورنہ وہ سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ غالب کے متضاد اقوال میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش حالی نے ان الفاظ میں کی ہے:

"جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی اور

کس قدر قلیل مدت اس کی صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اس کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبدء فیض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے" (ی ص۱۵)۔

غالب کا صریح تضاد دور کرنے کی کوشش میں حالی خود تضاد میں مبتلا ہو گئے۔ یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ جس شخص نے غالب کی قوت متخیلہ پر خاص اثر ڈالا، فارسی کے تمام مقدم گر، پارسیوں کے مذہبی اسرار، اور پارسی اور سنسکرت کا متحد الاصل ہونا" اور اس قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کے بوجہ اولیٰ تہ نشیں کر دی تھیں" اس کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہے؟

حالی نے یہ بھی لکھا ہے کہ عبدالصمد" یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی.. مدت تک مرزا کو نہیں بھولا۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہتے تھے کہ ملا کے ایک خط میں جو اس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا یہ فقرہ لکھا تھا" اے عزیز چہ کسی کہ باایں ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطر میگذری" (ی ص۱۶)۔ قابل توجہ باتیں یہ ہیں کہ حالی نہ تو یہ لکھتے ہیں کہ مصطفیٰ خاں خود حالی سے ناقل تھے اور نہ یہ کہ انھوں نے عبدالصمد خط خود دیکھا تھا۔ مصطفیٰ خاں ۱۲۲۳ھ میں پیدا ہوئے ہیں، اور ان کی ملاقات غالب سے ۱۲۵۰ھ سے کچھ قبل ہوئی ہے۔ اگر عبدالصمد اصلی شخص ہوتا تو اس وقت وہ ۹۰ کے لپیٹ میں ہوتا، اور ایک غیر ملک سے اس زمانے میں مراسلت خارج از بحث ہوتی۔

(۲) حکیم غلام رضا خاں دہلی کے نامی حکیموں میں تھے اور اکمل المطابع ان کی ملک تھا۔ عبدالغفور، شہباز مرحوم نے سوانح عمری نظیر میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ "گویا غالب کے متبنیٰ ہیں اور مرزا کے حالات سے بہت واقف" "اردوئے معلیٰ کا حق تصنیف غالب نے " نور چشم اقبال نشاں حکیم (غلام) رضا خاں کو بخش دیا تھا (اردوئے معلیٰ اشاعت اول) اردوئے معلیٰ میں ان کے نام ایک خط بھی ہے جس کی عبارت ذیل دونوں کے تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے:

" نور دیدہ و سرور دل و راحت جاں، اقبال نشاں حکیم غلام رضا خاں کو

غالب نیم جاں کی دُعا پہنچے۔ تم سے رُخصت ہوکر اور تمھیں خدا کو سونپ کر رام پور روانہ ہوا۔ تمھارے باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ اگر بہ مثل میرا کوئی صُلبی بیٹا ایسا ہوتا، جیسے تم ہو تو میں اس کو اپنا فخر و شرف جانتا۔ علم و عقل و خلق و صدق و سداد کے جامع، تورّع و زہد و تقویٰ کے حاوی، علم اخلاق میں حکمائے روحانی نے سعادت کے جو مدارج لکھے ہیں وہ سب تم میں پلئے جاتے ہیں۔

حکیم صاحب شہباز کے استفسار کے جواب میں نہایت غیر مبہم الفاظ میں لکھتے ہیں:
"صحیح امر تو یہ ہے کہ مرزا نے نہ تو فارسی کلام کسی کو دکھایا نہ اردو۔ یہ جو مرزا صاحب.. عبدالصمد کو اپنا اُستاد لکھتے ہیں، اس شخص کا وجود ذہن میں تھا، خارج میں نہ تھا"
سوانح عمری نظیر ص۲۰۰ و ۲۰۱۔ حالی کے متعلق حکیم صاحب کا بیان ہے کہ وہ تو "گاہ گاہ مرزا صاحب کے ہاں آیا کرتے تھے، ان کی نشست وہاں زیادہ نہ تھی" ص۲۰۲۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ حالی کو غالب کے اصلی حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے وہ مواقع نہ تھے جو حکیم صاحب اور دوسرے حاضر باشوں کو تھے۔ اس سے قطع نظر کہ غالب کا کون سا بیان قابلِ قبول ہے یہ متیقّن ہے کہ غالب کے مخصوصین نے خود غالب کی زبان سے سُنا تھا کہ عبدالصمد وجود خارجی نہیں رکھتا۔

۵) اس فصل میں اس سوال سے بحث کی جائے گی کہ عبدالصمد وجود خارجی رکھتا تھا یا نہیں، لیکن یہ واضح رہے کہ اس بحث میں اس کی ذات اس کے صفات سے جُدا نہیں کی جاسکتی۔

(۱) غالب کا دیوان اردو، کلیات نظم فارسی، پنج آہنگ، مہر نیم روز اور دستنبو یہ سب قاطع سے پہلے اشاعت پذیر ہوچکے تھے، ان کی بنا پر غالب کی شاعری اور انشاپردازی کی نسبت رائے قائم کی جاسکتی تھی، لیکن پنج آہنگ میں زبان فارسی سے متعلق جو بحث ہے وہ کسی طرح اس قابل نہ تھی کہ غالب کے محقق فارسی ہونے کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی، اور غالب دُنیا کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ میں نے "فارسی کی تحقیق کو اس پائے پر پہنچایا ہے کہ اس سے بڑھ کر متصوّر نہیں" (از ص۲۰۸)۔ یہی نہیں، ان کی

بلند حوصلگی اس کی بھی روادار نہ تھی کہ تحقیق فارسی کے معاملے میں کوئی دوسرا ہندوستانی اس کا شریک سمجھا جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ غالب زبان و ادب فارسی کے وسیع و غائر مطالعے کے بعد دوسرے فارسی دانوں کی تحقیقات کی خامیاں دکھاتے اور اپنی طرف سے ایسے 'لطائف' و 'غوامض' پیش کرتے کہ لوگ مرعوب ہو کر ان کے دعوی اناو لاغیری کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے، لیکن خشک و بے مزہ کتابوں کے مطالعے میں دن رات ایک کرنا غالب کے بس کا روگ نہ تھا، اور غالب کے لیے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ہندوستان کا تنہا فارسی داں سمجھے جانے کی خواہش کو دل سے نکال دیں۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، غالب نے ایک ایسا فرضی اُستاد گڑھ لیا جو علوم عربیہ و فارسیہ میں یکساں تبحر رکھتا تھا، اور اس تلمذ کو دوسرے فارسی دانانِ ہند پر اپنے تفوق کی وجہ بتایا۔ غالب کی عبارات ذیل ملاحظہ ہوں:

"کسانیکہ بہ فرہنگ نویسی ہمت گماشتہ اند آموزگار در راہ نماند اشتہ اند آئینہ ہر چہ گفتہ اند، نہ گہر سفتہ اند۔ ایں ہوسناکاں کجا و شناختن زبانِ پاکاں کجا!" (اص۶) "ہستی بخش راسپاس کہ نیز وفرای دانش من دانشمند یست کہ اگر چنانکہ راز داں بود، راز گوے نیز بودے، ششمیں ساساں بشمار آمدے" (اص۷)

"فرہنگ لکھنے والے جتنے گزرے ہیں سب ہندی نژاد ہیں، علم صرف و نحو عربی میں بہ قدر تحصیل مسلّم اور اُستاد ہیں۔ علم صرف و نحو کی کتب درسی موجود ہیں، جس نے چاہا ہے اُس نے اُستاد سے ان کتب کو پڑھ لیا ہے۔ فارسی کی جو فرہنگیں حضرات نے لکھی ہیں؛ مطالب مندرجہ کس اصول پر منضبط کیے ہیں اور اس کا علم کس استاد سے حاصل کیا ہے؟ آخر مقاصد صرف و نحو عربی بھی تو صرف مطالعۂ کتب سے نہیں نکالے ہیں۔ پہلے تعلیم ہے، پھر کتب قواعد کے جابجا حوالے ہیں۔ قواعد فارسی رسالہ اہلِ زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضل عجم سے پڑھا ہے... فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے، مشق کا کمال میں نے اُستاد سے حاصل کیا ہے" (نامۂ غالب عود ص۱۸۵-۱۸۶)

قاطع میں جس مقام پر غالب نے علم یکتائی بلند کیا ہے اور اپنے سوا ہندوستان کے کُل فارسی دانوں کو غیر مستند قرار دیا ہے، وجہ استثنا میں سے ایک عبدالصمد سے استفادہ ہے، اور اپنی بعد کی تحریروں میں انھوں نے سنب[۳۰] سے زیادہ اس پر زور دیا ہے۔ فرضی استاد گڑھ لینے میں یہ خطرہ ضرور تھا کہ غالب کا کوئی ہم عمر جو ۱۲۲۶ھ میں آگرہ میں تھا، ان کی تردید کردے، مگر اسے انھوں نے نظرانداز کیا۔ یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں کوئی یہ نہ کہے کہ 'واہ مرزا صاحب، اس وقت تک تو آپ یہ کہتے رہے کہ میں مبدا فیّاض کے سوا کسی کا شاگرد نہیں، اب یہ عبدالصّمد کہاں سے ٹپک پڑا ہے'، مگر ایک تو کچھ ضرور نہیں کہ غالب کو یہ یاد ہو کہ وہ پہلے کیا کہہ چکے ہیں، دوسرے یہ کہ وہ جانتے تھے کہ تاویل میں بڑی گنجائش ہے۔ یہ خیال کہ لوگ عبدالصّمد کے علم و فضل ہی سے انکار کردیں گے اور نے تامّل ان اقوال کی جو غالب نے اس کی طرف منسوب کیے ہیں، تردید کریں گے غالباً غالب کے ذہن میں نہ آیا۔ غالب کو ایک سہارے کی ضرورت تھی اور اس کے احساس نے انھیں عبدالصمد کی تخلیق پر مجبور کیا۔ علمی تحقیقات شاعری نہیں کہ غالب یہ دعویٰ کرسکیں کہ

"آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے"

تحقیقات میں غالب کے لیے عبدالصمد وہی ہے جو 'غیب' شاعری میں ہے۔

(۲) غالب کے سوا دنیا کا کوئی شخص عبدالصمد سے ذاتی واقفیت کا مدّعی نہیں، نہ اس کی کوئی تحریر موجود ہے اور نہ کسی نے اس کی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ رہے غالب تو وہ

---

[۳۰] "احراز دولت دیدار تیمار ہر مزد۔ فراواں کمال و دانش اندوختن از وے تا دو سال" (ص ۱۳۱)۔ غالب کے ترکش میں اور تیر بھی تھے، مثلاً سلامت طبع جو غلطی کو قبول ہی نہیں کرتی، کلام اساتذہ کا مطالعہ، فارسی مناسبت، مگر جب اعتراضات کی بوچھار شروع ہوئی تو جس سے کام لیا وہ عبدالصّمد کا تلمذ ہی تھا۔

جس قدر صادق القول تھے اس کا اندازہ رادرحِ کی فصل آخر کے مطالعے سے ہو سکتا ہے، اس سے قطع نظر خود غالب کے اقوال میں تضاد ہے جو حالی کی کوشش کے باوجود دور نہ ہو سکا۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ عبد الصمد سے استفادے کے اعلان کے بعد ایسے اصحاب کے سامنے جو لائل و اسناد کے طالب تھے، خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن، وہ عبد الصمد کے وجود خارجی پر اصرار کیا کرتے تھے، لیکن اپنے خاص معتقدین کے حلقے میں انھیں سچی بات کہنے میں بھی تامل نہ ہوتا تھا، اور حق یہ ہے کہ مبدءِ فیاض کی شاگردی میں جو شان ہے وہ عبد الصمد سے استفادے میں نہیں۔ ایک فن کار کی حیثیت سے اگر غالب محرمانِ راز سے عبد الصمد کی آفرینش کی داد بھی چاہتے ہوں تو عجب نہیں۔

(۳) عبد الصمد اگر وجود خارجی رکھتا اور غالب اس کے شاگرد ہوتے تو اس سے کچھ نتائج مترتب ہوتے، مگر یہ مفقود ہیں۔ اس کا مجموعی اثر اس عقیدے کے لئے کہ عبد الصمد ایک فرضی شخص نہ تھا نہایت تباہ کُن ہے:

(الف) غالب کے زمانے سے پہلے ہی جلال اسیر و شوکت وغیرہ کی طرز متروک تھی، اور عبد الصمد کا ذوق شاعری وہی ہونا چاہئے جو اس کے ایرانی ہم عصروں کا تھا، لیکن غالب کی ابتدائی شاعری جو عبد الصمد سے متاثر ہونی چاہئے، سراسر متروک طرز میں ہے۔ غالب خود معترف ہیں کہ اوائل میں انھوں نے بیدل کی طرز میں شعر کہے۔ بیدل جہاں تک پیچیدگی کا تعلق ہے، اسیر و شوکت کے ہم نوا تھے۔

(ب) غالب اور ان کے کسی ایرانی معاصر مثلاً یغما کی نظم و نثر کا مقابلہ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ غالب کی یہاں اپنے عہد کے مخصوص ایرانی محاورے اور روزمرے اس قدر کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ابتدا ہی میں کسی ایرانی کی صحبت میسّر ہوئی ہوتی، تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔

(ج) غالب مدعی ہیں کہ دساتیر سے ان کی واقفیت قدیم ہے، اور ان سے اس کی زبان کے بارے میں عبد الصمد سے گفتگو ہوئی تھی، لیکن ان کی ابتدائی نظم و نثر میں نہ دساتیر کے خاص الفاظ ملتے ہیں اور نہ اس میں اس کا ذکر آیا ہے۔ ۱۲۵۶ھ

کے لگ بھگ سراج الدین احمد نے غالب سے کسی کتاب کا نام دریافت کیا ہے، جس سے قدیم ایرانیوں کی زبان اور مذہب کا حال معلوم ہو سکے۔ یہ موقع سے اپنی واقفیت کے اظہار کا تھا، لیکن اپنے جواب میں وہ صرف دبستانِ مذاہب کا نام لیتے ہیں، گو وہ خود اس سے مطمئن نہیں (کلیاتِ نثر طبع ا ص ۲۷۱)

(د) سراج الدین احمد کے جواب میں غالب وہ باتیں لکھ سکتے تھے جو ان کے قول کے بہ موجب انھیں عبدالصمد سے معلوم ہوئی تھیں اور جو قاطع میں مندرج ہیں، لیکن وہ ان کی طرف اشارہ بھی نہیں کرتے اور قدیم ایرانیوں کے حالات کی تلاش کو بے سود قرار دیتے ہیں: "اکنوں کیست تا بداں زبان کہن سخن درست تواند گفت واز آں دیریں آئین بہ راستی خبر تواند داد؟ پژ دہندۂ ایں راز را کام دل برنیاید"۔

(ک) کلکتہ میں غالب پر قتیل کے اصلی یا فرضی اقوال کی بنا پر اعتراض ہوئے تھے۔ بادِ مخالف غالب نے ان اصحاب کی دل جوئی کے لئے لکھی تھی جو ان سے یہ سمجھ کر ناراض تھے کہ انھوں نے قتیل کو سخت وسست کہا ہے۔ اس مثنوی میں قتیل کی مبالغہ آمیز مدح تو کی ہے، لیکن ان کے ہندوستانی ہونے کی وجہ سے انھیں مستند ماننے سے انکار کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان ایرانی شعرا کے نام بھی لئے ہیں جن کے تتبع پر انھیں ناز ہے۔ مقتضائے مقام تھا کہ عبدالصمد سے فیض یابی کا بھی ذکر کیا جاتا لیکن، کنایۃً بھی اس کی طرف اشارہ نہیں۔ خاتمۂ کلیاتِ نظم فارسی میں بھی عبدالصمد کا ذکر بے محل نہ ہوتا، لیکن، وہ بھی اس سے خالی ہے، اور یہی حال غالب کی ان تمام تحریروں کا ہے جو قاطع سے قبل کی ہیں۔

(و) یہی نہیں کہ غالب کی مذکورۂ بالا تحریروں میں عبدالصمد کا ذکر نہیں، موقع آیا ہے تو انھوں نے صراحۃً لکھا ہے کہ میں کسی کا شاگرد نہیں۔ سراج الدین احمد کے نام کے اس خط میں جس کا حوالہ اوپر آ چکا ہے، غالب نے قاضی محمد صادق خاں اختر کے تذکرے کے لئے اپنا ترجمہ سپردِ قلم کیا، اس میں یہ عبارت بھی ہے:

"در سخن از پرورش یافتگان مبدء فیاضم و سواد معنی را بہ فروغ گوہر خویش روشن کردہ ام، از ہیچ آفریدہ حق آموزگاریم بگردن نیست و بار رہنمائیم بردوش نیست۔"

بعض اصحاب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ غالب نے شاعری میں کسی کی شاگردی سے انکار کیا ہے، اس سے جہاں تک فارسی سیکھنے کا تعلق ہے، عبدالصمد کے تلمذ کا انکار لازم نہیں آتا، مگر غالب نے صریحاً لکھا ہے کہ میں نے "آئین معنیٰ آفرینی" عبدالصمد سے سیکھی (تمہید دیکھئے)، اور حالی بھی اس کے قائل ہیں کہ غالب کی ابتدائی شاعری عبدالصمد سے متاثر ہے۔ غالب نے قاطع کی تصنیف سے پہلے ظاہراً کسی سے زبانی بھی عبدالصمدؔ کے ہندوستان آنے اور اس سے مستفید ہونے کا ذکر نہیں، ورنہ یہ بات ان اصحاب کو جنھوں نے ان کا حال اس سے پہلے لکھا ہے ضرور معلوم ہوتی ہے۔ ذکا، سرور، شیفتہ، کریم الدین، صابر، باطن، محسن، سیّد احمد خاں کی کتابوں میں عبدالصمد اور اس سے تلمذ کا کنایۃً بھی مذکور نہیں۔ بعد کے مصنفین اگر اس کا ذکر کرتے ہیں تو اس لئے کہ قاطع ان کی نظر سے گزر چکی ہے۔

یہ امور صرف ایک نتیجے کی طرف لے جاتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ عبدالصمد غالب کے بحرِ تخیل کی ایک موج سے زیادہ نہیں۔

خاتمہ: عبدالصمد جو غالب کا زائیدۂ طبع ہے بہت سی باتوں میں اپنے آفریدگار سے مشابہ ہے: غالب افراسیابی ہیں تو عبدالصمد دارابی[۳۱]، غالب دہلی کے رئیس زادے ہیں تو وہ یزد کا امیر زادہ۔ تصوف سے دونوں کو لگاؤ ہے اور توحید وجودی کے دونوں قائل ہیں۔ معلمی کسی کا پیشہ نہیں، لیکن جوہر قابل ملے تو اس کی تربیت کے لئے دونوں آمادہ ہیں۔ منطق و فلسفہ اور علوم عربیہ میں عبدالصمد کا تبحر اسی غالب سے

---

[۳۱] غالب نے عبدالصمد کا سلسلۂ نسب ساسان پنجم (دساتیر کے خیالی مترجم و مفسر) سے ملایا ہے، اس کی موزونی میں کلام نہیں۔

ممیز کرتا ہے۔ یہ وہ علوم ہیں جن سے اپنی ناواقفیت کا احساس غالب کو بہ شدت تھا، یہ کمی عبدالصمد میں پوری ہوئی۔ ایک بات میں غالب کو بھی عبدالصمد پر فوقیت ہے، عبدالصمد' رازداں، تو ہے مگر 'رازگوئی' کا شوق نہیں رکھتا، غالب میں دونوں باتیں جمع ہیں۔ اسی لیے غالب نے ساسان ششم کا لقب اپنے لیے محفوظ رکھا۔ دستنبو کی آخری رُباعی کا آخری مصرع ہے: ساسان ششم بکاردانی مائیم۔

عبدالصمد کے وجود خارجی کا تسلیم کرانا آسان نہ تھا، سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ ایران قدیم سے متعلق غالب کے معلومات بہت قلیل تھے، اور جو کچھ تھے وہ بھی بہت کچھ غلط۔ وہ کسی طرح ایک ایسی ہستی کے خالق نہیں ہو سکتے تھے جس کے معلومات ان سے وسیع تر اور صحیح تر ہوں۔ ان اصحاب کے لیے جو قدیم ایرانی زبانوں اور زردشتی مذہب سے کسی حد تک بھی باخبر ہیں، ایک ایسے زردشتی عالم کے وجود کا قائل ہونا جو پشتن کی جگہ پشتن کو صحیح سمجھتا اور چینود کو مستحدث مانتا ہو ممکن نہیں۔ اس سے قطع نظر کرلی جائے تو غالب نے بعض باتیں جو عبدالصمد کے بارے میں لکھی ہیں، ان سے فن کارانہ سلیقہ ظاہر ہوتا ہے اور جن کی داد انھیں ملنی چاہیے، مثلاً:

"رہے صمد کے معنی، جب مولانا عبدالصمد قدس سرہٗ نے . . . ارژند کے وہ معنی شرح کیے کہ جس کا ترجمہ ہندی میں ٹھوس . . . ہے اور بتایا . . . کہ عربی میں ان معنوں میں لفظ صمد ہے کہ ایک اسم اسمائے الٰہی میں سے بھی ہے . . . قصہ مختصر بعد ایک مدت کے جب میں دلی آرہا اور مولوی فضل حق مغفور سے بعد ملاقات ربط بڑھا، ایک روز بحسب اتفاق ہرمزد کا ذکر درمیان آگیا اور اس کے ذکر کرنے کی

---

۳۲ غالب کو اس خیال سے تقویت ملتی ہوگی کہ اگر میں ایران قدیم سے میں زیادہ واقف نہیں، تو قاطع برہان کے پڑھنے والے کسی طرح مجھ سے بہتر نہیں۔ غالب کے زمانے سے قطع نظر، اس زمانے میں بھی غالب سے دلچسپی رکھنے والوں میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ایران قدیم سے واقف ہوں اور اس وجہ سے عبدالصمد کے وجود خارجی کو تسلیم کرنے میں انھیں چنداں قباحت نظر نہیں آتی۔

تقریب معنی صمد اور اروند کے اتحاد کی شرح۔ چوں کہ حضرت کو مذہب اسلام میں تعصب بہت تھا ایسا کہ اسی فرط تعصب میں جان دی، اروند کے لفظ کو برا بھلا کہہ کر فرمانے لگے صمد اسم صفت ہے، معنی اس کے نہ چیزی از وی بروں رود و نہ چیزی بہ دروں آید نہ زیادہ شود و نہ کم گردد۔ یہ چاروں فقرے اس مرحوم کی زبانی ہیں۔ الغرض مجھ کو تواب میں کوئی تردد نہ رہا۔ بہ اعتبار فارسیت ہرمزد مالک زبان، بہ اعتبار عربیت دونوں فاضل۔" (تیغ ص۱۳ و ۱۴)

حالی نے لکھا ہے کہ مرنے سے چند روز پہلے غالب نے ایک اردو قصہ لکھنا شروع کیا تھا (ی ص۱۸۹) بڑا افسوس ہے کہ وہ تمام نہ ہو سکا۔

[۲۸/ ۱۱/ ۵۱]

استدراک

مقالہ ہٰذا کا مسودہ علی گڑھ بھیجے جانے کے کئی مہینے بعد جناب مالک رام کا ایک مضمون نوائے ادب (بابت جنوری ۱۹۵۲ء) میں شائع ہوا۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ میری یہ رائے کہ عبدالصمد وجود خارجی نہیں رکھتا تھا، صحیح نہیں۔ ممکن ہے کہ میں ایک مستقل مضمون اس کے جواب میں لکھوں، اس موقع پر اس سے مفصل بحث ممکن نہیں، چند مجمل اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے:

(الف) مضمون نگار نے میری تمام دلائل کی طرف توجہ نہیں کی، صرف اُن دلائل سے بحث کی ہے جو ان کے نزدیک زیادہ اہم اور قابل غور ہیں" ص۶۷

(ب) میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ میری ہر دلیل دوسری دلائل کی اعانت کے بغیر میرے دعوے کو ثابت کر سکتی ہے، مضمون نگار کے مخوائے کلام سے اس کے خلاف مترشح ہوتا ہے۔

(ج) ن (= نوائے ادب) کی بعض بحثیں بہت سرسری ہیں، میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ غالب نے ایران قدیم سے متعلق جو باتیں عبدالصمد کے حوالے سے لکھی ہیں، وہ ایسی لغو اور بے بنیاد

ہیں کہ کسی ایسے شخص کی طرف جو خود زردشتی رہ چکا ہو اور زردشتیوں کے مذہبی خیالات و اسرار اور پارسی و سنسکرت متحد الاصل ہونے سے واقف ہو، منسوب نہیں کی جا سکتیں، ان میں اس کے جواب میں یہ عبارت ملتی ہے:

"اگر انھوں نے (غالب نے) قاطع برہان میں ملا عبدالصمد کے حوالے سے بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جو غلط ہیں، تو ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ استاد نے شاگرد کو جو کچھ بتایا وہ غلط تھا اور شاگرد کو اس کا علم نہیں تھا کہ یہ بات غلط ہے ورنہ وہ کیوں .. اپنی اور اپنے استاد کی رسوائی کا سامان مہیا کرتا، لیکن اس سے .. یہ کیسے ثابت کر سکتے ہیں کہ سرے سے استاد کا وجود ہی نہیں تھا .. ؟" ص۲۸

میں مقالہ ہذا کی فصل ۷ میں لکھ چکا ہوں کہ یہ بحث کہ عبدالصمد وجود خارجی رکھتا تھا یا نہیں اس کے صفات سے جدا نہیں کی جا سکتی۔ اس سلسلے میں یہ بتا دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ خود مضمون نگار نے ذکر غالب میں عبدالصمد کے بارے میں کیا لکھا ہے:

"اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ زردشتی مذہب کے موبد تھے اور زردشتیوں کا تمام مذہبی سرمایہ قدیم پارسی میں ہے، اس لیے ان کا فارسی زبان کا فاضل ہونا چنداں تعجب کا مقام نہیں، اس کے علاوہ عربی کے بھی عالم تھے اور انھوں نے سالہا سال علمائے عرب و بغداد سے علوم عربیہ حاصل کیے تھے .. میرزا کی فارسی دانی کا سنگ بنیاد مولوی محمد معظم کے ہاتھوں رکھا گیا تھا، لیکن اس عمارت کی تکمیل ملا عبدالصمد کے چابک دست اور ماہر ہاتھوں سے ایسے شاندار طریقے پر ہوئی کہ وہ آسمان سے باتیں کرنے لگی" ص۲۵

(د) مضمون نگار ۱۰ میں رقم طراز ہیں: "یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھوں نے قاطع .. میں ملا .. کا نام اس لیے لکھا تھا کہ اس طرح مخالفوں کا منہ بند کر سکیں۔ یہ اعتراض کرتے وقت یہ .. فرض کر لیا گیا ہے کہ میرزا پہلے سے جانتے تھے کہ لوگ قاطع برہان کی مخالفت کریں گے، حال آں کہ اس مفروضے کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ غالب نے سوچ سمجھ کر ایک لمبی اسکیم تیار کی تھی یعنی پہلے برہان .. پر اعتراض لکھے، پھر انھیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا، پھر یوں کہ وہ جانتے تھے کہ دنیا اس کی مخالفت کرے گی، اس لیے انھوں نے اپنے دماغ سے ایک شخص .. پیدا کیا اور تمام اعتراض اس کے نام لکھ دیے، تاکہ لوگ .. مرعوب ہو کر ان کے بجائے ملا .. کی طرف متوجہ ہو جائیں کیسا

غالب کی شخصیت اور زندگی سے متعلق جو کچھ ہمیں معلوم ہے اس میں کوئی ایسی بات ہے جس میں ان کے سازشی کردار کی طرف اشارہ ہو جس سے پایا جائے کہ وہ پہلے سے اتنی لمبی سازش سوچنے اور اسے معرض عمل میں لانے کی صلاحیت رکھتے تھے؟ . . کسی . . تحریر کو کسی دوسرے کے نام سے چھاپ دینا بالکل الگ بات ہے یہ ان کے پیشے سے متعلق ہے۔ وہ کسی خاص شخص کو اس درجے کا نہیں خیال کرتے تھے کہ . . خود اس سے مخاطب ہوں . . " صلے

اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ اعتراضات کی اشاعت سے قبل غالب یہ سمجھ سکتے تھے یا نہیں، کہ لوگ قاطع برہان کی مخالفت کریں گے۔ قاطع کے انطباع سے پہلے غالب نے قاطع کے متعلق ایک خط میں جو کچھ لکھا تھا اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

"جو صاحب اس کو دیکھیں گے وہ ہرگز نہ سمجھیں گے صرف برہان . . کے نام پر جان دیں گے۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی وہ اس کو مانے گا . . نہ یہ . . کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا" (اردوئے معلیٰ ص۳۹۶)۔

غالب اس سے اچھی طرح واقف تھے کہ ہندی فارسی داں برہان کی تحقیقات کے معترف ہیں اور قاطع میں انھوں نے صرف برہان پر اعتراضات پر قناعت نہ کی تھی، اپنے سوا کل ہندی فارسی دانوں کو نامستند قرار دیا تھا اور آرزو، وارستہ، بہار، قتیل اور صہبائی کو نشانۂ تعریض بنایا تھا۔ اس صورت میں یہ سمجھنا کہ کتاب کی مخالفت نہ ہوگی، انتہائی درجے کی سادہ لوحی ہوتی۔ سازش کا انگریزی مرادف 'کونسپریسی' ہے اور اس کے لیے کم از کم دو آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ عبدالصمد کی تخلیق میں کوئی دوسرا شریک نہیں؛ اس لیے اسے سازش نہیں کہہ سکتے۔ لطائف غیبی کی سیاح کے نام سے اشاعت البتہ سازش ہے، سیاح کی رضامندی کے بغیر اس کتاب کا ان کی طرف انتساب ممکن نہ تھا۔ مضمون نگار نے غالب کے اس فعل کو کہ خود کتاب لکھی اور اپنے ایک شاگرد کی طرف منسوب کی، اخلاقی نقطۂ نظر سے ناقابلِ اعتراض قرار دیا ہے؛ لیکن، یہ محض علمی کتاب نہیں، اس میں انھوں نے اپنے فریق کو فحش گالیاں دی ہیں اور اپنی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ اور اس صورت میں اس کا کسی دوسرے کی طرف انتساب اخلاقی حیثیت سے یقیناً مذموم ہے۔ مضمون نگار کو چاہیے تھا کہ میں نے غالب کی راست گفتاری میں جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے، پہلے ان کی تردید

کرتے۔ عبدالصمد کی تخلیق کا جو اخلاقی پہلو ہے، اس کی طرف بعد کو متوجہ ہوتے۔ طرّہ یہ کہ وہ خود اس کے قائل ہیں کہ بعض مواقع پر غالب نے قسم کھانے کے باوجود غلط گوئی سے کام لیا ہے، مگر وہ اسے غلط گوئی نہیں، "شاعرانہ مبالغہ" کہتے ہیں:

"اس سے قطعی ثابت۔۔ ہے کہ واقعی نواب۔۔ بھی کوشش کر رہے تھے اور میرزا نے یوسف مرزا کو جب یہ لکھا کہ "والی رام پور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں، یہ کام خداساز ہے بہ علی ابن ابی طالب۔۔" تو یہ بھی شاعرانہ مبالغہ تھا"، ذکر غالب ص۹۵۔

(ک) مضمون نگار کی رائے ہے کہ حالی کی عبارت ذیل سے "قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عبدالصمد واقعی ایک تاریخی شخصیت ہے":

"نواب۔۔ شیفتہ۔۔ کہتے تھے کہ ملّا کے ایک خط سے جو اس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا یہ فقرہ لکھا تھا' اے عزیز چہ کسی کہ با ایں ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطر می رسی' (کذا)

مضمون نگار کے نزدیک اس عبارت سے یہ نتائج نکلتے ہیں: ا۔ حالی نے یہ روایت خود شیفتہ سے سنی تھی، ب۔ شیفتہ نے عبدالصمد کا خط خود دیکھا تھا۔ ج۔ خط کے وجود سے ملّا کی "تاریخی شخصیت ہونے" کا ثبوت ملتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اگر وہ یہ بھی لکھ دیتے کہ حالی و شیفتہ نے عبدالصمد سے ملاقات بھی کی تھی، تو میں ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتا۔

(ل) مضمون نگار کا قول ہے: "بے شک مولانا حالی فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی میرزا کی زبان سے یہ سنا گیا ہے کہ چوں کہ لوگ مجھ کو بے اُستادا کہتے تھے۔۔ میں نے ایک فرضی اُستاد گڑھ لیا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ یہ بھی کہتے ہیں: عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی سیکھی تھی۔۔ جب تک حالی نے اور ذرائع سے اپنے بیان کی درستی کے لیے کافی ثبوت فراہم نہیں کر لیا ہوگا وہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ غالب نے جو کچھ کہا وہ اپنی جگہ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس نام کے ایک شخص سے انھوں نے فارسی ضرور پڑھی تھی" ص۲۰۔

حالی نے حیات جاوید میں اعتراف کیا ہے کہ اس کتاب سے قبل اس فن کی جو کتابیں میری قلم سے نکلی ہیں، ان میں تصویر کا صرف ایک رُخ دکھایا گیا ہے (تمہید)، اس صورت میں ظاہر ہے کہ

حقیقت سے انحراف ناگزیر ہے۔ اس سے قطع نظر، تحقیق ان کا مطمح نظر ہی نہیں، وہ لوگوں کو غالب کی عظمت کا معترف بنانا چاہتے ہیں اور بس۔ حالی نے اگر اور ذرائع سے اس کی تصدیق کی ہوتی کہ عبدالصمد ایک حقیقی شخص تھا تو اس کے اظہار میں کون سی بات مانع تھی؟ جیسا کہ میں مقالۂ ہذا میں لکھ چکا ہوں وہ شیفتہ کے قول کو ضرورت سے زیادہ اہم سمجھتے تھے، اور ظاہر اکسی اور ذریعے سے انھیں اس کا علم نہ ہوا تھا کہ عبدالصمد وجود خارجی رکھتا تھا۔

مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ حالی نے یہ بات کہ "میں نے ایک فرضی اُستاد گڑھ لیا ہے" خود غالب کی زبان سے سُنی تھی۔ ایسا ہوتا تو وہ یہ نہ لکھتے کہ "کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ سُنا گیا ہے"

اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ آخر حالی نے جو تصویر کا صرف ایک رُخ ہی دکھانے پر قانع تھے، اس بات کا ذکر ہی کیوں کیا۔ اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ انھیں متعدد اصحاب سے جنھیں غالب کا محرم راز کہا جا سکتا ہے یہ معلوم ہوا تھا کہ خود غالب نے کی صحبتوں میں عبدالصمد کو ایک فرضی شخص کہا کرتے تھے اور یہ اصحاب بھی یہی سمجھتے تھے۔ حالی کے لیے جو غالب کو دنیا کے سامنے ایک انتہائی درجے کے راست گفتار شخص کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے تھے، اسے نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا؛ انھوں نے غالب کے دو اقوال میں مطابقت پیدا کرنا ضروری خیال کیا، یہ دوسری بات ہے کہ اس کوشش میں انھیں کامیابی نہ ہو سکی۔

(س) غالب نے لکھا تھا: "از آخریدۂ حق آموزگاریم بہ گردن و بارِ منت رہ نمائیم بر دوش نیست" میں نے دکھایا تھا کہ اس قول سے غالب کے اس دعوے کی کہ انھوں نے "آئین معنی آفرینی" عبدالصمد سے سیکھا تھا، تردید ہوتی ہے، مضمون نگار کو اس سے اختلاف ہے، وہ فرماتے ہیں: "غالب نے لکھ دیا کہ اس بارے میں کسی کا بار احساں میرے کندھوں پر نہیں اور ۔ ۔ ۔ یہ امر واقع ہے لیکن جب انھوں نے قاطع برہان تالیف کی تو اب موضوع کلام بدل گیا تھا۔ اب شعر و سخن اور عروض کی تعلیم یا شعروں کی اصلاح لینے کا سوال نہیں تھا بلکہ یہاں گفتگو زبان اور الفاظ کی تحقیق اور معانی و بیان سے متعلق تھی، یہی وجہ تھی کہ جب قاطع برہان میں انھوں نے بعض ایسی باتیں لکھیں جو ان کے خیال میں نئی تھیں تو انھوں نے لکھ دیا؛ مجھے اپنے اُستاد ملا عبدالصمد سے معلوم ہوئی تھیں"

"آئین معنی آفرینی" سیکھنے سے شعر و سخن اور عروض کی تعلیم یا شعروں کی اصلاح نہیں بل کہ زبان و الفاظ اور معانی و بیان کی تحقیق مراد ہے۔ نامۂ غالب میں غالب نے ہندوستانی فارسی گویوں

کی تنقیص کے بعد جو یہ لکھا ہے کہ "مشق کا کمال بیں نے اُستاد سے حاصل کیا ہے" (عود: ۴۴ اشاعت اوّل)
اس سے بھی مضمون نگار کے نزدیک زبان و الفاظ اور معانی و بیان کی تحقیق ہی مراد ہوگی۔ مجھے اس سے
شدید اختلاف ہے۔

(ح) مضمون نگار کی رائے میں میں نے یہ کہہ کر کہ حکیم غلام رضا خاں خود غالب کی زبان سے
عبدالصمد کا فرضی نام ہونا سنا ہوگا" "آپ ہی اپنی دلیل کمزور کر دی ہے" ص۲۲۔

بات یہ ہے کہ وہ میرے مطمحِ نظر اور طریقِ کار سے واقف نہیں، حکیم صاحب نے جب خود صراحتہً
یہ نہیں لکھا کہ میں نے خود غالب کی زبان سے سنا ہے، تو میں ان کے حوالے سے یہ کس طرح لکھ دیتا۔ قیاس اور
چیز ہے روایت اور چیز ہے، اور دونوں میں فرق کرنا لازم ہے۔ مضمون نگار کو اس کی بھی کوئی وجہ نظر
نہیں آتی کہ حکیم صاحب کے بیان کو حالی کے بیان پر ترجیح دی جائے۔ میں مقالۂ ہذا میں اس سے بحث
کر چکا ہوں۔ ؎۱

(ط) مضمون نگار فرماتے ہیں: "جو میرزا کی اُفتادِ طبع سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ انہیں
خلافِ واقع باتیں بنانے میں اور لطیفے چھانٹنے میں لطف آتا ہے۔۔ انھوں نے بے تکلف دوستوں کے حلقے
میں یہ چھینٹا اڑایا کہ اجی کون شاگرد اور کہاں کا اُستاد۔ وہ لوگ مجھے بے اُستادا ہونے کا طعنہ
دیتے تھے میں نے ان کے لیے ایک اُستاد پیدا کر لیا، تو جاننے والے اسے بھی ان کے دوسرے لطیفوں سے
زیادہ وقعت نہیں دیتے ہوں گے۔۔ اس سے ان کی راست گفتاری پر کوئی حرف نہیں آتا" ص۲۳۔

حکیم غلام رضا خاں نے غالب کی زندگی میں (میرے قیاس کے مطابق، جس سے مضمون نگار کو
اختلاف نہیں) غالب کی زبانی یہ بات سنی کہ عبدالصمد ایک فرضی شخص ہے، اور عمر بھر اسے باور کرتے رہے؛

؎۱ مضمون نگار نے اپنے مضمون کی ابتدا اس عبارت سے کی ہے:

"یوں معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی زندگی میں بھی بعض لوگوں نے ملا عبدالصمد کی ہستی سے متعلق
شک و شبہہ کا اظہار کیا تھا لیکن بعد میں اگر سب نہیں تو ان میں سے اکثر غالباً مطمئن ہو گئے تھے"
مجھے ایسے کسی ایک شخص کا بھی علم نہیں جس نے پہلے شبہہ اور بعد ازاں اپنے اطمینان کا
اظہار کیا ہو۔

لیکن مضمون نگار کے نزدیک غالب کے ہم صحبتوں کو کبھی اس کے متعلق غلط فہمی نہیں ہوئی اور وہ اسے محض ایک لطیفہ سمجھتے رہے!

یہ کہنا کہ عبدالصمد ایک فرضی شخص ہے ظرافت نہیں، لیکن اگر عبدالصمد کے معاملے کو غالب کی شوخی طبع کا نمونہ قرار دینے پر اصرار ہی ہے، تو میں یہ کہوں گا کہ ظرافت عبدالصمد کی تخلیق میں ہے، اور غالب کے تیر ظرافت کی آماجگاہ وہ اصحاب ہیں جو اس کے وجود خارجی کے قائل ہیں۔

تصحیح واضافہ:

(۱) فصل ۱:۔ صفحہ سطر ۱۲ "اور نہ بندہ بھی لکھا کرتا تھا" یہ درفش کاویانی ص۱۵ میں ہے۔

فصل ۲: صفحہ سطر ۱۲ "پہلوی میں بھی اشعار ہیں" سبک شناسی جلد ۱ ص۱۰۶

خاتمہ: صفحہ سطر ۱۹ غالب معلم پیشہ لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے" ان کے ذہن میں یہ بات کبھی نہ آئی ہوگی کہ عبدالصمد کو اس گروہ میں شامل کرلیں، لیکن انھوں نے صراحتہً یہ نہیں لکھا کہ وہ معلم پیشہ نہ تھا۔ سطر ۱۹ کی عبارت ترمیم طلب ہے۔

(۲) حواشی

حاشیہ ۱۹: نا محتاط مصنف بالارادہ یا بلا ارادہ ایسی باتیں بڑھا دیا کرتے ہیں جن کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ہوتا، اس کی ایک مثال جناب مالک رام کی یہ عبارت ہے جو ذکر غالب (اشاعت ۲) ص۲۵ میں ہے:

"عبدالصمد .. اسلام قبول کرنے سے پہلے .. زردشتی مذہب کے مؤبد (کذا) تھے"

حاشیہ ۲۲: محشی قاموس نے صرف فاریابی لکھا ہے، مگر یہ لفظ تنہا آتا ہے تو ابو نصر فاریابی ہی سے مراد ہوتی ہے۔

حاشیہ ۲۳: "مع فصل ... جائے" کی جگہ عبارت ذیل ہونی چاہیے: ذال فارسی کی مفصل بحث کے لیے راقم کا مقالہ "غالب اور ذال فارسی" (آجکل فروری ۱۹۵۲ء) دیکھا جائے اس میں سعدی کے اس شعر کا ذکر ہے جس میں عدل، فصل کا قافیہ آیا ہے اور اوحدی کی جام جم کے

اس شعر کا بھی جس میں فیض، غیظ کا قافیہ بندھا ہے۔

حاشیہ ع ۲۷: رومی کا شعر مثنوی (اشاعت نکلسن جلد ا ص۱) میں ہے۔

[۱۰/۶/۵۲]

حمید احمد خاں

امراؤ بیگم

بڑے آدمیوں کے سوانح نگار جب بہ اندازِ تعظیم اُن کی داستانِ حیات لکھنے بیٹھتے ہیں تو اُن کی بیویوں سے بارہا بے انصافی کر جاتے ہیں۔ اس بے انصافی کے اسباب بالکل قدرتی ہیں۔ کتابوں میں جس تکرار و توضیح سے بڑے آدمیوں کے اقوال بیان ہوتے ہیں، وہ اُن کی بیویوں کے نقطۂ نظر کو نصیب نہیں ہوتی۔ سقراط، سعدی اور شکسپیئر اپنی بیویوں سے کچھ ایسے خوش نہ تھے۔ بلاشبہ ان مشاہیر کی سوانح عمریوں میں اس معاملے کا ذکر ضروری ہے۔ لیکن اسی کے برابر اہمیت اس دوسرے سوال کو بھی ملنی چاہیے کہ خود اُن کی بیویوں کی رائے، اپنے نامور شوہروں کے متعلق کیا تھی۔ پھر یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بڑے آدمی کی عظمت کے حق میں تاریخ کئی مرتبہ ذرا دیر سے فیصلہ کرتی ہے۔ سوانح نگار قدرتاً تاریخ کے اس فیصلے سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ بڑے آدمی کے متعلقین کو اس فیصلہ سے متاثر ہونے کا موقع نہ ملا تھا۔ اس کے علاوہ ہم سب اس بنیادی حقیقت کو اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ بڑے آدمی کی بیوی سب سے پہلے ایک آدمی کی بیوی ہوتی ہے۔ اگر اس کے خانگی حقوق و فرائض کا سلسلہ اس کی ذاتی زندگی کو مطمئن نہیں کرتا تو اس کے شوہر کی بڑائی کے متعلق سوانحی یا ادبی تنقید کا لگایا ہوا حکم اس کے لئے رائیگاں اور مہمل ہے۔ کسی عورت (یا مرد) کی زندگی کو ایک ایسے معیار سے پرکھنا جو عملی زندگی کا کوئی معیار ہی نہیں ہے۔ ایک قسم کی داستان گوئی تو کہلا سکتا ہے لیکن اسے واقعہ نگاری کا نام دینا ذرا زیادتی ہے۔

مرزا غالب کی بیگم صاحبہ کو مرزا صاحب کیسے نظر آتے تھے، اس کے لئے میاں بیوی کے اندازِ طبیعت اور شخصی حالات کا تصور کسی حد تک ہماری رہنمائی

کرسکتا ہے، لیکن اس مسئلے کو غالب کی شاعری پر مولانا حالی یا ڈاکٹر بجنوری کی رائے سے خلط ملط کر دینا تو کسی حالت میں درست نہیں ہو سکتا۔ بیگم مرزا غالب ایک علیحدہ اور مستقل شخصیت کی مالک نہیں جسے دیوانِ غالب کے ضمیمے کے طور پر پیش کرنا ناممکن ہے۔ اگر ہمیں اُن کی شخصیت کو سمجھنا ہے تو سب سے پہلے اُن کی زندگی کو خود اُن کے نقطۂ نظر سے دیکھنا ضروری ہے۔ آیئے آج اس کہانی کے آغاز و انجام پر ایک سرسری سی نظر ڈالیں۔

یہ کہانی ۱۷۹۹ء سے شروع ہوتی ہے جب دہلی کے ایک شریف اور با اقبال گھرانے میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام امراؤ بیگم رکھا گیا۔ امراؤ بیگم کے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کو شہزادوں کا سا عیش و آرام میسّر تھا۔ جوانی میں مرزا الٰہی بخش خاں کی زندگی کا ڈھنگ ایسا تھا کہ وہ "شہزادۂ گل فام" کے عرف سے مشہور تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی بیٹی کی پرورش کس ناز و نعمت کے عالم میں ہوئی ہوگی۔ جب امراؤ بیگم گیارہ برس کی ہوئی تو اُس زمانے کے دستور کے مطابق اُس کا بیاہ ہو گیا۔ اُس کا دولہا مرزا اسد اللہ بیگ خاں جو عمر میں اس سے صرف دو برس بڑا تھا آگرے کا ایک امیر زادہ تھا، سفید فام، خوش شکل، خوش گفتار۔ خیال یہ تھا کہ اسد اللہ بیگ جوان ہو کر باپ دادا کی طرح سپہگری کی زندگی اختیار کرے گا اور امراؤ بیگم کو میکے کا امیرانہ ٹھاٹھ سسرال میں بھی حاصل رہے گا لیکن یہ اُمیدیں پوری نہ ہوئیں۔ اسد اللہ بیگ خاں نے زر و مال کمانے کی کوئی سبیل نہ کی اور تمام عمر بیکاری میں، یا بیکار قسم کے شعر لکھنے میں گزار دی، چوبیس پچیس برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد امراؤ بیگم نے پھر کبھی بے فکری کے دن نہ دیکھے بلکہ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ شوہر کی طرف سے کوئی آرام اگر قسمت میں نہ تھا تو اولاد کی خوشی ہی نصیب ہوتی۔ لیکن بچپن کے اچھے دنوں کے بعد تقدیر نے امراؤ بیگم سے نیک سلوک کرنے کی گویا قسم کھالی تھی۔ سات بچے پیدا ہوئے مگر کسی کی عمر برس سوا برس سے زیادہ نہ ہوئی اور سبھی ایک ایک کر کے

ماں کے دل کو دائمی جُدائی کا داغ دے گئے۔ شوہر جیسا بھی تھا نباہ تو کئے جا رہا تھا۔ لیکن یہاں بھی آخر عمر میں قسمت نے بیوفائی کی۔ شوہر کے ہاتھوں پیوندِ خاک ہونا اُمراؤ بیگم کو نصیب نہ ہوا۔ بڑھاپے میں اُسے بیوگی کا صدمہ دیکھنا پڑا۔ اور اسی کے ساتھ ہی شوہر کی مالی پریشانیاں خود اُسے ورثے میں مل گئیں۔ امراؤ بیگم کا شوہر انتقال کے وقت آٹھ سو روپے کا مقروض تھا۔ اب بوڑھی بیوہ حیران تھی کہ یہ قرضہ کس طرح اور کہاں سے ادا کرے۔ سرکاروں، درباروں میں استمداد کے لیے، عرضیاں بھجوائی گئیں۔ ان عرضیوں کا مضمون پڑھنے والوں کو آج بھی درد ناک معلوم ہوتا ہے لیکن سرکاروں، درباروں میں کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر ۱۸۷۰ء میں مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی ناز پروردہ بیٹی پریشاں روزگار، بے اولاد، بے شوہر دنیا سے رخصت ہوئی۔

نسوانی زندگی کی اس مختصر سی کہانی میں کوئی ایسی عجیب بات نظر نہیں آتی جس کی خاطر لوگ اسے سُننے کے لئے بے تاب ہوں۔ عورت کی گمنامی اور بے کسی اور بے حاصلی کا یہ نقشہ گزشتہ صدی کی طرح آج بھی مسلمان شرفا کے گھروں میں موجود ہے لیکن پھر بھی امراؤ بیگم کی داستان میں ایک خاص بات ہے۔ اس کا شوہر اسد اللہ خاں غالبؔ آج اردو کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔ اور امراؤ بیگم اور مرزا غالبؔ کے باہمی تعلقات ادبی سوانح کا ایک دلچسپ مسئلہ بن چکے ہیں۔

خود غالبؔ کی تحریروں میں ان ازدواجی تعلقات کا ذکر بار بار ہوا ہے۔ لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اس ذکر کا کتنا حصّہ مزاحاً اور کتنا حصّہ سنجیدگی سے قلمبند ہوا ہے۔ مولانا حالیؔ لکھتے ہیں: "چونکہ شوخی اور ظرافت اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، اُن کی زبان و قلم سے بیوی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جن کو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔" لیکن اس سلسلے میں عام خیال وہی ہے جس کا اظہار غالبؔ کے ایک فاضل

سوانح نگار نے ذیل کے الفاظ میں کیا ہے:

"واقعہ یہ ہے کہ غالبؔ کو اپنی بیگم صاحبہ سے بڑی محبت تھی۔ بیگم صاحبہ بھی اپنے شوہر کی راحت و آسائش پر اپنی جان قربان کرتی تھیں"۔ صرف ایک نقاد نے روحانی رفاقت کے اس تصور سے بدیں الفاظ قطعی اختلاف کیا ہے۔

"مرزا کی کئی تحریروں سے ...... یہ نتیجہ اخذ کرنا بہت مشکل نہیں کہ وہ شادی کو دامِ سخت ہی سمجھتے رہے اور اُڑنے سے پہلے گرفتار ہو جانا انھیں بہت ناگوار تھا"

حقیقت حال کیا تھی؟ اس کے انکشاف کے لئے غالبؔ یا بیگم غالبؔ کا کوئی غیر مشتبہ بیان ہمارے سامنے ہونا چاہیئے۔ یہ نہ ہو تو معتبر گواہوں کی چشم دید کیفیت پر بھی انحصار کیا جا سکتا ہے۔

غالبؔ کے خطوط میں وہ تلخ بیانات جن میں مزاح کا شائبہ پایا جاتا ہے ہمارے لئے اس لحاظ سے ناقابلِ اعتماد ہیں کہ اُن پر کسی قطعی فیصلے کی بنیاد رکھنا دشوار ہے۔ یہی حال ظرافت آمیز اشعار کا ہے۔ اس قسم کے اشعار پر ہلکے سے مزاح کا شبہہ کرنا شاید ممکن ہو ؎

زیں گونہ کہ تندی خوامی دانم
درخانہ زنِ ستیزہ خوئے داری

لیکن قطعۂ ذیل ظرافت کے شبہہ سے پاک ہے ؎

بہ آدم زن بہ شیطاں طوقِ لعنت	سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم	گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

اس میں ؎ "در طلبِ نان و جامہ کشمکش از زن" کی طرف صریح اشارہ ہے۔ اس قسم کے اشارات اتفاقی نہیں بلکہ ارادی معلوم ہوتے ہیں۔ اردو کلام کے ابتدائی حصے میں بھی کہیں کہیں کنایۃً ایسا مضمون پیدا ہوتا ہے کہ نوجوان شاعر اپنی شادی سے خوش معلوم نہیں ہوتا۔ ذیل کا شعر "نسخۂ حمیدیہ" کی ایک غزل

میں ملتا ہے ؎

آرزوئے خانہ آبادی نے ویراں تر کیا
کیا کروں گر سایۂ دیوار سیلابی کرے

اس شعر کا مطلب کچھ بھی لیا جائے، لفظ "خانہ آبادی" کا استعمال معنی خیز ضرور ہے۔ اس غزل کے مقطع میں دلّی اور دلّی کے نوابوں پر پھبتی بھی اسی لحاظ سے معنی خیز ہے ؎

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالبؔ تو پھر
کیوں نہ دلّی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

اس قسم کے طنزیہ اشارے غالبؔ کی شاعری میں اُس کی خانگی زندگی کے صرف ایک پہلو کی جھلک دکھاتے ہیں۔ ایک دوسرا پہلو وہ ہے جس کا دلاویز ترین اظہار کلیاتِ فارسی کی تیسری مثنوی کے آخری اشعار میں ہوا ہے۔ شاعر وطن سے دور اپنے اہل و عیال کی تکلیفوں کے احساس سے مضطرب ہے لیکن جب اُسے یہ خیال آتا ہے کہ اِن لوگوں کی بے کسی کا ٓسرا دہ خود ہے تو اُس کا دل شفقت اور ہمدردی سے بھر جاتا ہے اور اُسے اپنی کوتاہیوں پر شرم آنے لگتی ہے ؎

به کاشی لختے از کاشانه یادآر | دریں جنت ازاں ویرانه یادآر
دریغا در وطن وامانده‌ٔ چند | به خونِ دیده زورق رانده‌ٔ چند
ہوس را پائے در دامن شکسته | به امیدِ تو چشم از خویش بسته
به شہر از بے کسی صحرا نشیناں | به روئے آتشِ دل جاگزیناں
ہمه در خاک و خوں افگنده‌ٔ تو | به حکمِ بے کسیہا بنده‌ٔ تو
چو شمع از داغِ دل آذرفشاناں | به بزمِ عرضِ دعوئ بے زباناں
سر و سرمایہ غارت کرده‌ٔ تو | ز تو نالاں ولے در پرده‌ٔ تو

"ز تو نالاں ولے در پرده‌ٔ تو! غالبؔ اور بیگم غالبؔ کے تعلقات کا خلاصہ اس سے

بہتر کہیں اور بیان نہیں ہوا۔ جس خلوص دورد سے مندرجہ بالا اشعار لبریز ہیں اس کے ہوتے ہوئے یہ شک کرنا ظلم ہے کہ شاعر نے "زنِ نالاں" کے الفاظ محض بہتان طرازی کے لئے لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بیگم غالبؔ نے غالبؔ کی مالی اور عملی کوتاہیوں پر ہمیشہ اس زور سے احتجاج کیا کہ غالبؔ کو حرم سرا کی اس جنگ میں شکست کھا کر دیوان خانے کی طرف مستقل طور پر پسپا ہونا پڑا۔ اس دعوے کی بنیاد غالبؔ کے بیانات ہی پر نہیں بلکہ ایسی معتبر روایات پر ہے جو "درون خانہ" پہنچتی ہیں۔ نواب سرور الملک نے جو غالبؔ کے حقیقی بہن کے پوتے تھے اور جن کی شادی بعد میں بیگم غالبؔ کے حقیقی بھائی کی پوتی سے ہوئی۔ ان دونوں کے باہمی تعلقات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> دادا مرزا نوشہ کا نکاح دخترِ نواب الٰہی بخش خاں سے ہوا۔ بچپن میں جب میں اپنی والدۂ مرحومہ کے ساتھ اُن کے ہاں جایا کرتا تھا تو دادی مجھ کو ایک دونی دیا کرتی تھیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں میاں بیوی میں ہمیشہ اَن بن رہی۔ بیبیاں اس خاندان کی نہایت مہذب و شایستہ مگر کمال درجہ مغرور و متکبر تھیں......

اسی مضمون کی اتنی ہی معتبر شہادت نواب معظم زمانی بیگم دخترِ نواب ضیاء الدین خاں نیر رخشاں کی ہے جو چند ہی سال پہلے بقیدِ حیات تھیں۔ راقم الحروف کو اُنکی خدمت میں حاضر ہو کر غالبؔ اور بیگم غالبؔ کی زندگی کے آخری زمانہ کے متعلق چشم دید حالات سُننے کا موقع ملا تھا۔ اُن کے الفاظ بھی یہی تھے کہ "میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی" بقول اُن کے مرزا صاحب غصّے میں آتے تو اُن کی زبان سے اس قسم کے کلمات نکلتے تھے:

"میرا تو ناک میں دم کر دیا!" "حضرت موسیٰ کی بہن!" دوسری طرف بیگم غالبؔ خفا ہوتی تھیں، مگر خاموش ہو جاتی تھیں۔ اپنی بھتیجی (معظم زمانی بیگم) سے کہتی تھیں: "تو تو بچہ ہے۔ بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کر۔ بڈھا تو دیوانہ ہو گیا ہے"۔

۹ر اگست ۱۸۱۰ء کو امراؤ بیگم کی شادی غالبؔ سے ہوئی۔ نو عمری کی شادی اور پچھلی صدی کے ہندوستان میں، مرضی اور پسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ دولھا دلہن دونوں خود پسند اور تیز طبیعت، قدرۃً دونوں نے ایک دوسرے پر غالب آنے کے لئے کشمکش کی اور دونوں میں سے کسی نے آخر دم تک ہار نہ مانی جہاں طبیعتوں کے اس ایکے نے مستقل پھوٹ کی بنیاد ڈالی، وہیں اختلافِ مزاج کے بعض پہلوؤں نے دونوں کی روحانی علیحدگی کو زیادہ مضبوط اور پائدار کر دیا۔ مرزا الٰہی بخش خاں نے جب دنیا سے منہ موڑ کر تصوّف اور ریاضت کی زندگی اختیار کی تو امراؤ بیگم کی فطری پارسائی کو تائید مزید حاصل ہوئی۔ ادھر غالبؔ کی رندی اور وارستگی کو زندگی کے اس تصور سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ آغازِ شباب سے لے کر بڑھاپے کے آخری دَور تک کسی منزل پر بھی اُن کی طبیعت ادھر نہ آئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پرہیزگار بیوی نے رند مشرب شوہر کے کھانے پینے کے برتن تک الگ کر دیئے۔ ایک اور وجہ اختلاف دونوں میں سے ایک کی سنجیدگی اور دوسرے کی ظرافت تھی۔ غالبؔ کی ٹھٹھے کی عادت اکثر موقعوں پر امراؤ بیگم کو ناقابلِ برداشت معلوم ہوتی تھی۔ وہ کھوکھلا ہنسوڑ پن جس کے پیچھے بے اقبالی اور فاقہ مستی کا بھیانک چہرہ ہو۔ اُس بی بی کے لئے کوئی معنی نہ رکھ سکتا تھا۔ جسے اپنی وسیع برادری سے عزت و آبرو کا تعلق برقرار رکھنے کیلئے خدا جانے کس کس طرح کے جتن کرنے پڑتے تھے۔

شادی سے چند سال بعد جب میاں بیوی جوانی کی عمر کو پہنچے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو اس سلسلے میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ اب امراؤ بیگم کو وہ بڑے سے بڑا صدمہ پہنچا جو شوہر کی طرف سے بیوی کو پہنچ سکتا ہے۔ غالبؔ نے ایک دوسری عورت سے بے قرارانہ عشق کیا۔ بیگم غالبؔ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اُن کے دل کی کیا کیفیت ہوئی اس کے متعلق یقین سے کچھ کہنا دشوار ہے۔ غالباً اُن کا فطری غرور و تمکنت اُس وقت آڑے آیا۔ طبیعت کا مذہبی رنگ جو باپ سے

ورثہ میں ملا تھا، شاید کچھ اور گہرا ہو گیا۔ شاید دونوں کی روح کے درمیان ایک اور پردہ حائل ہو گیا۔ ہمارے سامنے اس معاملے میں معلومات نہیں، صرف قیاسات ہیں۔

غرض طرح طرح کے اختلافات کی بنیاد پر آئے دن آپس میں جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اگر شوہر کچھ کماؤ ہوتا تو طبیعتوں کا یہ اختلاف کسی حد تک دب جاتا لیکن شوہر کی کمائی کا یہ حال تھا کہ شادی کے بارہ چودہ برس بعد گھر میں جو اثاثہ تھا وہ بھی فروخت ہونے لگا۔ عورت کا شوہر اُس کی قسمت ہوتا ہے اور بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ شادی کے بعد امراؤ بیگم کی قسمت پھوٹ گئی۔ غالبؔ کی شاعری کو امراؤ بیگم نے کبھی کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ غالبؔ کو ہنسی، دل لگی اور چھیڑ چھاڑ کا جو چسکا تھا وہ امراؤ بیگم کے لئے عذاب جان ہو گیا۔ بڑھاپے تک غالبؔ کی یہ عادت نہ گئی۔ اور امراؤ بیگم کی چڑ بھی بڑھاپے تک قائم رہی۔ نواب معظم زمانی بیگم نے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ مرزا غالبؔ نے اُن سے مذاق کیا تو امراؤ بیگم خفا ہو کر بولیں: "ہائے توبہ! بڈھا تو دیوانہ ہے۔ اسے ٹھٹھے کے لئے کوئی چاہئے۔ اب بہو ہی مل گئی۔"

بارہا انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں جھپٹ ہو جاتی تھی۔ خانگی زندگی کے یہ لطیفے اکثر تذکرہ نویسوں نے بیان کئے ہیں مگر ان لطیفوں کے ناگوار نتائج کا ذکر قدرتی طور پر نہیں کیا۔ مولانا حالیؔ کی روایت ہے کہ ایک دفعہ غالبؔ نے مکان بدلنا چاہا۔ نئے مکان کا دیوان خانہ تو خود پسند کر آئے، اور محل سرا دیکھنے کے لئے امراؤ بیگم گئیں۔ واپس آئیں تو غالبؔ نے پوچھا "کہو مکان پسند آیا؟" بیگم نے جواب دیا۔ اُس گھر میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔" غالبؔ نے فوراً کہا "مگر کیا دنیا میں تم سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟" اس کے بعد جو کچھ گذری وہ لطیفے سے تو خارج ہے مگر غالبؔ کی سوانح عمری سے خارج نہیں ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ میاں بیوی کے یہ جھگڑے کبھی کسی دائمی فساد یا بدمزگی کی بھی نوبت لائے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ امراؤ بیگم

کی بہن بنیادی بیگم کے تعلقات اپنے شوہر سے اس حد تک بگڑ گئے تھے کہ شوہر نے انھیں ہمیشہ کے لیے الگ کر دیا۔ اس کے برعکس مرزا غالب اور امراؤ بیگم دونوں پرانے شرفا کی وضعداری کا نمونہ تھے اور طبیعتوں کے شدید اختلاف ہوتے ہوئے بھی آخر عمر تک ایک دوسرے سے نباہ کرتے چلے گئے۔ غالب نے منجملہ دوسرے اسباب کے بیوی کی خاطر اپنا وطن چھوڑ کر دہلی کا قیام اختیار کیا اور تمام عمر یہیں گزار دی۔ اپنے خاندان سے کہیں زیادہ اُن کے تعلقات بیوی کے خاندان سے تھے اور (عملی نتائج سے قطع نظر) اُن کی دلی خواہش یہ تھی کہ بیوی کے آرام و آسائش کے لیے ہر ممکن صورت پیدا کریں۔

مولانا حالی کی روایت ہے کہ "مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے۔" دوسرے ثقہ راویوں کی زبانی بھی یہی معلوم ہوا کہ غالب اپنے وقت کا بہت بڑا حصہ دیوان خانے میں گزارتے تھے۔ اس علیحدگی کے باوجود امراؤ بیگم نے شریف بیبیوں کی قدیم روایات کو جس طرح قائم رکھا وہ قابلِ داد ہے۔ انھوں نے شوہر کی خدمت کرنا ہمیشہ اپنا فرض سمجھا۔ کھانا زنانے میں پکتا اور وقت پر غالب کو دیوان خانے میں پہنچ جاتا۔ جب بیمار ہوتے تو دوائیں جوشاندے وغیرہ پورے اہتمام سے تیار کر کے انھیں پہنچائے جاتے۔

غالب بھی دن میں ایک مرتبہ ضرور زنانہ مکان میں جاتے تھے۔ جب تک بدن میں طاقت رہی صبح کا کھانا وہیں کھاتے۔ بڑھاپے میں اس کی پابندی نہ رہ سکی۔ پھر بھی لکڑی ٹیکتے ٹیکتے عام طور پر صبح یا دوپہر کو اور کبھی کبھی عصر کے قریب ضرور گھر میں جاتے۔ بنیادی بیگم کے پوتے نواب خضر مرزا مرحوم (جنھوں نے لڑکپن میں غالب اور امراؤ بیگم کو دیکھا تھا) راقم الحروف سے اس زمانے کی ایک حکایت ان الفاظ میں بیان کرتے تھے: "میں ایک دن مرزا صاحب کے دیوان خانے میں کھڑا تھا کہ وہ اوپر سے اترے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ آ تیری دادی کے گھر چلتا ہوں (دادی سے مراد امراؤ بیگم تھیں) اندر جا کر بستی ماما سے دادی کے متعلق

پوچھا کہ کہاں ہیں۔ معلوم ہوا کہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ کہنے لگے۔ ہیں یہ کیا! جب آؤ، نماز!
ارے خضر تیری دادی نے تو گھر کو فتح پوری کی مسجد بنا دیا!"

امراؤ بیگم کی زندگی کے درمیانی بیس پچیس سال جس تنہائی بلکہ ویرانی کے عالم میں بسر ہوئے، اس کی طرف مولانا حالی نے یوں اشارہ کیا ہے: "مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی ...... اس لیے ایک مدت سے وہ اور ان کی بی بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔" ۱۸۵۲ء میں زین العابدین خاں عارف کا انتقال ہوا تو آئندہ دس بارہ برس اُن کے بچوں کو پال پوس کر بڑا کرنے میں بسر ہو گئے، اس کے بعد پھر وہی تنہائی کا عالم شروع ہوا۔ نواب معظم زمانی بیگم کا بیان ہے کہ بڑھاپے کے دنوں میں جانماز پر بیٹھے اُن کے مُنہ سے اکثر یہ الفاظ نکلتے تھے: "اے اللہ! تو کب بُلائے گا؟"

اب موت کی دُعائیں قبول ہونے کا وقت آ پہنچا تھا۔ پہلے، فروری ۱۸۶۹ء میں مرزا غالب رخصت ہوئے۔ نواب خضر مرزا مرحوم نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ "مرزا صاحب کا انتقال دیوان خانے میں ہوا۔ دادی اس وقت زنان خانے میں تھیں۔ اسی عرصے میں داروغہ کلو کو اُنھوں نے باہر کی خبر پوچھنے کے لیے کئی دفعہ بُلایا۔ میں ایک دو دفعہ گیا، گریہ اُن پر طاری تھا۔ سفید دوپٹہ اوڑھے تخت پر بیٹھی رو رہی تھیں۔"

ساٹھ برس کی رفاقت جو لڑکپن سے شروع ہوئی تھی اُس کا یوں انجام ہوا، مگر جب تک زندگی ہے، زندگی کے دھندے بھی جاری ہیں۔ بیوگی کے ساتھ تنگ دستی کی تکلیفوں نے نئی شدت اختیار کی۔ رام پور کی تنخواہ اور انگریزی پنشن جو غالب کو ملتی تھیں، دونوں ایک دم بند ہو گئیں۔ امراؤ بیگم کی طرف سے کمشنر دہلی اور نواب صاحب رام پور کو امداد کے لیے درخواستیں بھیجی گئیں۔ کمشنر نے جواب دیا کہ غالب کی بیوہ کے لیے دس روپیہ کی پنشن منظور ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ خود کچہری میں حاضر ہو۔ امراؤ بیگم نے اس شرط کو قبول کرنا گوارا نہ کیا

اور کہا کہ میں کچہری میں ہرگز نہ جاؤں گی گو فاقوں سے مر جاؤں۔ رام پور والی درخواستوں سے بھی کوئی نتیجہ جلد نکلتا نظر نہ آیا۔ اسی پریشانی کے عالم میں مرحوم شوہر کی پہلی برسی کا دن آپہنچا۔ اسی دن امراؤ بیگم دنیوی عدالتوں کی حاجت روائی سے بے نیاز ہوگئیں۔ اُن کی ایک اور بڑی درخواست خدا کی بارگاہ سے اسی دن کے لئے منظور ہو چکی تھی۔ میاں بیوی کو زندگی کے معاملات میں ہمیشہ ایک دوسرے سے اختلاف رہا۔ لیکن اب موت نے یوں مساعدت کی کہ غالب کی وفات سے ایک سال بعد قمری مہینے کی ٹھیک اُسی تاریخ کو امراؤ بیگم شوہر کے پیچھے روانہ ہوئیں۔

تاریخ تحریر : ۱۹۴۹/۳/۲۲
نظر ثانی : ۱۹۵۲/۴/۲۰

خواجہ سید محمد فخرالدین حسن سخن دہلوی

متوفی (۱۳۸۱ ھ)

حمیدہ سلطان

مرزا باقر علی خاں کامل

نواب الٰہی بخش خاں معروف کی دو صاحبزادیاں تھیں، بڑی صاحبزادی بنیادی بیگم اور چھوٹی امراؤ بیگم، چھوٹی مرزا غالب سے بیاہی گئیں اور بڑی بہن کی شادی نواب غلام حسین خاں مسترور سے ہوئی۔

بنیادی بیگم کے یہاں دو صاحبزادے ہوئے، بڑے کا نام تھا زین العابدین خاں، اور چھوٹے کا حیدر حسین خاں۔

مرزا غالب کے یہاں جب سات بچے ہو کر مر گئے، تو انھوں نے بیوی کے بھانجے عارف کو اپنا متبنیٰ کر لیا، عارف جوان صالح اور خوش فکر شاعر تھے مرزا سے ہی اصلاح لیتے تھے اور طرز سخن میں مرزا کے پیرو تھے۔ عارف سے جو مرزا کو محبت تھی یہ صرف رشتہ داری کی وجہ نہ تھی بلکہ عارف کی خوش فکری اور جودت طبع نے مرزا کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔ عارف سے جس قدر مرزا کو موانست تھی اس کا اظہار ان کے اس فارسی قطع سے ہوتا ہے ؎

آں پسندیدہ خوئے عارف نام — کہ رخش شمع دودمانِ من است
آں کہ در بزم قرب خلوتِ انس — غمگسار و مزاج دانِ من است

عارف کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

ہم ز کلک تو خوش دلم و خوش دل
کاں نہالِ ثمر فشاں من است

مگر افسوس عین شباب میں عارف بھی جن کو کبھی مرزا "راحتِ روح ناتواں" اور کبھی "شمعِ دودماں" کہتے تھے داغِ مفارقت دے گئے، اپریل ۱۸۵۲ء مطابق

جمادی الثانی ۱۲۶۵ھ بعارضہ رعاف و اسہال ۳۵ سال کی عمر میں عارف کا انتقال ہو گیا اور مرزا نے اُن کی جواں مرگی پر وہ درد بھرا نوحہ لکھا جو مرزا کے بہترین کلام میں شمار کیا جاتا ہے۔

بیگم عارف کا انتقال چند مہینے پہلے ہو چکا تھا اس لیے، مرزا غالبؔ، عارف کی وفات کے بعد حسین علی خاں کو اپنے پاس لے آئے، باقر علی خاں جن کی عمر ۵ سال کی تھی اپنی دادی بنیادی بیگم کے پاس رہے مگر بنیادی بیگم بھی جوانمرگ بیٹے کے غم میں جلد ہی ختم ہو گئیں اور باقر علی خاں بھی مرزا کے آغوشِ محبت میں آ گئے۔ خود فرماتے ہیں:

"کما بیش و پنج سال است کہ دو کودک بے مادر و پدر ہم از دودہ، آں زن کہ خون منش بجگر دن، بفرزندی بر داشتہ ام" (دستنبو صفحہ ۲۷)

ان دونوں بچوں سے مرزا کو محبت تھی عشق تھا کبھی بھی اُن کو اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے اگر چہ خود بے حد تنک مزاج تھے لیکن باقر علی خاں، حسین علی خاں کی ہر وقت ناز برداری کرتے تھے اور اُن کا دل میلا نہ ہونے دیتے تھے۔

کاملؔ و شاداںؔ سے متعلق غالبؔ کے اُن خطوط کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو اُنھوں نے تفتہؔ، مجروحؔ، حکیم غلام نجف خاں، اور علاء الدین احمد خاں کو لکھے ہیں۔ اسی طرح غالبؔ کے اِن تین خطوں کا مطالعہ مفید ہوگا جو اُنھوں نے باقر علی خاں کاملؔ کے نام سپردِ قلم کیے ہیں۔ (اردوئے معلیٰ ۳۲۱ تا ۳۲۲)

رامپور کے دونوں سفروں میں باقر علی خاں، حسین علی خاں مرزا غالبؔ کے ساتھ گئے تھے، مرزا نے دونوں لڑکوں سے نواب صاحب کو نذر دلوائی تھی، رامپور کی آب و ہوا مرزا صاحب کو موافق آئی، ان کا ارادہ تھا کہ گرمی اور برسات رامپور میں گذاریں مگر دونوں لڑکوں نے دہلی چلنے کے لیے ضد کی، مرزا نے ان کو تنہا بھیجنا نہ چاہا خود بھی ان کے ہمراہ نواب صاحب سے اجازت لے کر، ۱۸ مارچ ۱۸۶۰ء کو

رامپور سے روانہ ہوئے اور ۲۴ر مارچ سنہ رواں کو دہلی پہونچکر رمضان کا چاند دیکھا۔

نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں مسند آرائے ریاست ہوئے، تو مرزا غالبؔ، نواب فردوس مکان کی تعزیت اور نواب حال کی مسند نشینی کی تہنیت کے لئے، ۱۶ر اکتوبر کو دہلی سے روانہ ہوئے تو دونوں لڑکے پھر ساتھ گئے، یہ دونوں غالبؔ کی جان تھے چونکہ صغیر سن تھے اور لاڈلے، اس لئے مرزا کو تنگ بہت کرتے تھے، اس مرتبہ مرزا صاحب نے ان دونوں لڑکوں کو ۲ر دسمبر کو ملازموں کے ہمراہ دہلی روانہ کر دیا، خود ۲۸ر دسمبر کو روانہ ہوئے، راہ میں ان کو ایک سخت حادثہ پیش آیا، دہلی پہونچکر انھوں نے اس حادثہ کی تفصیل نواب کلب علی خاں بہادر کو لکھی ہے۔

باقر علی خاں کا خاندان مرزا باقر علی خاں کے دادا غلام حسین خاں مسرور خلف نواب فیض اللہ بیگ خاں ابن نواب قاسم جان بیگ مشرف الدولہ سہراب جنگ تھے۔ یہ وہی قاسم جان بیگ ہیں جو شاہ عالم کے زمانے میں اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں، عارف جان بیگ، عالم جان بیگ کے ہمراہ بلخ سے ہندوستان آئے تھے اور پنجاب میں جنھوں نے معین الملک عرف میر منو خلف نواب قمرالدین خاں وزیر کے ساتھ سکھوں پر فتوحات حاصل کیں تھیں اور اپنی دلیری سے پنجاب میں بڑا نام پیدا کیا تھا میر منو کے انتقال کے بعد قاسم جان بیگ نے بھی دونوں بھائیوں کے ساتھ دربار کا رُخ کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہ عالم بنگال میں میرن کے مقابلے میں فوجیں لئے پڑے تھے یہ بھی وہیں پہنچے اور اپنی بہادری سے بادشاہ کو خوش کرکے شرف الدولہ سہراب جنگ کا خطاب پایا، ہفت ہزاری منصب ملا، بادشاہ کے ساتھ تینوں بھائی دہلی واپس آئے، اور یہیں سکونت اختیار کی، نواب قاسم جان بیگ تو اکثر جنگی مہمات پر رہتے تھے، دونوں بھائی جاگیر و دیہات کا انتظام کرتے تھے، قاسم جان بیگ

نے تین لڑکے چھوڑ کر وفات پائی، محمد بخش خاں، فیض اللہ بیگ خاں، قدرت بیگ خاں۔ محمد بخش خاں کاروبار ریاست سنبھالنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے اس لئے فیض اللہ بیگ خاں کو ریاست کا کام سنبھالنا پڑا، اپنے باپ کا خطاب شرف الدولہ سہراب جنگ دربار شاہی سے پایا، فیض بیگ خاں کے تین بچے تھے ایک صاحبزادی انجمن النساء بیگم اور دو صاحب زادے غلام حسین خاں اور نقشبند خاں، نواب غلام حسین خاں نے بدروی اختیار کی اس لئے ریاست ضبط ہوگئی۔

نواب غلام حسین خاں مسرور اور نقشبند خاں کو ایک ہزار ماہوار تازیست ملتا رہا، نقشبند خاں لاولد تھے، نواب غلام حسین مسرور کے دو لڑکے تھے زین العابدین خاں اور حیدر حسین خاں۔

زین العابدین خاں، عارف ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے، ابھی خورد سال ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اُن کو باپ کی ریاست سے ڈھائی سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی، ۱۲ سال کی عمر میں ان کی شادی اپنے چچا نواب احمد بخش خاں کی بڑی صاحب زادی نواب شمس الدین کی حقیقی بہن نواب بیگم صاحبہ سے ہوئی، شادی کے بعد عارف کو بھرتکہ فیروزپور سے دامادی کی تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار ملنے لگی، نواب بیگم کا انتقال شادی کے دو سال بعد ہو گیا مگر عارف کو فیروزپور سے تنخواہ تازیست ملتی رہی، عارف کی دوسری شادی دہلی کے ایک شریف خاندان میں مرزا محمد علی بیگ بخارائی کی صاحبزادی بستی بیگم صاحبہ سے ہوئی، ان کو سسرال سے "نواب دلھن" کا خطاب ملا۔ ان کی وفات درد گردہ سے واقع ہوئی، اس اچانک موت سے عارف کو بڑا صدمہ ہوا اور جب وہ خود زندگی سے قطعی مایوس ہو گئے، تو "نواب دلہن" کی دونوں نشانیوں کو میرزا کے سپرد کیا۔

باقر علی خاں کی شادی

باقر علی خاں کی شادی، ۱۷ سال کی عمر میں معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم بنت نواب ضیاء الدین احمد خاں سے ہوئی، نسبت عارف اپنی زندگی میں کر چکے تھے۔ یہ رشتہ نواب نیر اور عارف

کے لئے ارتباط و خلوص کا نتیجہ تھا۔ تیرنے غالب سے جو قول کیا تھا اس کو نباہا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں تو خیر نواب تھے، اپنی لاڈلی بیٹی کی شادی اپنی ریاست کے مطابق شان و شکوہ سے کر رہے تھے مگر مرزا غالب نے بھی بہت حوصلہ و ارمان کے ساتھ پورے جاہ و حشم سے باقر علی خاں کی شادی کی۔ معظم زمانی بیگم کی عمر شادی کے وقت ۱۲ سال کی تھی، شادی کے بعد باقر علی خاں سسرال میں رہنے لگے، نواب ضیاء الدین احمد خاں داماد کے تمام اخراجات خود برداشت کرتے تھے لیکن انھوں نے کسی طرح مناسب نہ سمجھا کہ اپنا بار خسر کے سر پر ڈالیں۔ شادی کے تین سال بعد بیس سال کی عمر میں ریاست الور میں مہاراجہ شیودان سنگھ کی سرکار میں ملازمت کر لی۔ مہاراجہ شیودان سنگھ بہت قدردان رئیس تھے، پہلے باقر علی خاں کو مصاحبوں میں رکھا پھر جلد ہی فوج میں لے کر کپتان کے عہدے پر ممتاز کر دیا، باقر علی خاں فنونِ سپاہ گری میں اپنے نامور آبا و اجداد کی طرح ماہر تھے اور شیر کا شکار برچھے سے خوب کھیلتے تھے، نواب شہاب الدین خاں ثاقب کے انتقال کے بعد نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں نے داماد کو الور سے بلا لیا کیونکہ وہ خود جواں مرد بیٹے کے غم سے دل شکستہ ہو گئے تھے، امور ریاست اچھی طرح انجام نہ دے سکتے تھے، لائق داماد نے یہ بار اپنے سر لیا، لیکن افسوس عالمِ شباب میں چاہنے والے خسر کے سامنے ہی ۲۸ سال کی عمر میں، مہینے تپ دق میں مبتلا رہ کر رہگرائے عالمِ بقا ہوئے۔ مدفن سلطان جی حضرت محبوب الٰہی کی پائینتی میں اپنی خاندانی ہڑوارہ میں ہے لوح مزار پر یہ تاریخ لکھی ہے ؎

چو زین غم خانۂ دنیا سفر کرد   سوئے باغِ جناں باقر علی خاں

بسالِ رحلتش تحریر گردید   بود مینو مکاں باقر علی خاں

باقر علی خاں کی اولاد

باقر علی خاں نے تین لڑکیاں چھوڑ کر وفات پائی، بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم ۱۲۸۱ھ ہجری ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئیں، مرزا غالب انھیں بہت پیار کرتے تھے، اور مرزا جیون

بیگ کہہ کر پکارتے تھے، سبدِ چین میں ان کی ولادت کا قطعہ موجود ہے ؎

بہ من ز مقدم فرزندِ میرزا باقر | سروش تہنیت زبدۂ مطالب گفت
بجو "قصد" شد متعلق بہ گفتن تاریخ | طریق تعمیہ ورزید جان غالب گفت

غالب کی وفات کے وقت ان کی عمر چار سال کی تھی، ان کی شادی ۱۲ سال کی عمر میں باقر علی خاں کی وفات کے بعد اپنے بڑے ماموں شہاب الدین خاں ثاقب کے بڑے صاحبزادے مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں کے ساتھ ہوئی بفضلہ تعالےٰ موصوفہ حیات ہیں، ان کے کوئی اولاد نہیں۔

منجھلی صاحبزادی فاطمہ سلطان بیگم (عرف بندو بیگم) صاحبہ کی شادی نواب علاء الدین احمد خاں علائی کے چوتھے صاحبزادے، نواب زادہ بشیر الدین احمد خاں سے ہوئی، فاطمہ سلطان بیگم کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہوئیں، چھوٹی صاحبزادی فخر سلطان بیگم کی شادی نواب امیر الدین اعظم مرزا ولیعہد لوہارو، خلف نواب سر امیر الدین احمد خاں سے ہوئی تھی، فخر سلطان بیگم نے ۲۴ سال کی عمر میں ۶ خورد سال بچے چھوڑ کر انتقال کیا، فخر سلطان کے بڑے صاحبزادے نواب امین الدین احمد خاں شان اب والیٔ لوہارو ہیں۔

فاطمہ سلطان بیگم نے ۵۲ سال کی عمر میں بعارضۂ فالج انتقال کیا، ان کے انتقال کے ایک سال بعد ان کے بڑے صاحبزادے معز الدین سام مرزا کا بھی انتقال ہو گیا۔ چھوٹے صاحبزادے ناصر الدین خسرو مرزا اور بڑی صاحبزادی عالیہ سلطان بیگم لیڈی عبد الصمد خاں بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں، باقر علی خاں کی چھوٹی صاحبزادی رفیہ سلطان بیگم (عرف مچھن بیگم) جو ان کی وفات کے وقت ۶ مہینے کی تھیں بفضلہ تعالیٰ حیات ہیں، ان کی شادی لفٹنٹ کرنل ذو النور علی احمد سے ہوئی تھی، ان کے ۵ صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں ہیں۔

نانی اماں (معظم زمانی بیگم) فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ بندر مرزا صاحب کے پاس بیٹھا آم کھاتا رہا اور وہ ضعف بصارت کے باعث یہ سمجھتے رہے کہ یہ بندو بیگم

ہیں داروغہ کلو آئے تو انھوں نے بندر کو دھتکارا۔

نانی اماں نے فرمایا کہ عالم سکرات مرزا صاحب پر کئی گھنٹے طاری رہا۔ حکیم محمود خاں نے کہا ان کی جان کسی چیز میں اٹکی ہوئی ہے۔ سب [illegible] تو پتا چلا کہ جندو بیگم میں مرزا صاحب کی جان اٹکی ہوئی ہے۔ حکیم محمود خاں نے ہدایت کی کہ جس طرح وہ ہمیشہ آتی ہیں اسی طرح آنے دو، چنانچہ جندو بیگم کو مرزا صاحب کے پاس لے جاکر چھوڑا تو انھوں نے حسب معمول ان کے سینے پر سر رکھ کر منہ کان کے قریب لے جاکر آواز لگائی "داداجان"، اور مرزا نے فوراً آنکھ کھول کر اپنی لاڈلی پوتی کو دیکھا اور جان بجان آفریں کو سپرد کردی۔

باقر علی خاں کی بیوی نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی صاحب زادی اور عارف کی بڑی بہو، خاندان کی ایک ایسی فرد تھیں جو بیاہ کر حضرت غالب کے گھر گئیں، جنھوں نے مرزا صاحب کو بہت قریب سے دیکھا، ان کی بذلہ سنجیاں سنیں اور ان کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھا، علم انساب کا ملکہ مرحومہ موصوفہ کو اپنے مکرم والد سے ترکے میں ملا تھا، بیحد بیدار مغز اور با حوصلہ خاتون تھیں اپنے بزرگوں کی شان اور عہدِ قدیم کی مروت و اخلاق، غربا پروری کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ آپ کی خدمت میں حضرت غالب کے اکثر شیدائی، استفادے کی غرض سے حاضر ہوا کرتے تھے، افسوس کاشانۂ نیر کی یہ شمع روشن ۱۰ر مئی ۱۹۴۵ء کو ۹۳ سال کی عمر میں اپنی محل سرا "ضیا منزل" میں گل ہو گئی قطب صاحب، اپنے خاندانی مقبرے صندل خانہ مرزا بابر والی کوٹھی میں ان کا مدفن ہے۔

میری اپنی بہت سی معلومات نانی اماں کی بدولت ہیں وہ کہتی تھیں کہ شادی کے ایک سال بعد جو برسات آئی تو مرزا صاحب شام کو گھر میں کھانا کھانے آئے تو کہنے لگے اے ہے بیوی دیکھو کتنا پیارا موسم ہے کیسی جنون انگیز ہوائیں چل رہی ہیں اس وقت میں تم ہو اور میں ہوں۔ یہ بہو تو دو میں تیسرا

آنکھوں میں ٹھیکرا اپنی بیٹھی ہے۔ بیگم غالب تو مرزا کے اس مذاق پر ان کو صلواتیں سنانے لگیں اور نانی اماں شرم کے مارے کوٹھری میں جا گھسیں۔ مرزا صاحب جب باہر چلے گئے تو نکلیں۔

نانی اماں نے کہا تھا کہ نانا جان (باقر علی خاں) علم نجوم سے کما حقہ واقفیت رکھتے تھے جو حکم وہ لگاتے تھے بالکل صحیح ہوتا تھا اپنے انتقال کے متعلق دو سال قبل انھوں نے کہہ دیا تھا کہ میں آگ میں جل کر مروں گا۔ چنانچہ بخار کی آگ میں جل کر ان کا کام تمام ہوا۔ باقر علی خاں فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے، فارسی میں باقر اور اردو میں کامل تخلص کرتے تھے، قربان علی بیگ سالک سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے، شہر آشوب کے علاوہ ان کا اور کلام نہیں ملتا۔

نانی اماں (معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم) فرماتی تھیں کہ جب شہر آشوب پر تمام شعرائے کرام نظمیں لکھ رہے تھے تو مرزا غالب نے حسین علی خاں سے جن کی عمر اس وقت ۸ یا ۹ سال کی تھی کہا، کہ شاداں تم نے میرا نام ڈبو دیا۔ غالب کا پوتا اور ایسا کوڑھ مغز ایک شعر بھی نہیں کہتا، بس ہر وقت پتنگ اڑاتا رہتا ہے، شاداں نے جواب دیا، دادا جان، آپ فکر نہ کریں، ہم ضرور شعر کہیں گے، مشاعرہ ہوا، نامی گرامی شعرا نے دلی کی تباہی اور بربادی پر نظمیں لکھیں تھیں اور بڑے سوز و گداز سے سنا رہے تھے، پورا مجمع ساکت تھا، اہل مشاعرہ پر افسردگی کا عالم طاری تھا، دلی کی تباہی، دوستوں، عزیزوں کے بچھڑ جانے کا خیال، دل خون کئے دیتا تھا۔ یکایک غالب نے شاداں کی جانب نظر اٹھائی، مجمع کی آنکھیں اسی نور نظر پر لگ گئیں، شاداں نے صاف اور پیاری آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

خوب ہوا مٹ گیا جو نام دلستانِ دہلی

میری پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

اس شعر کو سن کر مشاعرے میں اس سرے سے اس سرے تک زندگی کی لہر دوڑ گئی، روتے ہوئے لوگ ہنس پڑے، ہر چہرے پر شگفتگی آ گئی۔ اور حضرت غالب

نے اپنے ہونہار پوتے کو گلے لگا کر پیار کیا۔

مرزا غالب کی وفات کے بعد حسین علی خاں رامپور کی سرکار سے وابستہ ہو گئے تھے، اُن کی شادی نواب عارف جان کے پوتے، حسن علی خاں کی پوتی حسن جہاں بیگم بنت اکبر علی خاں سے مرزا کی وفات کے بعد ہوئی، باقر علی خاں کے انتقال کے بعد حسین علی خاں کا توازن دماغی بڑے بھائی کے غم میں بگڑ گیا تھا، لیکن اس حال میں بھی شعر کہتے تھے۔ باقر علی خاں کے انتقال کے ساڑھے تین سال بعد ڈھائی سال، عارضہ سل میں مبتلا رہ کر ۲۹ سال کی عمر میں حسین علی خاں نے وفات پائی، اولاد کوئی نہیں چھوڑی ڈیڑھ دیوان اپنی یادگار چھوڑے جو تلف ہو گئے۔

مختار الدین آرزو صاحب لکھتے ہیں کہ ایک مختصر سا دیوان کچھ دن ہوئے جناب عرشی کو کتب خانہ، رامپور کے ردّی گھر میں دستیاب ہوا ہے، کچھ منتخب کلام خمخانۂ جاوید میں موجود ہے۔

[۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء]

از خواجہ قمر الدین راقم

من کیستم

اپنی سوانح عمری گزارش کرتا ہے کہ ابتدائی عمر میں اوّل بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی ملازمت سے ممتاز ہوا۔ فن تیر اندازی میں بادشاہ کا شاگرد ہوگیا۔ پندرہ روپے ماہانہ سرکار شاہی سے دو برس تک ملتا رہا بعد اس کے بادشاہ نے اپنے ولیعہد مرزا فتح الملک کے مجھے سپرد کر دیا۔ دو برس اُن کی ملازمت میں رہا اتفاق سے مرزا فتح الملک کا دبائے ہیضہ میں انتقال ہوگیا۔ پھر میں ریاست الور میں اپنے والد کے پاس چلا گیا۔ راجہ بنے سنگھ والیِ الور نے مجھے رکھ لیا اور اپنے فرزند شیودان سنگھ کی تعلیم میں سپرد کر دیا۔ چالیس روپے ماہوار میرے مقرر کیے۔ شیودان سنگھ کی نو برس کی عمر تھی۔ مجھے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ مجھے نوکر ہوئے چار برس گزرے تھے کہ دہلی میں بغاوت ہوگئی اور عالم پُر آشوب ہوگیا۔ انہیں ایّام میں راجہ بنے سنگھ مرض فالج میں مبتلا ہوئے اور اُسی مرض میں مر گئے۔ شیودان سنگھ کی والدہ نے مجھے تاکید کی کہ شیودان سنگھ کو ایک لمحہ تنہا نہ چھوڑو رات دن اُن کے پاس رہو اس کے علاوہ شیودان سنگھ خود مجھ سے اس قدر مانوس تھے کہ مجھے جُدا نہ ہونے دیتے تھے۔ اس عرصہ میں دہلی فتح ہوگئی۔ بعد ایک سال کے الور کے بعض بہ اُسی آشوب عالم میں باغی ہو گئے۔ شہر میں فساد برپا کر دیا۔ جتنے اہلکار دہلی والے الور میں تھے سب کو اخراج کر دیا۔ اب الور جائے امن نہ رہا۔ اب بہ مصلحت والد نے وہاں سے علیحدہ ہونا چاہا مگر وہ باغی راجپوت ہماری علیحدگی پر راضی نہ ہوئے اس اثنا میں دہلی سے پنشن کی تحقیقات کے لئے

حکام کا حکم آیا۔ اُس وقت بمشکل الورسے میں بھی اور والد بھی علحدہ ہوئے۔ والد دہلی
کو روانہ ہوئے اور میں جے پور آگیا۔ مہاراج شیودان سنگھ اپنی جیب خاص سے
مجھے خرچ بھیجتے رہے۔ ایک سال تک میں جے پور میں رہا۔ اس عرصہ میں
والد کی پنشن کھُل گئی اور میں بھی دہلی چلا گیا۔ وہاں میں نے چھاپہ خانہ جاری
کر لیا۔ والد بوستانِ خیال کا ترجمہ کرتے تھے۔ میں بھی ترجمہ میں شریک رہتا
تھا اور چھپواتا تھا۔ میرے والد نے چھ جلدوں کا ترجمہ کیا۔ پانچ جلدیں چھپوا کر
شایع کر چکے تھے کہ اُن کی عمر نے وفا نہ کی۔ بعد ان کے اس ہیچ مایہ نے جلد ششم
ترجمہ شدہ چھپوا دی اور دو جلدوں کا ترجمہ خود کر کے شایع کر دیا۔ جو اُن کی یادگار
میں باقی ہے۔ اس اثنا میں میرے ایک دوست کرم فرما مولوی سید حسین صاحب
بلگرامی سکرٹری نواب میر تراب علی خاں سر سالار جنگ نے مجھے نامہ لکھ کر اپنے
پاس حیدر آباد دکن میں بُلا لیا۔ میں حسب الطلب اپنے مخدوم کے روانہ ہو گیا
میرے مخدوم سراپا کرم نے مجھے سر سالار جنگ سے ملا دیا۔ سالار جنگ نے
مجھے روک لیا۔ دو برس امیدداری میں رہا بعد اُس کے میں نے عرض کیا
کہ اب اس امیدوار کو کیا حکم ہے۔ نواب نے (فرمایا) کہ ہم نے تیرے لئے تجویز
کر لیا ہے، فی الحال ہم شاہزادہ ولیعہد کے استقبال کو بمبئی جاتے ہیں وہاں سے
آتے ہی بندوبست کر دیں گے مگر میری تقدیر میں اُس سرکار کا، آب و دانہ
نہ تھا جب نواب بمبئی روانہ ہو گئے، خیال آیا کہ تو بھی یہ جلسہ نادر دیکھ آ۔ بس
یہ خیال آتے ہی میں بھی بمبئی میں آگیا ایک سوداگر اہلِ دہلی کی دوکان میں مقیم
ہوا۔ بارہ دن ٹھیرا۔ جلسہ وغیرہ جب ختم ہو گیا۔ قصد ہوا کہ نصف دور تو آ گیا
ہے کہ وطن چل کر ایک ہفتہ کے لیے، بال بچوں سے مل آ۔ آخر یہی کیا۔ کل مال
اسباب جو پانچسو روپے کی مالیت تھا۔ سوداگر کی دوکان میں رکھ کر وطن میں آگیا۔
یہاں آکر (سنا) کہ جے پور کی ریل کھُل گئی ہے۔ ارادہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے لئے
جے پور چل کر عزیزوں سے مل آؤ۔ اور کچھ ہتھیار وقتِ روانگی جے پور سے

وہاں چھوڑ آیا تھا۔ اگر بچ رہے ہوں وہ بھی لے کر فروخت کردو تاکہ زاد راہ ہو جائے۔ یہ قصد کر کے جے پور روانہ ہو گیا۔ بس جے پور پہونچنا تھا کہ اُس سرزمین (نے) پاؤں پکڑ لئے۔ مہاراج رام سنگھ کو خبر ہوئی مہاراج نے مجھے بُلا کر روک لیا۔ جانے نہ دیا اور کسی قدر وظیفہ دوامی میری مد خرچ کو مقرر فرمایا اور یہ اقرار کیا کہ ہم جلد تیری ترقی کریں گے اس کے بعد مہاراج سنگھ مر گئے میری تقدیر وہاں پست ہو گئی بس وہی جزو قلیل تقدیر کا رہ گیا۔ اس بے مایہ کی زندگی اسی قلیل بضاعت میں بسر ہوتی ہے اس فقیر کی عمر قریب پچھتر کے ہو گئی ہے زندگی مثل چراغِ سحری کے ہے۔ اللہ بس ماسوا ہوس۔ فقط

خواجہ شمس الدین خاں غالب کے بھتیجے راقم کے چچا ۱۲۸۷ھ چونسٹھ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے، اُن کی والدہ اُن سے قبل مر گئی تھیں۔ خواجہ شمس الدین نے فن موسیقی میں ایسا کمال حاصل کیا تھا کہ اس فن کے کاملین داد دیتے تھے اور اُن کی دن رات عبادت گزاری میں بسر ہوتی تھی اُن کے بعد خواجہ بدر الدین خاں راقم کے والد ماجد نے بھی بعمر چونسٹھ سال ماہ اگست ۱۸۸۷ء میں وفات پائی اور اُن کی اولاد میں ایک فرزند اور ایک دختر رہی ایک دختر صاحب اولاد اور ایک فرزند اکبر خواجہ قمر الدین خاں راقم باقی رہے ہے۔ خواجہ بدر الدین خاں اپنے وقت کے مجمع کمالات تھے خوشنویسی میں ایسے ہی تھے مصوّری اور ستار نوازی میں کامل، فن رعنائی اور خوش تقریری میں لاجواب تھے جیسا کہ اُن کے چچا مرزا اسد اللہ خاں غالب نے جلد اوّل بوستانِ خیال کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میرا بھتیجا وصف کمالات میں یکتا ہے ستار بجایا تو ایسا بجایا کہ تان سین کو اُنگلیوں پر نچایا۔ مصوّری میں مانی کو پرے بٹھایا۔ الی آخرہ۔ حق یہ ہے کہ خواجہ بدر الدین خاں ہمہ صفت موصوف تھے۔ اُن کی تصنیف افسانہ بوستانِ خیال گواہی دیتا ہے اور عالم جانتا ہے۔ غرض جب خاندان میں سوائے اس ناشاد ننگ خاندان خواجہ قمر الدین خاں راقم کے کوئی نہ رہا۔ جاگیر کی آمدنی

بند ہوگئی۔ پھر اس بے بضاعت خواجہ قمرالدین خاں راقم نے اپنی موروثی جاگیر کا استغاثہ کیا۔ حکام ضلع نے بعد تحقیقات کامل پچاس روپیہ ماہوار میرے گزارے کے لئے تجویز کئے۔ کل محکموں سے وہ رقم منظور ہوگئی۔ جس وقت حکام ماتحت کی رپورٹ گورنمنٹ کے لاحظہ میں پیش ہوئی مجھ بدنصیب کی تقدیر اُلٹ گئی۔ گورنمنٹ نے پچیس ۲۵ روپیہ ماہوار بطور پنشن منظور فرمائے۔ قہر درویش بجان درویش سمجھ کر خاموش رہا مگر اللہ کا شکر ہے کہ مہاراج رام سنگھ والیِ جے پور نے اپنی سرکار سے اس قدر وظیفہ فقیر کا مقرر کر دیا جو آج تک اُس سرکار سے ملتا ہے اور خاکسار بدُعائے دولت و اقبال سری حضور مہاراجہ صاحب فرماں روائے حال جے پور میں بسر کرتا ہے۔ خواجہ قمرالدین خاں کی اولاد میں دو دختر نیک اختر صاحب اولاد اور ایک فرزند ارجمند خلف الرشید خواجہ مرزا امیرالدین خاں صاحب اولاد نمک خوار سرکار آصفی بخوش اقبالی عہدہ جلیل پر ممتاز ہے۔

مرزا رفیق بیگ نبیرۂ راقمؔ

خواجہ قمر الدین راقمؔ

خواجہ مرزا قمر الدین خاں المتخلص بہ راقمؔ دہلوی ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اکثر لوگ آپ کو صرف خواجہ مرزا ہی کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کے والد خواجہ مرزا بدر الدین خاں المخاطب بہ خواجہ امان مترجم "بوستانِ خیال" تھے۔ راقمؔ اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ ایک ہی نسل سے تھے۔ یعنی غالبؔ کے دادا اور راقمؔ کے پردادا کے والد دونوں سگے چچا زاد بھائی تھے جیسا کہ خود راقمؔ نے مفصل بیان کیا ہے۔

راقمؔ لمبے قد کے۔ خوش رو اور ہنس مکھ تھے۔ رنگ گندمی تھا۔ آخر عمر میں اعضا میں قدرے رعشہ ہو گیا تھا۔ جس سے لکھنے پڑھنے میں سخت دقت ہوتی تھی۔ چاء کے بہت شوقین تھے۔ طبیعت میں نفاست تھی۔ اپنی عمر کے اختتام تک اپنی پرانی وضع کے پابند تھے۔ جیسا کہ ان کی تصویر سے جو ان کے دیوان کے ساتھ ہے معلوم ہو گا۔ عرصہ سے ثقل سماعت کی شکایت ہو گئی تھی اور سخت تھی۔ راقمؔ کے دوست اُستاد ظہیرؔ دہلوی سے بیحد دوستانہ تھا۔ ان دونوں اصحاب کی ملاقات بھی عجیب پُر لطف ہوتی تھی۔ دونوں کو ثقل سماعت کی شکایت تھی جب یہ دونوں حضرات ملتے تھے تو دونوں صاحب ایک قسم کا آلہ جسے آلۂ سماعت کہنا چاہیے ضرور ساتھ رکھتے تھے ایک صاحب ایک طرف سے اپنے کان میں لگاتے تھے۔ اور دوسرے صاحب کے ہاتھ میں اس کا دوسرا حصّہ دیدیتے تھے۔ تاکہ وہ کچھ کہیں اور اُس میں کہیں۔ اسی طرح دوسرے صاحب بھی۔ اور پھر ان کی شاعری

اور اُس پر واہ واہ کا ہنگامہ دیکھنے اور سُننے کے قابل ہوتا تھا۔

ابتدائی حالات اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد سولہ سال کی عمر میں راقم نے بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی ملازمت اختیار کی اور تیر اندازی میں بادشاہ کے شاگرد بھی تھے۔ اُس کے بعد ولیعہد بہادر مرزا فتح الملک کی ملازمت میں رہے۔ بعد وفات ولیعہد بہادر راقم اپنے والد کے پاس ریاست الور میں چلے گئے۔ وہاں راجہ کے فرزند شیودان سنگھ کی تعلیم پر مقرر ہو گئے۔ عرصہ تک ان کی ملازمت میں رہے۔ راجہ صاحب اور اُن کے فرزندان سے اس قدر مانوس تھے کہ کسی وقت جُدا نہ ہونے دیتے تھے۔ مہاراجہ اور اہلِ علم کے بہت قدردان تھے۔ خواجہ امان نے جو ترجمہ بوستانِ خیال کا کیا تھا۔ وہ غالباً مہاراجہ ہی کے واسطے تھا۔ کیوں کہ اوّل تو کہیں دیباچہ میں ذکر بھی کیا ہے۔ دوسرے ایک تصویر سے جو بوستانِ خیال کی ایک جلد کے سرورق پر ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ امان بوستانِ خیال مہاراجہ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ غدر کے بعد راقم الور سے جے پور گئے، پھر دہلی چلے آئے۔ دہلی آن کر اپنے والد کے ساتھ بوستانِ خیال کے ترجمے اور اُس کی چھپائی وغیرہ کے اہتمام میں مصروف ہو گئے۔

جب ان کے والد کا انتقال ۱۸۷۹ء میں ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد بوستانِ خیال کے ترجمے سے فرصت پائی تو آپ حیدر آباد چلے گئے۔ اور نواب سر سالار جنگ بہادر کے ہاں دو سال تک امیدواری کرتے رہے بعد میں اتفاق سے پھر جے پور چلے گئے اور آخر تک وہیں قیام پذیر رہے۔

تلمذ راقم اپنے دادا غالبؔ کی شاگردی کا فخر رکھتے تھے۔ اکثر ان کی زبانی یہ معلوم ہوا ہے کہ راقم علاوہ شاعری کے غالبؔ سے اور چیزوں میں بھی سبق لیا کرتے تھے۔ لیکن ابتدائی تعلیم زیادہ تر اپنے والد سے پائی تھی۔ فارسی اردو کے کامل تھے۔ راقم کو اپنی زبان (اردو) پر بہت ناز تھا چنانچہ وہ خود ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ہم زباں سے زبان ہم سے ہے
ہرزباں پرفسانہ ہیں ہم لوگ

تصانیف راقم کی جملہ تصانیف چھ ہیں۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔
بوستانِ خیال۔ راقم کے والد خواجہ امان بوستانِ خیال کا ترجمہ کررہے تھے۔ چھ جلدیں تمام ہوچکی تھیں کہ عمرنے وفا نہ کی اور اس دارفانی سے اس بحرِ زخار کو ادھورا چھوڑکر چلے گئے۔ بقیہ دو جلدوں کا ترجمہ خود راقم صاحب نے پورا کرکے شایع کیا۔

کلّیات راقم۔ یہ تقریباً دو سو صفحہ کا راقم کا دیوان ہے۔ اور طبع ہوکر شایع ہوچکا ہے۔ کلام معمولی ہے اور جس اُستاد کی شاگردی پر انھیں فخر ہے اس سے کچھ نسبت نہیں رکھتا۔

سبعہ سیّارہ۔ جیساکہ نام سے واضح ہے یہ سیّاروں کے حالات کے متعلّق لکھی ہے۔ طبع ہوچکی ہے۔ آخر میں کچھ شعبدے اور مختلف نسخے وغیرہ بھی درج کئے ہیں۔

عقدِ ثریّا۔ یہ عورتوں کی زبان میں ایک قصہ کے پیرایہ میں مقفٰے عبارت میں لکھی ہے۔ اس کی پہلی جلد طبع ہوچکی ہے دوسرے حصہ کا مسودہ راقم کی وفات کے بعد ملا تھا۔ لیکن اب پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے اب تک طبع نہ ہوسکا۔

مرقعِ نعت۔ نعت اور تصوّف کا بہترین ذخیرہ ہے۔ اس سے راقم کے حسنِ اعتقاد کی حالت خوب معلوم ہوسکتی ہے۔ خصوصاً اس میں معراج نامہ ایک عمدہ چیز ہے۔ آپ مذہب کے عالِم باعمل تھے۔

شرح دیوان غالب۔ راقم نے غالب کے دیوان کی شرح لکھی تھی اور مسودہ صاف کرکے حید۔آباد لینے ساتھ لائے تھے۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر سے (جو رشتے میں راقم کے بھتیجے ہوتے ہیں) اتفاقاً ذکر آیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور راقم سے کہاکہ وہ مسودہ مجھے دیجئے میں اس کو چھپواتا ہوں۔ راقم نے

مسودہ ان کے حوالے کر دیا۔ اور واپس جے پور چلے گئے، اُس کے بعد کئی سال تک اپنی زندگی میں نواب صاحب پر تقاضے کیے، اور راقم کے انتقال کے بعد ان کے فرزند خواجہ امیر الدین خاں صاحب آثم نے جو اوصاف میں اپنے والد کے قدم بقدم تھے (افسوس کہ انھوں نے بھی ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا) بہت کوشش کی لیکن وہ شرح نواب صاحب کے پاس سے غالباً کہیں گم ہوگئی۔ اُس شرح کا سب سے پہلا مسودہ جو بہت کٹا پھٹا ہے اب نکلا ہے لیکن افسوس کہ وہ بالکل کرم خوردہ ہے اور اس قابل نہیں ہے کہ شایع کیا جاسکے۔ البتہ راقم کا تحریر کردہ نسب نامۂ اسد اللہ خاں غالبؔ دستیاب ہوا ہے۔ جو اسی شرح کا دیباچہ ہے۔

شاگرد راقم کے شاگرد بہت تھے۔ سب سے زیادہ اس وقت جے پور میں ہیں۔ علاوہ شاگردوں کے بہت لوگ ان کے پاس جمع رہتے تھے، اور اصلاحیں لیا کرتے تھے۔ ان کے ہاں ہر وقت ایک علمی مجلس جمع رہا کرتی تھی، اور اس طرح وہ اپنے علم سے دوسروں کو مستفید کرتے رہتے تھے۔

خوش مزاجی راقم بہت خوش مزاج اور لطیفہ گو تھے اور اکثر مذاق کی باتیں کیا کرتے تھے ایک مرتبہ راقم دہلی آئے ہوئے تھے اور اپنی ہمشیرہ کے ہاں مقیم تھے۔ اتفاق سے رات میں چوری ہوگئی اور بہت کچھ اسباب جاتا رہا۔ صبح میں جب خبر ہوئی تو راقم نے اپنی ہمشیرہ سے کہا کہ میں ہمیشہ تم کو تاکید کیا کرتا ہوں کہ تم گھر میں کتا پالو تاکہ گھر کی حفاظت ہو۔ ہمشیرہ نے اُن کو جواب دیا، "بھائی! جس گھر میں کتا ہوتا ہے وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے اس سبب سے میں نہیں پالتی۔" اس پر راقم صاحب نے جواب دیا کیوں بہن یہ جو شہر کی گلی کوچوں میں کتے رہتے ہیں۔ تو رحمت کے فرشتے فصیل کے باہر ہی رہتے ہوں گے۔ غرض یہ کہ ہمیشہ اس قسم کے سینکڑوں لطیفے ہیں جو

یہاں درج نہیں ہو سکتے۔

ہمت اور مستقل مزاجی راقم بہت باوضع بزرگ تھے کیسی ہی مصائب و مشکلات کا سامنا ہوتا وہ نہایت استقلال سے اُن کو اس طرح جھیل لیتے تھے کہ دوسروں کو اس کا احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ اُن پر کیا گزری۔ اپنی بات اور ارادے کے پورے تھے۔ جے پور میں اکتیس سال رہے وہاں جو کوٹھا اُنھوں نے اوّل سے کرایہ پر لیا تھا۔ اکتیس برس اُسی میں گزار دیئے اور آخر وہیں انتقال ہوا۔ اپنے ارادہ کے اس قدر مضبوط تھے کہ انتقال سے آٹھ روز پہلے دہلی گئے۔ چلنا پھرنا تو بڑی بات تھی۔ ہل جل بھی نہ سکتے تھے۔ ایسی حالت میں سب نے روکا۔ لیکن کسی کی نہ مانی چار روز دہلی میں رہ کر پھر واپس اُسی حالت میں جے پور چلے گئے اور صرف تین دن کے بعد انتقال کیا۔ آخر وقت تک ہوش حواس بالکل درست تھے اور دل و دماغ اس وقت تک برابر کام دیتے تھے۔

عام اخلاق راقم نہایت مہمان نواز۔ ہمدرد۔ رحم دل اور مجسّم اخلاق تھے۔ ان کے اخلاق کی وجہ سے لوگ اب تک جے پور میں یاد کر کے روتے ہیں۔ اپنے اوقات اور اتباع سُنّت نبوی کے اس قدر پابند تھے کہ اُس میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔ غربا کے ساتھ ہمیشہ سلوک اور ان کی سعی سفارش وغیرہ کرتے رہتے تھے۔ اس لیے نہایت ہر دلعزیز ہو گئے تھے۔

وفات راقم نے مارچ ۱۹۱۰ء میں اٹھتّر سال کی عمر پا کر اس دُنیا سے کوچ کیا اور جے پور میں ہی مدفون ہوئے راقم صاحب کو آخر عمر میں اگر کوئی صدمہ تھا وہ صرف اپنی آئندہ نسل کے چلنے کے متعلق تھا۔ کیوں کہ کئی پوتے ہوئے اور وہ سب ان کے سامنے ہی رخصت ہو گئے۔ البتہ ان کی پوتیاں موجود ہیں۔ حال ہی میں ان کے صاحبزادے کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور اس طرح خاندان غالبؔ یہاں آن کر بالکل ختم ہو گیا۔ نہ تو غالبؔ ہی کی اولاد میں کوئی مرد باقی رہا اور نہ اس سلسلے ہی میں اور کوئی رہا کہ آئندہ سلسلہ چلنے کی اُمید رہتی۔

ناظمہ بیگم پروین

غالب کے چند اعزّہ

نام	رشتہ
مرزا عبداللہ بیگ خاں متوفی ۱۸۰۲ء	باپ
عزت النساء بیگم	ماں
مرزا قوقان بیگ	دادا
خواجہ غلام حسین کمیدان	نانا
مرزا نصر اللہ بیگ خاں متوفی ۱۸۰۶ء	چچا
مرزا یوسف بیگ متوفی ۱۸۵۷ء	بھائی
عزیز النساء بیگم (بیگم غلام فخر الدین)	بھتیجی
چھوٹی خانم	بہن
مرزا اکبر بیگ بدخشی	بہنوئی
مرزا عباس بیگ	بھانجے
مرزا عاشور بیگ	بھانجے
مرزا جواد علی بیگ (مرزا مغل)	بھانجے
آغا مرزا بیگ	پوتے
فیاض بیگ	پوتے
ساجد بیگ	پوتے
عابد بیگ	پوتے

[حقیقی نہیں، غالب کے حقیقی بھانجے جواد علی بیگ عرف مرزا مغل کے یہ چاروں لڑکے ہیں]

نام	رشتہ
رفیع الدین بیگ	پوتے
احمد بیگ	پوتے
محمود بیگ	پوتے
خداداد بیگ	پوتے

حقیقی نہیں۔ غالب کے حقیقی بھانجے مرزا عاشور بیگ کے یہ چاروں لڑکے ہیں۔

نام	رشتہ
محمد علی بیگ	بھانجا
امانی خانم (بیگم مرزا علی بخش خاں)	بھانجی
الٰہی بخش معروف متوفی ۱۸۲۶ء	خسر
مرزا علی بخش متوفی ۱۸۶۴ء	سالے، بھانجی داماد
مرزا علی نواز خاں	سالے
امراؤ بیگم متوفی ۱۸۷۰ء	بیوی
بنیادی بیگم	سالی
نواب غلام حسین خاں مسرور	ہم زلف
غلام فخر الدین	سالی بیٹا، بھتیجی داماد
مرزا اورنگ خاں	ممیرے بھائی
محمد مرزا خاں	سیبی بھائی کا نواسہ